مرگ انبوہ

ناول

مشرف عالم ذوقی

مرگ انبوہ

ناول

مشرف عالم ذوقی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۔ ٦

"It is forbidden to kill; therefore all murderers are punished unless they kill in large numbers and to the sound of trumpets."

— Voltaire

ملک کاغذ پر بنا کمرہ نہیں ہوتا
اگر تمہارے گھر ایک کمرے میں آگ لگی ہو
تو کیا تم دوسرے کمرے میں سو سکتے ہو؟
اگر تمہارے گھر کے ایک کمرے میں
لاشیں سڑ رہی ہوں
تو کیا تم دوسرے کمرے میں عبادت کر سکتے ہو؟
اگر ہاں،
تو مجھے تم سے کچھ نہیں کہنا
ملک کاغذ پر بنا نقشہ نہیں ہوتا
ایک بچے کا قتل / ایک عورت کی موت /
ایک آدمی کا گولیوں سے چھلنی بدن
کسی حکومت کا نہیں
بلکہ پورے ملک کے لیے خطرناک ہے
اگر یہ زمیں تمہارے خون میں آگ بن کر نہیں دوڑتی
تو سمجھ لو تم بنجر ہو گئے ہو
تمہیں یہاں سانس لینے کا حق نہیں ہے

— سرویشور دیال سکسینہ

فکشن کی عظمت کا نشان اور عظیم انسان

سید محمد اشرف

کے

نام

یہ ایک فرضی داستان ہے، جس کا حقیقت سے کوئی لینا دینا نہیں۔ اس کا مقصد ہے کہ ہم انسانیت کو شرمسار نہ ہونے دیں۔ اس داستان کا کسی سیاسی پارٹی یا جماعت سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔

ناول میں پیش کیے گئے واقعات فرضی ہیں۔ کسی واقعے میں مماثلت اتفاقی قرار دی جائے گی۔ اس کے لیے مصنف اور پبلشر ذمہ دار نہیں ہیں۔

فہرست

’زندگی کی سب سے بڑی ایجاد ہے — موت‘

— اسٹیو جابس

’اس بات کو یاد رکھنا کہ میں بہت جلد مر جاؤں گا، مجھے زندگی کا بڑا سے بڑا فیصلہ لینے میں مددگار ثابت ہوتا ہے کیونکہ جب میں موت کے بارے میں غور کرتا ہوں تو فخر یہ احساس سے لے کر ناکامی، امید اور مایوسی کی دھند غائب ہو جاتی ہے.....اور اس کے بعد موت کا احساس رہ جاتا ہے کہ ایک دن آپ کو مر جانا ہے۔ اس لیے میرے پاس کچھ بھی کھونے کا خوف نہیں ہے۔ اس لیے ایسی کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنے دل کی آواز نہ سن سکیں۔‘

— اسٹیو جابس

باب اوّل

موت سے مکالمہ

بلیو وہیل اور پاشا مرزا

''اس کھیل میں موت ہے
موت سے زیادہ خوبصورت کوئی فنتاسی نہیں
کیا ہم میں سے کسی کو پتہ ہے کہ موت کے بعد کی زندگی کیسی ہے؟
سب کچھ ختم یا ایک رقص خلا میں؟
یا ایک نئی دنیا کو ڈسکوور کرنا؟
یا کسی بلیک ہول میں پھینک دیا جانا؟
انجوائے،
مجھے موت کے بعد انجوائے کرنا ہے
اور اس لئے زندگی کا سناٹا مجھے اچھا لگتا ہے''
(ریمنڈ نے یہ چند لائنیں اپنے دوست پاشا مرزا کو اس وقت واٹس اپ کیں جب اس نے اپنے ڈیڈ کی ڈائری نہیں پڑھی تھی)

میں ایک ۲۰ سال کا آج کا نوجوان ہوں
اور مجھے مرنے والوں سے کوئی ہمدردی نہیں ہے
—پاشا مرزا

(۱)

۲۰۲۰ء

ہیلو فرینڈس......

میں پاشا مرزا— عمر ۲۰ سال— میں پہلے ہی اقرار لوں کہ مجھے کہانیاں لکھنے کا ہنر نہیں آتا۔ میں لکھنا بھی نہیں چاہتا، بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہے کہ میں کہانیاں لکھنے والوں کو ایک دم فالتو سمجھتا ہوں— ایسے لوگوں کے لیے میرے دل میں نفرت ہی نفرت ہے۔ ایسے لوگ اپنا اور ہمارا وقت ضائع کرتے ہیں— اوہ، آپ مسکرا رہے ہیں......اور یقیناً یہ مسکراہٹ میرے لیے ہے کہ میں جب لکھنے والوں سے اتنی نفرت کرتا ہوں تو مجھے یہ سب لکھنے کی کیا ضرورت ہے......

فرینڈس....اس کے لیے آپ کو ذرا سا صبر کرنا پڑے گا......اور یقیناً میرے جیسے ہزاروں بچے آپ کے آس پاس بھی ہوں گے......آپ ان بچوں کو دیکھ کر بڑے آرام سے میری ذہنیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ گھر کے کھانوں پر ناک بھوں چڑھانے والے اور پزا، برگر کو سلام کرنے والے بچے......میں ایسے ہی بچوں میں سے ایک ہوں۔ فاسٹ فوڈ کلچر میں آنکھیں کھولنے والا پاشا مرزا، جس کی عمر ۲۰ سال کی ہوگئی ہے۔ لیکن ان ۲۰ برسوں میں میرے پاس ۸۰ سال کے آدمی سے زیادہ کا تجربہ ہے۔ ممکن ہے میری ممی سارہ جہانگیر کی طرح آپ بھی میری بات پر ہنسیں، تو آپ کو ہنسنے کا حق حاصل ہے۔ لیکن یقیناً اس بات پر ڈیڈ نہیں ہنستے۔ بلکہ میں کہتا......وی آر لائک دس آنلی تو وہ ایک پراسرار مسکراہٹ دیتے اور کہتے— اُف......یور جنریشن......فاسٹ فوڈ......تمہاری ہر بات نرالی ہے۔ اور تم ہر بات میں ہم سے ہزاروں میل آگے ہو......،

فرینڈس......اس سے یہ اندازہ بالکل مت لگائیے گا کہ میں اپنے ڈیڈ کا فین ہوں۔ بلکہ میں وہ ہوں، جس نے ڈیڈ سے سب سے زیادہ نفرت کی ہے......لیکن یہ چند سطور لکھتے ہوئے ڈیڈ ایک بار پھر میری آنکھوں کے سامنے آ گئے ہیں— اور ان کی یہ تحریر......کہ دیکھو تو......مرنے کے بعد بھی میں نے تمہارا پیچھا نہیں چھوڑا......لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے یہ کہنے سے بھی مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا— اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت یہ سطور لکھتے ہوئے وہ میرے اندر یا تو ہیں ہی نہیں۔ یا ہیں تو برائے نام۔ لیکن ابھی بھی ان کی دو بڑی بڑی آنکھیں میری طرف دیکھ رہی ہیں، اور فرینڈس......آپ کو بتاؤں......یہ آنکھیں اس وقت بھی اسی طرح بغور میری آنکھوں کو دیکھ رہی تھیں جب میں اچانک ان کے کمرے میں داخل ہوا تھا— ٹھہریے۔ یہاں میں آپ کو یہ بتاتا چلوں کہ گھر کے اندر، باہری حصے کی طرف ایک بڑا سا کمرہ ہے جو ڈیڈ کا ہے۔ یہ کمرہ کتابوں سے بھرا ہوا ہے۔ اور اسی لیے یہ کمرہ مجھے کسی کباڑ خانے جیسا نظر آتا ہے۔ زندگی میں اب تک اگر میری آنکھوں نے سب سے زیادہ کسی چیز کو دیکھا ہے تو وہ کتابیں ہیں۔ بیڈ روم سے ڈرائنگ روم اور پاپا کے کمرے تک— کبھی کبھی ڈیڈ ڈائننگ ٹیبل پر ایسی کوئی کتاب چھوڑ دیتے تو اف......میرے بدن میں آگ لگ جاتی۔ اور جی چاہتا کہ ایک دن ڈیڈ کی غیر موجودگی میں ان ساری کتابوں کو جلا ڈالوں— خیر جانے دیجئے۔ اس دن اچانک ڈیڈ کمرے میں میری موجودگی کو دیکھ کر چونک گئے تھے۔ مجھے سب کچھ یاد ہے— سامنے ایک ریوالنگ چیئر تھی، جس پر بیٹھے وہ لکھ رہے تھے— میز پر دنیا بھر کی کتابیں کھلی ہوئی تھیں— ریوالنگ چیئر کے پیچھے چاروں طرف کتابیں ہی کتابیں نظر آ رہی تھیں....اور جیسے میں اس وقت کتابوں کے جنگل میں آگ تھا...اور میرے اندر ہی اندر ایک آگ کوندر ہی تھی۔ اس وقت میری عمر کوئی گیارہ یا بارہ برس کی ہوگی۔ میں ہر لمحہ ایک نئی کشمکش سے گزر رہا تھا۔ میری ساری چھٹیاں ضائع چلی جاتی ہیں۔ آخر میرے دوسرے دوستوں کے بھی تو ڈیڈ ہیں۔ وہ اکثر چھٹیوں میں باہر جاتے ہیں۔ کسی مال میں شاپنگ کرتے ہوئے۔ کسی ہولی ڈے ریسورٹ میں چھٹیاں مناتے ہوئے۔ پکنک یا گھر پر وی ڈی او گیمز یا انڈور گیمس کے مزے لیتے ہوئے۔ میں نے دیکھا، ڈیڈ کی آنکھیں چشمے سے بغور میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہی تھیں... اور یہی وہ لمحہ تھا، جب میں اچانک چیخ کر بولا تھا۔

''اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میں بڑا ہو کر آپ کی طرح کہانی لکھوں گا تو یقیناً آپ غلط سوچتے ہیں۔''

ایک لمحے کے لیے ڈیڈ کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو گیا تھا۔ لیکن ڈیڈ دوبارہ اپنے چہرے پر مسکراہٹ لے آئے تھے۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہے تھے......

'میرے لیے یہ دنیا، جس میں ابھی اس وقت میں ہوں— اور ہمیشہ رہتا ہوں، بڑی اور قیمتی ہے— جیسے وہ دنیا تمہارے لیے بڑی اور قیمتی ہونے والی ہے، جس دنیا پر آنے والے وقت میں تم حکومت کرو گے......اور ابھی یہ بات تمہارے سمجھنے کے لیے بہت چھوٹی ہے......'

میں خاموش ہوگیا تھا۔ اس لیے کہ ڈیڈ اس وقت بھی مجھے نہیں سمجھ سکے تھے۔ یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ میرے جیسے بچوں کو سمجھنے کے لیے صرف تجربہ اور عمر کافی نہیں ہے۔ بہت سارے لوگوں کی طرح میرے ڈیڈ بھی آج کے بچوں اور ان کی نفسیات کو سمجھنے سے قاصر تھے..... نفسیات......؟ نہیں۔ چونکیے مت صاحب۔ میری عمر ۲۰ سال کی ہے۔ اور اس عمر میں میرا تجربہ آپ یا کسی بھی ۸۰ سال کے آدمی سے کہیں زیادہ ہے.... اور سامنے والے کی پہچان کے لیے، خواہ وہ ایک سوئٹ سی لڑکی کیوں نہ ہو، آر پار دیکھنے کا جو عمل رہتا ہے، آپ اسے ہماری طرف سے نفسیاتی تجزیہ کا نام دے سکتے ہیں۔ پزا، برگر، ایپل، لیپ ٹاپ اور فیس بک کی باتیں کرتے ہوئے، ڈیٹنگ اور بریک اپ کے معاملے میں بھی ہم بچے جس گہرائی سے غور کرتے ہیں، آپ اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔

آپ کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ آج کے عہد میں آپ یا گاندھی جیسے خیال کے لوگ ہمارا آدرش نہیں ہو سکتے۔ ہم ایک ٹھہری ہوئی ندی کے قائل نہیں۔ ہم زندگی میں آنے والی سنامی کا استقبال کرنے والے نوجوان ہیں۔ اور اسی لیے ہمارے آدرش اسٹیو جابس (Steve jobs)، مارک زکر برگ جیسے لوگ ہیں جو انتہائی کم عمری میں ایک بڑی دنیا کو فتح کر کے دنیا کے دو چند بڑے امیروں میں اپنا نام درج کرانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں — دو چند بڑے امیر۔ چونکیے مت۔ ہم آپ کی طرح یہ نہیں کہہ سکتے کہ پیسہ ہماری ضرورت نہیں ہے، بلکہ پیسہ ہماری بہت ضرورت ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے ہم ایوریسٹ کی اونچائیوں کو فتح کرتے ہیں، اپنی من پسند کار پر گھومتے ہیں یا میکڈونلڈ میں برگر یا پزا کے کسی نئے آئٹم کا ذائقہ لیتے ہوئے اپنی گرل فرینڈ کو Kiss کرتے ہیں۔

فرینڈس...... اور یہ وہی وقت تھا جب کوئی ہمیں انٹرنیٹ کے چور دروازے سے مستقبل کو فتح کرنے کے راستے دکھا رہا تھا' ...... دوسروں کی طرف دیکھنے میں وقت مت ضائع کرو......' اف...... یہ ہلکی ہلکی داڑھی والا پیارا سا اسٹیو جابس تھا۔ لیکن اس کے کہنے کے باوجود یہ آنکھیں گھر میں بار بار ڈیڈ کے ناقابل برداشت وجود کو دیکھنے کے لیے مجبور تھیں۔ ناقابل برداشت...... مجھے اب بھی ان لفظوں کے لیے کوئی افسوس نہیں ہے۔ کیونکہ اس وقت شاید میں ایسا ہی محسوس کرتا تھا۔ اور اسٹیو کے الفاظ بار بار نگاڑے کی طرح میرے کانوں میں گونجتے رہتے تھے......

' Your time is limitted. so dont waste it living someone else's life. Dont be trapped by dogma- which is living with the results of other people's thinking. Dont let the noise of other's opinion drown out your own inner voice. And most important, have the courage to follow your heart and intuition. They somehow already know what you truly want to become. Everything else is secondary.

اور یہ باتیں کہیں نہ کہیں میری آنکھیں کھول رہی تھیں۔ کیونکہ اسٹیو جابس یا مارک زکر برگ کی طرح میرے یا میری طرح کے کسی بھی بچے کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے — یور ٹائم از لیمیٹڈ۔ اور اسی مختصر وقت میں دوسروں کی طرف نہ جھانکتے ہوئے ہمیں ایک بڑی دنیا کو فتح کرنے کا اعلان بھی کرنا ہے۔ اور اسٹیو جابس کو سیلیوٹ، کہ دنیا کو ایک چھوٹی عمر میں الوداع کہتے ہوئے وہ ہمارے لیے ایک بڑی اور وسیع دنیا کا تصویر چھوڑ گیا — جس نے Apple inc کے سہارے صرف ایک دنیا نہیں، مستقبل کا تصور تک بدل ڈالا۔ مستقبل میں رشتے غیر اہم ہوتے جا رہے تھے...... ہم خود میں اور کیریئر میں سمٹ رہے تھے۔ لیکن مارک زبرگر...... کتنی عجیب بات...... وہ فیس بک یعنی اپنی ماڈرن سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ کے ذریعہ ان رشتوں کو ایک زمین فراہم کر رہا تھا۔ جانے انجانے رشتے...... یہ میڈیا کا

نیا چہرہ تھا...... جسے یوزرس جنریٹیڈ کنٹنٹ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہاں گلوبل گاؤں کے ہر شعبے سے وابستہ لوگ ہیں......اور انہی میں سے ایک میں بھی ہوں......

میں پاشا مرزا......اب اس یوزرس جنریٹیڈ کنٹنٹ کا ایک حصہ......

اور انہی دنوں ایک دھاکہ ہوا تھا......ڈیڈ کے کمرے سے آتی ہوئی سرگوشیوں نے مجھے ایک اسپائی بنا دیا تھا۔ ایک جاسوس......اور مجھے یہ بتانے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ میں ڈیڈ کو ڈیڈ کے سوا کسی اور انسانی رشتے میں نہیں دیکھ سکتا تھا...... میں نے چھپ کر دیکھنے کی کوشش کی...... کمرے میں ایک لڑکی تھی۔ اور اس وقت ڈیڈ بری طرح سے اس لڑکی پر جھکے ہوئے تھے......میں کانپ رہا تھا۔ جسم میں لرزش تھی۔ میں اپنے کمرے میں آ گیا......زور سے دروازہ بند کیا۔ کرسی پر بیٹھ گیا......سانس کے چلنے کا عمل تیز تھا۔ ساری دنیا اس وقت مجھے گھومتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ کنپٹیاں جل رہی تھیں......سر پھٹا جا رہا تھا...... میں اس کیفیت میں زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتا تھا۔ کمرے سے اٹیچڈ باتھ روم میں آ گیا۔ شاور کھول لیا......آنکھیں اب بھی بند تھیں......

وہ عورت اور ڈیڈ......شاور کا پانی سر پر گر رہا تھا، لیکن راحت نہیں — میں اس لمحے ڈیڈ کے لیے اتنی شدید نفرت محسوس کر رہا تھا کہ اس نفرت کو لفظوں کا لباس نہیں پہنا سکتا......اور اس رات...... میں نے ایک خوفناک خواب دیکھا......ممی مجھے لے کر ایک کمرے میں بند ہیں — میرا سر ممی کے پاؤں پر ہے۔ ممی میرے سر کو سہلاتی ہوئی رو رہی ہیں۔ اور فرینڈس......

میرے سامنے اسٹیو جابس اور مارک کھڑے تھے۔ مارک زکر برگ نے ممی کو اشارے سے جانے کے لیے کہا۔ اسٹیو میری طرف مڑے......ان کی آنکھیں بغور میری آنکھوں کا جائزہ لے رہی تھیں......

'دوسروں کی زندگی میں نہیں جھانکا کرتے......'

'وہ دوسرے نہیں ہیں......' میں زور سے چیخا تھا......

'مارک زکر برگ مسکرا رہے تھے......فیس بک پر ہو مگر اتنا بھی نہیں جانتے کہ اتہاس کچھ نہیں ہوتا — اتہاس محض ڈاٹا ہے......اور یہ تم پر ہے کہ تم اس ڈاٹا کو کتنا اپ ڈیٹ کرتے رہتے ہو......'

اسٹیو مسکرائے...... مارک یہاں سے نہیں......اسے بتاؤ، اس نے جو کچھ دیکھا ہے......وہ صرف ایک ڈاٹا ہے......اور جو کچھ اس نے دیکھا ہے، اسے دیکھے ہوئے بارہ گھنٹے گزر چکے ہیں۔ مائی گاڈ۔ بارہ گھنٹے۔ بارہ گھنٹے کسی بھی ڈاٹا کے پرانا ہونے کے لیے کافی ہیں......'

مارک ہنسے......اتنی دیر میں تو نئی تکنالوجی آ جاتی ہے۔ نئے سافٹ ویئر آ جاتے ہیں...... زندگی میں صرف انہی ڈاٹا بیس کی ضرورت ہوتی ہے جو ہمارے کام کے ہوتے ہیں۔ مثال کے لیے ہمیں کار خریدنا ہے یا بینک سے لون لینا ہے۔ ہم ڈاٹا بیس پر جاتے ہیں۔ ڈاؤن لوڈ کرتے ہیں۔ ایک سسٹم تمہارے دماغ کا بھی ہے۔ یہاں ان واقعات کو ڈاؤن لوڈ مت کرو جو تمہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

اسٹیو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی — 'ایپل دیکھا ہے۔ سرخ سیب۔ نیوٹن نے اسے زمین پر گرا دیکھا تھا۔ میں نے اسے آسمان پر بٹھا دیا — تمہارے لیے......کہ تمہارے لیے صرف تم اہم ہو......تم اور تم سے ضرورت رکھنے والے ڈاٹا...... باقی کی اہمیت نہیں ہے۔'

اسٹیو اور مارک اوجھل تھے۔ خواب کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ اور فرینڈس...... سچ یہ ہے کہ اس حادثے کے بعد کئی دنوں تک میں نے ڈیڈ سے کوئی بات چیت نہیں کی۔ بلکہ حقیقت یہ بھی ہے کہ میں ان کا چہرہ تک دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

◆◆

فرینڈس......میں بڑا ہو رہا تھا اور آپ جانتے ہیں، انسانی بچے اس طرح بڑے نہیں ہوتے جیسے پرندے بڑے ہوتے ہیں۔ جیسے بچپن میں، میں نے ایک گھونسلہ میں گوریا کے بچوں کو دیکھا تھا، پر نکلتے اور آسمان پر اڑتے ہوئے۔ ممی جب چھوٹی عمر میں، مجھے بانہوں میں لے کر جن اور پریوں کی کہانیاں سناتیں تو میں ہنس دیتا۔ پلیز۔ موم......مجھ پر رحم کرو......اب سوچتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ ممی ڈیڈ کی عمر سے ہماری جنریشن کتنی آگے نکل گئی۔ فنتاسی حقیقت بن گئی اور زندگی کے معنی بدل گئے......اور جیسے ایک دن ڈیڈا اپنے کالج کے دنوں کا ذکر کرتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانک رہے تھے......اور میں ان کی باتیں سنتا ہوا انہیں ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے میں پندرہویں صدی کی کسی سرنگ میں پہنچ گیا ہوں......ڈیڈ ہنس رہے تھے......

'تب...... یہ کمپیوٹر نہیں تھے۔ ٹی وی نہیں تھا۔ فریج نہیں تھا......گیس کا چولہا نہیں تھا......ایئر کنڈیشنڈ بھی نہیں— موبائل تو موبائل، فون بھی نہیں۔ معلوم، بڑی اپیا کی شادی میں بارات لیٹ ہوگئی تو گھر میں صف ماتم چھا گئی۔ کہیں فون نہیں۔ رات کے آٹھ بج گئے تھے۔ پھر ٹیلی فون ایکسچینج کا پتہ چلا۔ اس افراتفری میں رات کے ۹ بج چکے تھے۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہاں کا فون بھی خراب ہے......'

میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس لمحہ میں ڈیڈ کو ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے ڈیڈ نہ ہوں کوئی عجوبہ روزگار ہوں......میری کیفیت عجیب ہو رہی تھی......کیا کوئی دنیا فیس بک اور گوگل سے الگ بھی ہو سکتی ہے— ٹی وی بھی نہیں۔ فریج بھی نہیں۔ اے سی بھی نہیں......'

'بس ایک ڈبا ہوا کرتا تھا......ریڈیو......سوئچ گھماتے ہی یہ دیر تک عجیب آوازیں دیا کرتا تھا— یہی ہماری تفریح کا کل سامان تھا......لیکن تب......ہمارے پاس وقت ہوا کرتا تھا۔ اتنا ڈھیر سارہ وقت کہ کھیلتے کودتے یہ وقت ختم ہی نہیں ہوتا تھا۔

لیکن شاید اب ڈیڈ کی آواز گم ہوگئی تھی۔ میں ڈیڈ کی طرف دیکھ رہا تھا......

'پھر آپ لوگ جیتے کیسے تھے......؟'

ڈیڈا ایک لمحے کو چونکے— پھر مسکرائے— تب ہم لوگ زیادہ جیتے تھے۔ تب تمہاری طرح یہ دنیا چھوٹی نہیں ہوگئی تھی۔

ڈیڈ ان بچوں سے واقف نہیں تھے جنہیں ننھی عمر میں ہی کپڑے، جوتے، کھلونے اور تجسس کے گلوبل بازار نے وقت سے پہلے ہی بڑا کر دیا تھا۔ اس بازار میں پریاں اور جن نہیں تھے۔ یہاں خطرناک کھلونے، خطرناک شرارتیں تھیں......اور مجھے یہ سمجھنے میں ذرا بھی پریشانی نہیں تھی کہ میں ٹوتھ پیسٹ، کرکٹ کے چمکتے بلے، فٹ بال، میگی، پزا یا برگر کی طرح موجودہ بازار کا ایک حصہ ہوں۔ اور یہ بازار ہمیں نئے طریقے سے دیکھ رہا ہے...... یا دوسرے لفظوں میں بازار ہمیں اپنے پروڈکٹ کے حساب سے تیار کر رہا ہے......اور یہی وہ دور تھا جب اچانک میری خواہشوں نے میرے قد سے زیادہ اپنے پاؤں نکال لیے تھے۔ میری خواہشیں پوری نہیں ہوتیں تو میں چیخ پڑتا......لاؤڈ ہو جاتا......مثال کے لیے، میرا پی سی پرانا ہو چکا ہے۔ مجھے ایپل کا نیا لیپ ٹاپ چاہیے۔ یا پھر مجھے وہ موٹر سائیکل چاہیے جو دھونی یا جان ابراہم کے پاس ہے......

'نہیں مل سکتا......اتنے پیسے نہیں ہیں ہمارے پاس......'

اور میں زور سے چیختا تھا۔ میرے اسکول کا ہر دوسرا بچہ ہر مہینے نئی بائک استعمال کرتا ہے۔'

'اپنے ڈیڈ سے کہو۔'

ڈیڈ کے نام پر میری تیوریاں چڑھ جاتیں— 'میرا لیپ ٹاپ پرانا ہو چکا ہے اور یہ موبائل بھی۔'

'یہ موبائل تم پچھلے ہفتہ ہی لائے ہو۔'

'ایک ہفتہ میں سات دن ہوتے ہیں۔'

'سات دن میں موبائل بدلنے والے بچے امبانیوں کے ہوتے ہوں گے۔' ممی چیختیں— پھر ایک آہٹ ہوتی۔ اپنے کمرے سے باہر نکلتے ڈیڈ کو دیکھتا۔ وہ ایک لمحے کے لیے مجھے اور مام کو دیکھتے— یہ وہ لمحہ ہوتا جب ان کی آنکھوں میں غضب کی بے چارگی ہوتی..... اور یقینی طور پر مجھے اس بے بسی اور بے چارگی سے نفرت تھی۔ اور ہمیشہ کی طرح میں ڈیڈ پر غصے بھری نظر ڈالتا۔ زور سے اپنے کمرے کا دروازہ بند کرتا۔ اتنے زور سے مجھے احساس تھا، باہر سیڑھیاں چڑھتا کوئی بھی آدمی اس شور کو محسوس کر سکتا ہے۔

پھر اتنا ہوتا۔ ڈیڈ چپکے سے اپنے کمرے میں بند ہو جاتے......اور اس کے بعد وہ نظر آتے تو جیسے خود سے شرمسار ہوتے۔ جیسے وہ اپنے بچوں کی خواہشوں کو پورا کرنے میں ناکام ہوں......میں آتے جاتے، پلٹ کر غصے بھری نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتا......اور یہ لمحے میرے لیے فتح کے ہوتے......

ڈیڈ میری خواہشوں کو پورا نہ کرنے کے جرم میں ذرا سا جھکے ہوئے محسوس ہوتے......

◆◆

ٹکڑے ٹکڑے ان ہزار یادوں کے درمیان میں اس خط کو بھول گیا ہوں جو ممی نے ابھی کچھ دیر پہلے لا کر میرے ہاتھوں میں دیا ہے۔ (اور یقین کے ساتھ کہ میں نے اس سے قبل کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایک دن میں بھی کبھی ڈیڈ کی طرح ان کے ادب کا ایک حصہ ہو سکتا ہوں۔ اور یقین کیجئے کہ جب ان دنوں میں یہ بات میں اپنی ممی سارہ جہانگیر کے سامنے دہرایا کرتا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتیں۔ پھر مجھے دیکھتے ہوئے کہتیں۔

'ابھی سے کچھ بھی کہنا جلد بازی ہے پاشا۔ بچوں کے جسم میں کہیں نہ کہیں ماں باپ کی عادتیں بھی شامل رہتی ہیں۔'

'میں نہیں مانتا۔'

'مان جاؤ گے ایک دن۔'

'سوال ہی نہیں ہے۔ میں کندھے چکاتا۔ میں نے اس دنیا میں آنکھیں کھولنے کے بعد جس چیز سے سب سے زیادہ نفرت کی ہے، وہ ڈیڈ کا ادب ہے......اور تم کہتی ہو کہ......'

'ممی نے پھر مسکرانے کی کوشش کی...... 'شہزادی راستہ بھول گئی اور پھر وہ اسی موڑ پر آ گئی جہاں وہ بے نام شہزادہ کھڑا تھا۔'

'میں شہزادہ نہیں— شہزادے، شہزادیوں کے دن قصے کہانیوں کی کتاب میں دفن ہو چکے ہیں۔'

میری آنکھیں کہیں دور نکل گئی تھیں......ممنوعہ اور غیر ممنوعہ کی بحث سے یہ نسل نہیں الجھتی۔ ممکن ہے، پہلی نسل والوں کے لیے جو ممنوعہ نہ ہو، اس نسل نے اسے قبول کر دیا ہو......ڈیڈ کی طرح ممی بھی اس نسل کو اور اس نسل کی خواہشوں کو نہیں جانتیں۔ یہاں Values بدل گئے ہیں۔ جینے کا نظریہ بدل چکا ہے۔ پرانے زمانے کا بہت کچھ ہمارے لیے ڈسٹ بن میں ڈالنے جیسا ہے— جیسے ڈیڈ کی کتابیں مجھے کبھی راس نہیں آئیں۔ ہاں اگر کتابیں کما کر دے سکتی ہوں تو آپ چیتن بھگت بنئے نا......فلموں میں لکھیے۔ سے لی بریٹی بنیے۔ اور پیسوں کی کھان بن جائیے۔ لیکن ایسا لکھنا جو آپ کے بچوں کو ان کی خواہشوں کے راستے پر تنہا چھوڑ دے، میں ایسی تحریروں کو ایک بیوقوف کے چاند چھونے کے عمل سے زیادہ نہیں مانتا۔ یہ تبدیلیوں کا وقت ہے۔ گیت سنگیت بدل گئے۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے اس عہد

میں جان ابراہم سے لے کر بریٹنی اسپیرس تک ہمارے بیڈروم میں داخل ہو چکے ہیں۔اس لیے ہماری تہذیب کی کتاب میں سب کچھ Rock ہے۔اس لیے Cool ہیں ہم......

ٹھہریے......

ممی مجھے بلا رہی ہیں...... میں کیسے سمجھاؤں کہ اس طرح ممی کا آواز لگانا مجھے پسند نہیں ہے....اور مجھے معلوم ہے، ممی کی اپنی ایک علیحدہ جذباتی دنیا ہے۔اور کیسی عجیب بات، ابھی وہ اس جذباتی دنیا سے باہر نہیں نکلی ہیں۔

(۲)

"They say the sea is cold , but the sea contains the hottest blood of all .
D. H .Lawrence (whales weep not)

کچھ لوگ آپ کے دوست ہو سکتے ہیں، لیکن کوئی ضروری نہیں کہ وہ دوستی نبھانا بھی جانتے ہوں۔ میں پاشا مرزا، مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ بچپن سے اب تک میں رشتے ناطے اور دوستی جیسے جذبے سے بہت دور نکل گیا تھا۔ کالج کے زمانے میں ایک نیا شوق پیدا ہوا تھا۔ میں کتابوں سے تصویریں کاٹ کر انہیں کاغذ پر چسپاں کرتا تھا۔ زیبرا، شیر، ہاتھی، بندر، ہپوپوٹیمس یہ سب میرے دوست تھے اور شاید میں ان سے باتیں بھی کرتا تھا۔ قدرت کے نظاروں میں بھی میری زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ مذہب مجھے انسانی خوف کا ذریعہ نظر آتا تھا۔ اس لیے میں مذہب کی طرف کبھی مائل نہیں ہو سکا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ میں کمزور تھا، بزدل تھا یا طاقتور تھا۔ کوئی اندرونی طاقت ضرور تھی جس نے مجھے زندہ رکھا تھا۔ ورنہ بیس برس کی عمر میں اس دنیا کا سامنا کرنے کے لئے میں تیار نہیں تھا۔ سائنس اور اس کے کارناموں میں میری دلچسپی تھی۔ جیسے ایک دنیا میرے ڈیڈ نے قائم کی تھی، اسی طرح ایک دنیا میری بھی تھی۔ کیا یہ دنیا ڈیڈ کی وجہ سے تھی؟ ممکن ہے۔ اس بارے میں زیادہ سوچنا نہیں چاہتا۔ لیکن ڈیڈ ان لوگوں میں تھے، جنہیں کتابوں کے سوا کسی سے پیار نہیں تھا۔ میرے دوست جب گرمی کی چھٹیوں میں گھر جاتے تو میرے اندر ایک ایسا خلا پیدا ہو جاتا، جسے سمجھنے والا کوئی نہیں تھا۔ ممی بھی نہیں۔ ہو سکتا ہے ممی کو میرے اندر پیدا ہونے والے خلا کا احساس ہو۔ لیکن ممی کبھی دبی زبان سے بھی اس کا ذکر نہیں کرتی تھیں۔ کیونکہ یہ خلا صرف میرا نہیں تھا۔ یہ خلا ان کی زندگی میں بھی تھا۔ میں ابھی صرف بیس برس کا تھا اور ممی چالیس سے زیادہ بہاریں اور خزائیں دیکھ چکی تھیں۔ لیکن مجھے یہ ظلم نظر آتا تھا۔ آخر آپ اپنے اندر کے جذبات کو اس قدر قابو میں کیوں رکھتے ہیں۔؟ اس جذبے کو بلاسٹ کیوں نہیں ہونے دیتے۔ میں اکثر سوچتا ہوں، یہ بلاسٹ یہ دھماکے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ کیوں لا دیتے ہیں۔ دو اور دو کو چار سے بلاسٹ کر دو۔ بال کو کرکٹ کے بلّے سے بلاسٹ کر دو۔ بس چلے تو دنیا کو بلاسٹ کر دو۔ کیونکہ یہاں کچھ لوگ ہیں جو زندگی کا مطلب نہیں جانتے۔ تین کمروں والا بند فلیٹ میرے اندر گھٹن پیدا کرتا تھا۔ گھٹن بڑھ جاتی تو میں لیپ ٹاپ پر وہیل مچھلیوں کی تصویریں اور ویڈیو دیکھنے لگتا۔ میرا دوست ریمنڈ کہتا تھا، وہیل مچھلیاں انسانوں کی طرح آوازیں نکالتی ہیں۔ میں شارک اور وہیل مچھلیوں پر بنی ہالی ووڈ کی فلمیں دیکھ چکا تھا۔ فنتاسی میں میری دلچسپی تھی۔ خاص کر جب وہیل مچھلیاں اپنا شکار کرتی ہیں اور پانی کی سطح پر خون پھیل جاتا ہے۔ میں ایسے منظر بار بار دیکھا کرتا تھا۔ اس دن ممی اچانک کمرے میں آ گئی تھیں۔ ان کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح خوف کی بارش ہو رہی تھی۔

یہ سب کیا ہے........؟

تماشہ.........

تو تم یہ تماشہ دیکھتے ہو؟

مجھے پسند ہے۔ تم نے شارک کے جبڑے دیکھے.....

میں خون نہیں دیکھتی۔

پانی کی سطح پر تیرتا ہوا خون مجھے پسند ہے۔ میں مسکرایا۔ ممی کی طرف دیکھا...تم نے ایک بات محسوس کی ممی....

'نہیں۔ کون سی بات...'

یہ بڑی مچھلیاں انسانوں سے الگ نہیں ہیں۔ یہ وہی کرتی ہیں جو انسان کرتا ہے۔

میرا خیال ہے، ممی میری بات سے ناراض ہوکر کمرے سے باہر چلی گئیں۔ ممکن ہے ممی ناراض ہوگئی ہوں۔ مگر میں نے کبھی بھی ڈیڈ یا ممی کی ناراضگی کی پروا نہیں کی۔ بچپن میں بھی مجھے اسی طرح کے کھلونے پسند تھے۔ رائفل، پسٹل، بندوق۔

یہ کھلونے اکثر بچوں کو پسند آتے ہیں۔ بڑا ہوا تو خطرناک گیمس والے ویڈیو میری پسند بن گئے۔ ایسے ویڈیو جس میں آپ راکٹ لانچرس چلاتے ہیں۔ دھماکہ کرتے ہیں۔ ایک دنیا تباہ کرتے ہیں۔ عمارتوں کو بموں سے اڑاتے ہیں۔ اور یقین کے ساتھ ایسے ہیروز مجھے پسند تھے۔ اور اسی لئے ڈبلیوڈبلیوایف جیسے کھیل بھی مجھے مزہ دیتے تھے۔ میرے پاس ڈبلیوڈبلیوایف کے تمام ہیروز کی تصویریں تھیں اور میں انہیں جمع کرتا تھا..... ممی میری نئی نئی عادتوں سے واقف ہوجاتی تھیں۔

’تمہارے اندر شیطان آرہا ہے۔‘

’آنے دو......‘

’لیکن۔ کیوں آنے دوں.....‘

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ یہ دور شیطانوں کا دور ہے۔ آپ کچھ کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو شیطان بننا ہوگا، میں نے ممی سے پوچھا... تم جانتی ہو ایلومناتی کون ہوتے ہیں....؟ ایلومناتی.... فلم، اسپورٹس، سیاست، یہاں جو بھی بڑا ہے۔ وہ ایلومناتی ہے۔ شیطان کے پجاری۔ پوری فلمی دنیا ایلومناتی ہوچکی ہے۔ اب یہ لوگ تمہارے خداؤں سے کچھ نہیں مانگتے۔ یہ شیطان سے پاور مانگتے ہیں اور شیطان انہیں پاور سے نوازتا بھی ہے۔

’ تم پاگل ہوگئے ہو۔‘

’ میں پاگل نہیں ہوں۔ یہ ایلومناتی ہندوستان میں بھی ہیں اور ایک بڑی دنیا ان پر فدا ہوچکی ہے۔ میرا بھی جی چاہتا ہے کہ.......

کیا؟ ممی زور سے چلائی۔ خدا کی جگہ شیطان کے پجاری بنوگے۔؟‘

’ ہم سب ایلومناتی ہیں ممی۔ پتہ بھی نہیں ہوتا اور ہم شیطان کے ہمنوا بن جاتے ہیں۔ ہمارے اسکول کے دوست، ٹیچر، پولیٹیشین، سب ایلومناتی ہیں۔ کوئی طاقت تو ہے، جو خدا کی جگہ شیطان کو ہم پر مسلط اور حاوی کررہی ہے....‘

’ ایسی کوئی طاقت نہیں ہے۔‘

ممی خوفزدہ ہوگئی تھیں۔ لیکن میرے لئے یہ دنیا دلچسپ تھی۔ میں ایلومناتی لوگوں کے بارے میں بہت کچھ پڑھ چکا تھا۔ ڈین براؤن کے ناول ’اینجل اینڈ ڈیمنس‘ میں بھی ان کا تذکرہ ہے۔ اس کتاب میں عیسائیوں کے ایک فرقہ ایلومناتی کے بارے میں پڑھ چکا تھا جو صدیوں سے، خاموشی سے سازشیں اور بغاوت کررہا ہے۔ حکومتیں گرا رہا ہے اور نئی حکومتیں بنا رہا ہے۔ یوروپ کے کئی ممالک پر ان کا غلبہ ہے۔ جرمنی میں ایک چھوٹا سا شہر آباد ہے۔ انگولستاد۔ اس فرقہ کی بنیاد رکھنے والے یہاں کے ایک پروفیسر تھے۔ 1776 میں پروفیسر ایڈم وشیاپٹ نے ایلومناتی کلب کی شروعات کی تھی۔ یہ ایک خفیہ تنظیم تھی۔ جو مذہب، حکومت اور چرچ کے خلاف تھی۔ یہ برابری چاہتے تھے اور ان کا نظریہ بہت حد تک کمیونزم کے قریب تھا۔ لیکن اصل میں ایلومناتی حکومت میں اپنا نمائندہ اور طاقت چاہتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا کہ فرانس میں اٹھارہویں صدی میں جو انقلاب آیا، اس کے پس پشت بھی ایلومناتی تھے۔ امریکی صدر جان کینیڈی کا قتل بھی ایلومناتی فرقے نے کرایا تھا۔ 9/11 حملے کے پیچھے بھی ایلومناتی تھے۔

ایلومناتی کے تعلق سے جو تصویریں میں نے دیکھی تھیں، میں ان تصویروں کے اثر سے باہر نہیں نکل سکا۔ پہلا سوال یہی تھا کہ بریفو میٹ، لوسفر اور شیطان کو کیا اپنی روح فروخت کی جا سکتی ہے۔؟ ایک دلچسپ فنتا سی مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ بریفومیٹ کی ایک تصویر تھی۔ جس کا سر بکرے کا ہے۔ جسم عورت کا اور جسم کے باقی حصے الگ الگ جانوروں کے ہیں۔ میں زیادہ دیر تک اس تصویر کو نہیں دیکھ سکا۔ مجھے شدت سے احساس تھا کہ بکرے کے سر والا اور عورت کے جسم والا بریفومیٹ مجھے آواز دے رہا ہے۔ مجھ سے کہہ رہا ہے، پاور چاہتے ہو تو میری طرف آ جاؤ۔ تمہیں کچھ کرنا نہیں ہے۔ تمہیں یہ تصویر اپنی روح میں اتار دینی ہے۔ 666 نمبر۔ یہ نمبر یاد رکھو۔ یہ شیطان کا نمبر ہے۔ تمہارا نمبر ہے۔

اس نمبر نے کئی دنوں تک میرا پیچھا کیا۔ جب میں صبح میں کالج کے لئے تیار ہوتا تھا، جب اپنے شوز پہنتا تھا، جب شاپنگ کے لئے مال جاتا تھا۔ بکرے کے سر والی تصویر میرا پیچھا کرتی تھی....اور مجھے بار بار احساس ہوتا تھا کہ کوئی ہے جو مجھے طاقت دے رہا ہے۔ کوئی ہے، جو مجھے وقت کا سامنا کرنے کے لئے تیار کر رہا ہے۔ میری زندگی میں سیکس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کی بہت حد تک وجہ ڈیڈ بھی تھے۔ دو تین لڑکیاں میری دوست ضرور تھیں مگر میں ان کے بارے میں کبھی بھی سنجیدگی سے نہیں سوچتا تھا۔ ایک ان دیکھے پاور کا احساس مجھے ضرور تھا۔ فطرت کا اصول ہے کہ طاقتور ہی حکومت کرتے ہیں۔ تسلط کی جنگ آغاز سے چلتی رہی ہے۔ تسلط نئے فیشن کے طریقوں کی طرح وجود میں آ جاتا ہے۔ ایک زمانے تک یہی رواج تھا۔ ادھر جنگ میں بادشاہ کو شکست ملی ادھر اس کا سر کاٹ دیا گیا۔ قیدی بنا دیا گیا۔ سمراٹ اشوک سے اورنگ زیب تک کی کہانی مجھے معلوم تھی۔ اور اسی لئے فاتح طاقتوں کا تسلط کبھی مجھے برا نہیں لگا۔ جو کمزور ہیں انہیں ختم ہو جانا چاہیے اور اسی لئے کسی خفیہ سوسائٹی یا کسی ایلومناتی فرقہ کی باتیں اور ان کا پاور سے قریب ہونا مجھے برا نہیں لگتا تھا۔ برا اس لئے بھی نہیں لگتا تھا کہ اس فرقے میں انجینئر، مصنف، سیاستداں، دانشور، بینکر، ڈاکٹر، فلم میکر تک شامل تھے۔ جہاں سے عام انسان سوچنا بند کرتا ہے۔ ایلومناتی وہاں سے سوچنا شروع کرتے ہیں۔ تشدد اور دولت، یہ دو ہتھیار ہیں جن کی آج سب کو ضرورت ہے۔

ان دنوں ہم لڑکے اسی طرح کی سیکرٹ سوسائٹی کی تلاش میں رہتے تھے۔ کرکٹ، فٹ بال ان میں دلچسپی نہیں تھی۔ سب سے آگے ریمنڈ تھا۔ ایک دن اس نے اپنا ہاتھ دکھایا، جس پر بکرے کے سر والے بریفومیٹ کا ٹیٹو بنا ہوا تھا۔ ہمارے کھیل عجیب تھے۔ اس نے رات کے گیارہ بجے ایک پرانی حویلی کے پاس ملنے کے لئے کہا....لیکن وہاں تو کوئی نہیں جاتا؟ میری بات پر ریمنڈ زور سے ہنسا۔ اسی لیے تو جانا ہے۔ سب سے پہلے اندر کے خوف کو شیطان کے حوالے کرنا ہے۔ بریفومیٹ خوش ہوگا۔

'رات کے گیارہ بجے.....؟'

'ہاں۔ تمہیں ڈر لگ رہا ہے۔؟'

'نہیں۔'

پھر ٹھیک ہے۔ اندر کے شیطان کو جگاؤ'۔ اس نے مذاق اڑایا۔ وہ تمہارے اندر نظر نہیں آتا۔ اس عمر میں بھی۔ شیطان کو جگاؤ۔ ترقی کرو گے۔' ریمنڈ نے زور سے قہقہہ لگایا۔

◆◆

یہ ساؤتھ ایکس کا علاقہ تھا۔ یہ سوچنا مشکل تھا کہ دلی کے اس علاقے میں کہیں دور تک جنگلوں کی قطار اور ایک بھوتہا حویلی بھی

ہوسکتی ہے....اور کتنی عجیب بات، جہاں آسمان چھونے والی عمارتیں ہیں، وہاں غریبوں کی جھونپڑیاں بھی ہیں۔ جہاں ٹریفک کے شور اور سانپوں کی طرح الجھے ہوئے فلائی اوورس ہیں، اس کے پیچھے جنگل بھی ہے اور درختوں کی نہ ہونے والی قطار بھی۔ ریمنڈ پہلے سے میرا منتظر تھا۔ دور سے مجھے وہ ایک بھوت نظر آرہا تھا جو ایک درخت کے نیچے کھڑا موبائل پر کچھ دیکھنے کی کوشش کررہا تھا۔ اندھیرا بڑھ چکا تھا۔ اس طرف روشنی بھی نہیں تھی۔ نظر کے سامنے وہ حویلی تھی، جس کے بارے میں ریمنڈ نے بتایا تھا۔ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی حویلی۔ آسمان پر چاند روشن نہ ہوتا تو شاید ہمیں آگے بڑھنے میں بھی پریشانی ہوتی۔

' آؤ چلیں۔'

ریمنڈ نے میری طرف دیکھا۔ ہم شان سے حویلی میں داخل ہوئے۔ ٹوٹی ہوئی محرابیں۔ اندر گھپ اندھیرا۔ ممکن ہے بریفومیٹ کا اثر ہو، ہم پر خوف کا کہیں دور تک نام ونشان تک نہ تھا۔ ریمنڈ کی نظریں ادھر ادھر طواف کررہی تھیں۔ ہم دس پندرہ منٹ تک اس حویلی کے اندر رہے مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا، جو ہمیں خوفزدہ کرنے کے لئے کافی ہو۔ دس پندرہ منٹ بعد باہر نکل کر ہم دوبارہ اسی درخت کے نیچے کھڑے ہوگئے۔

' دیکھا۔ کوئی آیا؟ نہیں۔ بھوت پریت بھی اپنے کاموں میں مست ہیں۔ کس کو فرصت ہے کہ رات گئے ٹہلتا ہوا آئے اور ہمیں خوفزدہ کرے۔' ریمنڈ ہنسا۔ یہ بھی بریفومیٹ کا کمال ہے۔ شیطان سے سب خوفزدہ رہتے ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ بڑبڑا رہا تھا.....

' تہذیبیں مٹ جاتی ہیں۔ سندھ کی تہذیب مٹ گئی۔ سومیرین، میسو پوٹا مین...ایرانی تہذیب...آج ان کے وجود تک کا پتہ نہیں۔ یہ ایلومناتی تھے جنہوں نے آہستہ آہستہ تمام تہذیبوں کے نشان غائب کردیے.....جو طاقتور ہوگا، وہی حکومت کرے گا۔'

' ریمنڈ نے میری طرف دیکھا۔ پہلے چاکلیٹ پسند تھا۔ پھر ڈرگس میں مزہ آنے لگا۔ پہلے ڈر لگتا تھا۔ اب ڈر کو جیت لیا۔ لیکن....'

' ریمنڈ نے ایک گندی گالی باپ کے نام اچھالی۔ ہم ایک بوڑھے ڈیوڈ ہیں۔ اب اس ماسک سے باہر نکلنا ہے۔'

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ بوڑھی حویلی اسی طرح شان سے کھڑی تھی۔ چیل، کوے، پرندے، ابابیل کے گھونسلے، الٹا لٹکنے والے چمگادڑ، مکڑے کے جالے...حویلی میں ایسا کچھ بھی نہیں تھا، جس کو کسی فنتاسی کی طرح قبول کرکے اپنے گھر لے آتا۔

یہ خوف کی وادیوں سے نکلنے کی پہلی شروعات تھی۔ اس رات میں دیر تک جوراسک پارک میں رہا۔ ڈائنا سورس کے درمیان۔ ان میں ہر طرح کے ڈائنا سور تھے۔ زمین پر چلنے والے، ہوا میں اڑنے والے۔ دیوہیکل۔ ان کے درمیان انسانی وجود، للّی پٹ یا مکھی مکوڑوں کی طرح تھا....مجھے گاڈزیلا کی یاد آرہی تھی۔ ڈراؤنے خوفناک سانپ جو انسانی آبادی پر حملہ کردیتے ہیں۔ انسان جو کلچرل اور ریلجس ہبس بناتا ہے۔ مارس اور مون پر جانے کی تیاریوں کے درمیان کھلے سانڈ کی طرح مذہب کو سڑک پر کھلا چھوڑ دیتا ہے۔ ایک ہجوم موت کی آتش بازیاں لے کر گھومتا ہے۔ میں بڑا ہو رہا تھا اور ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ کلچرل اور ریلجس دونوں طرح کے ہب کے لئے میری دشمنی بڑھتی جارہی تھی۔ اس لئے کچھ دنوں تک شروع شروع میں ایلومناتی فرقے کے لوگ بھی میرے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ پھر میں یکا یک ان سے دور ہوگیا۔

ریمنڈ کا مختصر تبصرہ تھا۔ ' تم جذباتی ہو۔ اور تمہارے اندر خوف بھی ہے۔'

' مطلب؟'

' تم پورے پورے انسان ہو۔ جو گھر کے زہر کو بھی خاموشی سے اپنے اندر اتار تو لیتا ہے لیکن پوری طرح ہضم نہیں کرپاتا۔ تمہاری ذات میں رشتے موجود ہیں اور اس لئے بریفومیٹ کی طاقت تم سے دور ہے۔'

' اور تم....؟'

' میں بہت جلد نیا کرنے جا رہا ہوں ' اس نے بتایا۔ دوبار اس نے دیوار پر چلنے والی چھپکلی کو جلا کر بھی اس کا نشہ کرنے کی کوشش کی۔ چار دن بیمار رہا۔ مزہ نہیں آیا۔ مزے کے لئے کچھ اور کرنے کا ارادہ ہے۔ '

' ارادہ...' میرے لہجے میں تجسس تھا اور ریمنڈ میری طرف غور سے دیکھ رہا تھا.....' تم نے وہیل مچھلی کا نام سنا ہے نا...'

' جو انسانوں کی طرح باتیں کرتی ہے.....؟'

' اور بلیو رنگ کی ہوتی ہے...' ریمنڈ نے زور سے قہقہہ لگایا۔ بلیو وہیل۔ تم ابھی بچے ہو پاشا مرزا۔'

' مائی گاڈ۔'

میں پاشا مرزا، مجھے احساس ہے، اس لمحے جب ریمنڈ مجھ سے باتیں کر رہا تھا۔ اچانک مجھے ایسا لگا جیسے دماغ میں تیز تیز لہریں اٹھنے لگی ہوں۔ سونامی آ گئی ہو۔ زمین ہلنے لگی ہو۔ میں دھماکوں کی آوازیں سن رہا تھا۔ اور کتنی عجیب بات، میرے گھر کے لوگ، یعنی میری ممی میرے ڈیڈ اس بات سے واقف نہیں تھے کہ اس پورے ینگستان کا ایک نوجوان تنہائی میں کیسے کیسے خیالات سے دوچار ہوتا ہوگا۔ پورا ینگستان صرف وہی نہیں جہاں کچھ بچے مذہب کا، سوڈا واٹر یا شمپین کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ ایک وہ طبقہ بھی ہے جو ہر طرح کے ہوس کو رجیکٹ کرتا ہے۔ اور ایک ایسی دنیا میں ہوتا ہے جہاں کوئی ذائقہ نہیں۔ سیکس نہیں۔ اسپورٹس نہیں۔ فلم نہیں۔ رشتہ نہیں۔ گھر نہیں۔ اور اسی لئے ینگستان کا ایک چھوٹا طبقہ بہت چھوٹی چھوٹی باتوں پر سوسائیڈ بھی کر لیتا ہے۔ اور کوئی سوسائیڈ نوٹ نہیں چھوڑتا۔ وہ کیا بتائے گا کہ دیوار پر مسلسل چڑھتی ہوئی چھپکلی اسے اریٹیٹ کر رہی ہے۔ وہ جینا نہیں چاہتا۔ وہ تمام ذائقوں کو چکھ چکا ہے اور اب کوئی ذائقہ اس کی پسند کا نہیں۔ اس لئے وہ جینا نہیں چاہتا۔ ریمنڈ سے کیا اس کے باپ نے کبھی جاننے کی کوشش نہیں کی کہ وہ ڈرگس کیوں لیتا ہے؟ اور اس کے اندر کیا چلتا رہتا ہے۔؟ یہ آج کے پیرنٹس ہیں۔ جو سوچتے ہیں کہ ان کے بچوں نے کمپیوٹر، موبائل اور لیپ ٹاپ سے دوستی کر لی ہے۔ جو سوچتے ہیں کہ لو محبت، بریک اپ اس نئے ینگستان کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ جبکہ اسی موبائل اور کمپیوٹر، لیپ ٹاپ کے درمیان ہر وقت وہ بھی چپکے ہوتے ہیں۔ اور اس قدر چپکے ہوتے ہیں کہ انہیں پتہ بھی نہیں ہوتا کہ رات کے گیارہ بجے ان کا بیٹا کسی بھوتاہی حویلی، کسی ویران جگہ اپنے دل کو آخر کس طرح کی تسکین پہنچانے کے لئے گیا تھا۔ ایک دیوار ہے جو گھر سے باہر اور گھر کے اندر خاموشی سے بلند ہوتی چلی گئی ہے۔ اور اسی لئے ماں باپ اور رشتوں کے درمیان الگ الگ خانے بن گئے ہیں۔ ان خانوں میں ہی ایک بلیو وہیل ہے اور کہیں بریفومیٹ۔ بچوں میں مستقبل پڑھتے ہوئے پیرنٹس کو اس بات کی ذرا بھی خبر نہیں ہوتی کہ کسی چور دروازے سے ایک جادوگر بین بجاتا ہوا آ گیا ہے۔ اور گھروں سے نکل نکل کر چوہے اس جادوگر کے پیچھے پیچھے جا رہے ہیں۔ جادوگر بین بجانا بند کرتا ہے اور چوہے ایک ایک کر کے ہزار فٹ نیچے کی گھاٹیوں میں گرتے چلے جاتے ہیں۔ ہم یہی چوہے ہیں، جو رات ڈائناسورس کے ساتھ گزارتے ہیں اور دن وہیل مچھلی کے ساتھ اور پھر ایک دن گھر کی دیواریں ہمیں غائب کر دیتی ہیں۔

میں ایک چوہا تھا۔ دوڑتے ہوئے ڈائناسورس کے درمیان یا پانی کی لہروں کو اچھال پھینکتی ہوئی بلیو وہیل کے درمیان۔ اور یقیناً ان کے آس پاس ہی کہیں بریفومیٹ بھی ہوگا۔ 666 کے ہندسہ کے ساتھ۔ اس کے بکرے والے چہرے پر مسکراہٹ ہوگی۔ اور جسم کا عورتوں والا حصہ آکٹوپس کی طرح، جسم کی شاخوں سے باہر نکلنے کی تیاری کر رہا ہوگا۔ میں نے ایک بار اپنے کمرے کا جائزہ لیا۔ بادامی رنگ کی دیواریں۔ ایک جگہ اسکول میں ملے ہوئے ایوارڈ اور تمغے سجے ہوئے تھے۔ ایک چھوٹا سا بیڈ تھا، جس پر آرام کرتے ہوئے عام

طور پر فیئری ٹیلس یا زندہ پریوں سے دور ہی رہتا تھا۔ایک میز ایک کرسی۔ دوسری طرف میرے چار پانچ جوتے زمین پر قرینے سے رکھے تھے۔ دیوار پر ڈبلیو ڈبلیو ایف کے کھلاڑیوں کی دو پینٹنگس تھیں۔جس میں اب میری کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یہ کمرہ میرے لئے نہ جنت تھا، نہ جہنم، بلکہ میرے آوارہ خیالوں کو ایک جہنم سے دوسرے جہنم تک لے جانے کا کام کرتا تھا۔اس سے زیادہ اس کمرے کی حیثیت نہیں تھی۔ کچھ کتابیں بھی تھیں، جنہیں کبھی کبھی دیکھ لیا کرتا تھا۔ چلنے کی آواز کے ساتھ ہی میں سمجھ گیا تھا کہ ممی میرے کمرے کی طرف آ رہی ہیں۔ کمرے میں آنے کے بعد بھی ممی کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا محسوس ہوا...

تمہیں کچھ محسوس ہوا پاشا...

نہیں تو....

کچھ اسمیل آ رہی ہے....کہیں کوئی چوہا۔

میں زور سے ہنسا۔شارک مچھلی ہوگی۔ مادہ شارک مچھلی۔ڈیڈ سے کیوں نہیں پوچھتیں....؟

'ممی سارہ جہانگیر کے ہونٹوں پر ناراضگی تھی۔ وہ تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔اور پیار دکھاوا نہیں ہے۔ وہ اپنے دل کی بات نہیں کہتے...اور دل کی بات کو کہنا بھی نہیں چاہیے۔کچھ لوگ ایسا کرتے ہیں۔مگر تمہارے ڈیڈ مختلف ہیں۔'

مجھے احساس تھا، بریفومیٹ اس وقت کمرے میں ہے۔اور مجھے زور زور سے گدگدا رہا ہے۔ مجھے ہنسی آ رہی تھی۔اس کے بکرے والا چہرہ بہت تیزی سے ہل ڈول رہا ہے....میں ممی سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اس وقت کچھ بھی کہنا ممکن نہیں تھا۔

مثال کے لیے یہ کہنا چاہتا تھا کہ جب بہت گہرا سناٹا ہو، کھلے روشن دان کے باوجود کمرے میں گھپ اندھیرا ہو، باہر ہوا سرسرا رہی ہو مگر کمرے میں ہوا کا گزر نہیں ہو، روشنی دو کمرے چھوڑ کر تیسرے کمرے میں نہیں آتی ہو اور جب کمرے میں اچانک کچھ بھی نہ ہونے کے باوجود بدبو کی تیز لہر ہونے کا احساس ہو، جب مسلسل آپ کو ذبح کیا جا رہا ہو، یا مسلسل ناکامیاں آپ پر حاوی ہوں، ایک بلیو وہیل ان ہی لمحوں کے انتظار میں ہوتی ہے۔آپ اسے دیکھ نہیں پاتے....وہ چپکے چپکے آپ پر قبضہ کر لیتی ہے۔

میں پاشا مرزا، مجھے یقین تھا، کوئی مجھے اپنے ساتھ لیے جا رہا ہے۔مگر کہاں؟ یہ میں بھی نہیں جانتا تھا۔

(۳)

میں اکثر سوچتا تھا، پر نکلتے ہی جیسے پرندے آزاد فضا میں اپنی اڑان بھرتے ہیں، ہم کیوں نہیں بھر سکتے۔ اس دن ریمنڈ نے خوف زدہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد دو دنوں تک ریمنڈ کہیں نظر نہیں آیا۔ پنیت، گریسی، نشا اور نیتی بھی پریشان تھے۔ گریسی نے بتایا کہ اس کا موبائل بھی بند آ رہا ہے۔ کبھی کبھی گھنٹی بجتی ہے، مگر وہ اٹھاتا نہیں۔

' اس کی فکر چھوڑ دو' پنیت نے کہا۔ وہ ایسا ہی ہے۔ جی چاہے گا تو وہ فون اٹھائے گا۔'

' ہوسکتا ہے، وہ وہیل سے باتیں کرنے گیا ہو' گریسی نے کہا تو میں چونک گیا۔

' یہ تم کو ریمنڈ نے بتایا۔؟'

' ہاں۔'

' اور یہ کہانی دلچسپ ہے۔'

' تم ریمنڈ سے ملی ہو؟'

' وہ میرے گھر آیا تھا۔ پریشان تھا۔ سیکس کرنا چاہتا تھا۔ پھر ہم دونوں نے دیر تک انجوائے کیا۔ اس دن ممی ڈیڈی بھی گھر نہیں تھے۔

نیتی خاموش رہی۔ میں نے نشا کا چہرہ دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک لمحے کے لئے ناراضی پیدا ہوئی پھر وہ اپنے رنگ میں واپس آئی۔

' اور اس نے کیا کہا؟'

' نیو یارک میں ایک ٹینک سے انسانی آوازیں آ رہی تھیں۔ ریسرچ کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ آوازیں ایک وہیل مچھلی نکال رہی ہے۔ ان آوازوں کو باقاعدہ طور پر ریکارڈ بھی کیا گیا۔ مزے کی بات ایک غوطہ خور نے بتائی۔ وہ شان ڈیگو کا باشندہ ہے۔ اس نے بتایا کہ وہیل مچھلیاں اس طرح کی آوازیں نکالتی ہیں، جیسے دو انسان دور کھڑے ہو کر گفتگو کر رہے ہوں۔'

' گریسی نے نشا کی طرف دیکھا.... اس دن جب ریمنڈ نے اپنے کپڑے اتارے تو مجھے وہ بلیو وہیل کی طرح نظر آیا۔ میرے جسم پر اس کی سرسراہٹ ایسی ہی تھی، جیسے پانی میں وہیل مچھلی ڈبکی لگاتے ہوئے کرتب دکھاتی ہے۔ ڈولفن کی طرح..' وہ اچانک رُکی۔ اس نے بلیو وہیل کے بارے میں بھی بتایا تھا۔

نیتی نے روک دیا۔ تم کو اس طرح کھل کر سیکس کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے برا نہیں لگتا....؟

برا کیوں لگے گا۔ گریسی نے ٹھہاکہ لگایا۔ کیا ہم میں سے کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ ورجن ہے۔...؟

' نیتی کے چہرے پر غصے کے آثار تھے۔ میں کہہ سکتی ہوں۔ سیکس ایک ذاتی معاملہ ہے.... اور میرا خیال ہے اسے ذاتی ہی رہنا چاہیے۔'

نشا نے ٹھہاکہ لگایا۔ اب کچھ بھی پرسنل نہیں۔ بلیو وہیل تک نہیں۔ ہاں گریسی تم کچھ بتا رہی تھیں.... بلیو وہیل کے بارے میں...

میں نے پنیت اور نیتی کی طرف دیکھا۔ دونوں اپنی دنیا میں گم تھے.... اور گریسی کی گفتگو میں ان دونوں کو زیادہ دلچسپی بھی نہیں

تھی۔لیکن میری دلچسپی تھی۔گریسی کے ہونٹوں پر چمک تھی۔اس کے ہونٹ سرخ تھے۔مگر انگاروں جیسا لباس پہننے کے باوجود بھی میرے نزدیک اس کی کشش بے معنی تھی۔جبکہ میں جانتا تھا گریسی مجھ میں دلچسپی لیتی ہے....اور ریمنڈ کا ذکر اس نے اسی لیے چھیڑا ہے کہ میں اس کی طرف راغب ہوسکوں۔مگر گریسی اس بات سے واقف نہیں کہ میرے اندر سیکس کو لے کر ایک زبردست کشمکش چلتی رہتی ہے اور میں نے کبھی بھی سیکس کے لئے کوئی خاص جھکاؤ محسوس نہیں کیا.....

اس بار گریسی نے میری طرف دیکھا... یونو پاشا۔ بلیو وہیل قدیم ترین جانداروں میں سے ایک ہے۔ جب ڈائنا سورز کا دور تھا، تب بھی سمندر پر ان کی حکومت قائم تھی۔ وہیل کا سائز بڑے سے بڑے ڈائنا سور سے بھی بڑا ہوتا ہے۔ بلیو وہیل بغیر کچھ کھائے 6 ماہ تک زندہ رہ سکتی ہیں۔ایک نوالے میں 500 کلوگرام کرل یا چھوٹی مچھلیاں کھا سکتی ہے۔ میں نے اس دن ریمنڈ سے پوچھا تھا۔تم نے کتنی مچھلیاں کھائی ہیں...جتنی تمہاری وہیل مچھلی نہیں کھا سکتی۔ یہ ریمنڈ کا جواب تھا۔گریسی نے قہقہہ لگایا۔

نیتی نے میری طرف دیکھا...ان باتوں پر زیادہ دھیان مت دیا کرو۔کلاس کا بہانہ کر کے وہ چلی گئی۔کچھ دیر بعد نشا اور پنیت بھی چلے گئے۔گریسی کچھ ڈسٹرب محسوس ہوئی۔گریسی میں مجھے یہ بات پسند ہے کہ وہ کبھی بھی خود کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتی۔

میں نے اسٹیو جابس والے انداز میں کہا...آؤ،آنے والے کل میں کچھ نیا کرتے ہیں۔بغیر اس بات کی فکر کیے کہ کل کیا ہوا تھا۔

' کیا یہ ممکن ہے؟'

' ہاں۔'

'میرے خیال سے نہیں۔کیا تم گھر کو بھول سکتے ہو۔میرا خیال ہے نہیں۔'

'اور تم؟' میں نے کہتے ہوئے پھر اسٹیو جابس کو پاس میں محسوس کیا، جو مجھ سے کہہ رہے تھے...ڈیزائن وہ نہیں ہے کہ چیز کیسی دکھتی یا محسوس ہوتی ہے۔ڈیزائن وہ ہے کہ چیز کام کیسے کرتی ہے۔موت اس زندگی کی سب سے بڑی ایجاد ہے۔لیکن ایک سچ زندگی بھی ہے۔'

'اسٹیو کچھ اور قریب آ گئے تھے۔تمہارا وقت محدود ہے۔اپنے خیالات کے شور میں اپنے اندر کی آواز کو مت ڈوبنے دو۔'

اسٹیو غائب تھے۔ میں نے گریسی کا جائزہ لیا۔ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ باپ عیسائی تھے۔ ماں ہندو تھی۔گریسی کے باپ نے اپنے انکل سے بزنس کے لئے لون لیا تھا۔انکل گریسی کی ماں کے ساتھ رات گزارنا چاہتے تھے۔گریسی کے باپ نے اس کی اجازت دے دی۔صبح ہوتے ہی گریسی کی ماں غائب تھی۔گریسی کے باپ نے زیادہ تلاش کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ پھر وہ اپنی عیاشیوں میں ڈوب گیا۔گریسی نے کئی بار بتایا کہ وہ ایک بوجھ کی طرح زندگی گزار رہی ہے....اور ممکن ہے اپنی عیاشیوں کے لئے اس کا باپ کسی سے اس کا بھی سودا کر لے۔ڈیزائن وہ نہیں ہے کہ چیز کیسی دکھتی یا محسوس ہوتی ہے۔اس نظریے سے گریسی مجھے مختلف نظر آئی۔اس کا باپ ایک نئی عورت لے آیا تھا۔سوتیلی ماں سے گریسی کا رشتہ کچھ زیادہ بہتر نہیں تھا۔گریسی کے مطابق اس گھر میں وہ اپنا وقت گزار رہی ہے اور کبھی بھی بلیو وہیل کی طرح ڈبکی مار کر وہ کسی اور جہان میں نکل جائے گی۔

پنیت، ریمنڈ سب کی کہانی ایک جیسی تھی۔ان میں کوئی بھی اپنے باپ سے خوش نہیں تھا۔ان میں نیتی الگ تھی۔مگر ایک بات سب میں مشترک تھی۔ مذہبی جنون کہیں نہیں تھا۔ وہ جنون جو چور دروازے سے داخل ہو کر کسی کو بھی بزدل بنا دیتا ہے۔ میں پاشا مرزا، مجھے ابھی بھی اس بات کا احساس ہے کہ ہم میں سے زیادہ تر لوگ اس نئے ریگستان سے واقف نہیں تھے۔ بیشتر ابھی بھی یہ سمجھتے ہیں کہ یہ نسل موبائل اور لیپ ٹاپ عہد کی پیداوار ہے۔اپنا قیمتی وقت پورن سائٹ میں گزارتی ہے....اور ان کا مطالعہ صفر ہے۔ہم میں سے بیشتر

ایسے ہیں جو گوگل اور دیگر ویب سائٹس سے نوٹس لیتے ہیں اور زندگی کو سمجھنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔اس لئے بڑی نسل کے لوگوں کا ایک بڑا حصہ اس نئے ریگستان کو سمجھنے میں ناکام ہے۔ان میں ہمارے ماں باپ بھی شامل ہیں۔ڈیڈ زندہ تھے تو میں نے ایک بار ڈیڈ سے پوچھا تھا۔

' یہ وضو کرنے کا طریقہ تو آپ لوگوں نے پارسیوں سے لیا۔'

'ایسا نہیں کہتے۔'

' لیکن یہ سچ ہے۔ان کا مذہب بہت پرانا ہے...اور وضو کی رسم پارسیوں میں تھی۔کچھ رسمیں آپ نے یہودیوں سے لیں۔'

'یہ بھی غلط ہے۔'

میں نے ڈیڈ کے چہرے کے اڑے رنگ کو اس وقت محسوس کر لیا تھا۔ڈیڈ کوئی مذہبی آدمی نہیں تھے۔کبھی کبھی جمعہ کی نماز یا عیدین کی نماز تک محدود تھے۔مگر ان کے اندر ایک مسلمان ہمیشہ زندہ رہا....اور اسی لئے وہ مذہبی باتوں پر بحث پسند نہیں کرتے تھے۔خاموش ہونے سے قبل اتنا ضرور پوچھتے تھے، یہ سب کہاں سے سیکھا؟ میں انہیں کیا بتاتا کہ ہماری جنریشن سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں رکھتی۔ اندھی تقلید بھی گوارہ نہیں۔ہم اسٹیو جابس اور اسٹیفن ہاکنگ کے دور کے نوجوان ہیں،جن کو مذہب کی اندھی روایات سے باندھ کر نہیں رکھا جا سکتا۔اسی زمانے میں میں نے کچھ نوٹس لئے تھے۔انسان محض قدرتی وسائل کا حصہ ہے۔ہزاروں لاکھوں برس قبل بگ بنگ یعنی ایک بڑے دھماکے سے یہ دنیا وجود میں آ گئی تھی اور انسان کی حیثیت بقول ہاکنگ بس اتنی ہے کہ ایک بڑا دھماکہ پھر سے ہماری دنیا کو تباہ کر دے گا....اور اسی لئے ہاکنگ نے کہا کہ اب نئے سیاروں پر زندگی کی تلاش شروع کرنی چاہیے۔لیکن ڈارون کے بندر کی تقدیر میں ایک شاخ سے دوسری شاخ تک اچھلنا ہی لکھا ہے۔ڈی این اے اور ڈولی بھیڑ کی دریافت کے بعد انسان نے ایجادات کے ایک نئے جزیرے پر قدم رکھا۔ایک چہرے جیسے ہزار چہرے وجود میں آ سکتے ہیں۔ریمنڈ جیسا ایک ریمنڈ۔گریسی جیسی ایک گریسی اور پاشا مرزا جیسا ایک پاشا مرزا....سب فریب۔اس فریب میں رشتوں کے لئے کوئی جگہ نہیں۔اس لیے نہ ریمنڈ خوش ہے نہ گریسی اور نہ میں....

' کیا سوچنے لگے..' گریسی نے ٹھہر کر پوچھا۔

' کچھ نہیں۔'

' میرے ساتھ سیکس کرو گے۔' گریسی بچوں کی طرح میری طرف دیکھ رہی تھی۔

' میں ڈولی بھیڑ کی طرح ایک کلون ہوں، جسے وقت نے اداس کر دیا ہے۔'

' سیکس کر لو۔سیکس آپ کو ہر طرح کے ٹینشن سے آزاد کرتا ہے۔'

' تمہارے گھر؟'

'ہاں۔'

'لیکن وہاں تمہاری سوتیلی ماں ہوگی۔باپ ہوں گے..'

' باپ باہر رہتے ہیں۔ماں آزاد....اور میری اپنی دنیا۔'

' کیا تمہاری دنیا میں صرف سیکس ہے؟'

گریسی نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔' تم جانتے ہو زندگی کا بورڈم کیا ہوتا ہے۔گھٹن ہوتی ہے۔کبھی کبھی لباس تار تار کرنے کی

خواہش ہوتی ہے۔کبھی کبھی لگتا ہے پورے گھر میں آگ لگا دوں۔' گریسی کی آنکھیں نم تھیں۔'میں اکثر زور زور سے چیخنا چاہتی ہوں۔مگر چیخ نہیں پاتی۔پھر یہ گھٹن کیسے نکالوں۔سیکس میرے اندر کی گھٹن کو ختم کرتا ہے۔تمہارے پاس کوئی ذریعہ ہے اپنی گھٹن کو نکالنے کے لیے۔'

'ہاں۔' مختصر جواب تھا۔

'کیسے....'

'ایک غیر فطری راستہ بھی ہے۔'

'لیکن جب فطرت خود تم کو آواز دے رہی ہو' اس بار گریسی کی آنکھوں میں چمک تھی۔میرا جسم دودھ کی ایک نہر ہے۔اس میں سونامی کی طرح لہریں اٹھتی ہیں۔سمندر کی طرح جوار بھاٹا آتا ہے۔آتش فشاں کی طرح بارود ہی بارود بھرے ہیں اور سنو مرزا پاشا۔یہ بارود پھٹنا چاہتا ہے۔دھماکہ چاہتا ہے۔'

اس نے آہستہ سے میرے ہاتھوں کو تھاما۔اس کی انگلیاں جل رہی تھیں۔چہرے پر بھی آگ روشن تھی۔چل رہے ہو نا..'

'نہیں،' میرا مختصر سا جواب تھا۔

(۴)

’ ایک دن تم اپنی ہی فنتاسیوں سے بور ہو جاؤ گے پھر زندگی تمہارے لیے دوزخ بن جائے گی‘

دوروز بعد ریمنڈ واپس آ گیا۔ وہ اس طرح پُرسکون تھا جیسے اس نے کوئی فیصلہ کرلیا ہو۔ پہلے ہم نے کیمپس میں ریس لگانے کا فیصلہ لیا۔ہم دونوں تیز دوڑے۔نشا، گریسی، پنیت اور نیتی تالیاں بجاتے رہے۔کیمپس کے کئی چکر لگانے کے بعد ہم دونوں نڈھال ہو چکے تھے۔نشا نے پنیت کا ہاتھ تھام رکھا تا۔ یہ منظر میرے لیے خوشگوار تھا۔پنیت کی باتیں اکثر میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ وہ نئی نئی گالیاں ایجاد کرنے میں ماہر تھا اور کوئی بھی اس کی بات کا برا نہیں مانتا تھا۔

’ خود کو اذیت دو۔ پھر دوسروں کو اذیت دینا سیکھ جاؤ گے۔ یہ بریفومیٹ کہتا ہے۔‘ سانسیں برابر کرتے ہوئے ریمنڈ نے قہقہہ لگایا
۔

’ تو اسی لیے ریس کا سہارا لیا؟‘ نشا نے پوچھا۔

’ زندگی ایک ریس ہے.....اور ہر ریس ایک نیا تجربہ۔‘

’ غائب کہاں رہا اتنے دن؟‘ پنیت نے پوچھا۔

’ فون کیوں نہیں اٹھا رہے تھے۔‘ نیتی نے سوال کیا۔

’ فون پر کیا کہتا۔کیا بتا تا۔ ویسے بھی جب میری مرضی ہوتی ہے فون اٹھا لیتا ہوں۔ یہ بریفومیٹ، ریمنڈ نے ہنستے ہوئے اپنا ٹیٹو دکھایا۔اس نے کہا، باپ کو تھپڑ مارنا ہوگا۔‘

’ باپ کو تھپڑ؟‘ گریسی زور سے چیخی۔

’ ہاں۔ بریفومیٹ نے کہا۔ میں نے کر دکھایا۔ بہت آسان تھا۔ وہ مجھے گھر سے نکال رہا تھا۔ میں نے کہا، تم کو شمشان پہنچانے کے دن آ گئے۔گھر تو اب میرا ہے۔نکلنا تمہیں ہوگا۔ بات آگے بڑھ گئی۔‘

ریمنڈ ہنس رہا تھا۔ یہ باپ سمجھتے ہیں کہ سنجیونی جڑی بوٹی کھا کر آئے ہیں۔کبھی مریں گے ہی نہیں۔اب ڈرتے ہیں مجھ سے۔بس ایک لمحہ، جیتنے کے لیے ایک لمحہ کافی ہوتا ہے۔

میری آواز کمزور تھی۔لیکن تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یہ غلط ہے۔وہ دوبارہ تمہیں نکال سکتے ہیں۔

’ اب مجھے ڈر نہیں ہے۔‘

’ کیوں؟‘

’ میں نے بلیو وہیل سے دوستی کر لی ہے۔‘

اس کے بعد ریمنڈ رُکا نہیں۔تیز تیز چلتا ہوا ہمیں سوالوں کے گھیرے میں چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

پنیت اس کے جانے کے بعد زور سے چیخا۔ تم اس کا مطلب سمجھتے ہو؟'
' نہیں۔' نشا کی آواز کمزور تھی۔
' میرا خیال ہے، اس نے اپنی پسندیدہ موت کا انتخاب کر لیا ہے۔ وہ خودکشی کرنے جا رہا ہے۔ اسے روکو۔'
مائی گاڈ۔ میں خوف سے نہا گیا تھا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ وہ بار بار بریفومیٹ اور وہیل مچھلی کا تذکرہ کیوں کر رہا تھا۔ وہ بھی بلیو وہیل۔'
' بلیو وہیل گیم؟' نشا زور سے چیخی۔ اس گیم میں صرف موت ہے اور کچھ بھی نہیں ہے۔
' کیا ہم اسے روک سکتے ہیں۔ شٹ۔' پنیت جھلاّ کر بولا۔ اتنے دنوں سے ہم اس کی باتوں کا مذاق اڑا رہے تھے۔ مگر ریمنڈ اس حد تک جا سکتا ہے، کبھی سوچا نہیں تھا۔ یہ صرف ایک فنتاسی نہیں ہے۔ اس کا ہر قدم ایک نئی موت کا ذائقہ ہے۔'
' اس کے پاس کیا ہے؟' میری آواز بھی کمزور تھی۔ لائف اسٹائل میں ویرائٹی کا قائل تھا۔ موت کا کھیل بھی ایک ویرائٹی ہے۔ مگر تھا کیا اس کے پاس۔ رشتے نہیں تھے۔ ہم جیسے دوست تھے۔ پورا بلینک تھا۔' اندر سے باہر تک تھا..... اور اب.... وہ وہیل کے جبڑے میں سما جائے گا..... اس کا ذمہ دار کون ہے؟'
گریسی رو رہی تھی۔' ذمہ دار کوئی نہیں ہوتا۔ ہم خود ہوتے ہیں۔ لیکن ہم اپنی آنکھوں کے سامنے اسے آہستہ آہستہ مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔'
پنیت کی آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔ ایک دن ہم سب کو بلیو وہیل نگل جائے گی اور ہم میں سے کوئی بھی کچھ نہیں کر پائے گا۔

◆◆

طوفان آنے والا ہے، کالج سے نکلنے سے قبل یہ بات نشا نے کہی تھی۔ موسم اچانک تبدیل ہو گیا تھا۔ آسمان پر سیاہ بادل چھا گئے تھے۔ کالج سے کچھ دوری پر ایک قبرستان تھا۔ دس پندرہ لوگ تھے۔ مجھے اس بات کا قطعی احساس نہیں تھا کہ کسی وقت بھی بارش ہو سکتی ہے۔ میں دیر تک قبرستان کے گیٹ کے پاس کھڑا رہا۔ دائمی سکون۔ یہ لفظ میرے ہونٹوں تک آ کر خاموش ہو گیا تھا۔ قبر پر مٹی ڈالنے تک ایک چھوٹا سا ڈھیر بن گیا تھا۔ مردے کے ساتھ آنے والے پرسکون نظر آئے، جیسے اس بات سے واقف ہوں کہ ایک دن سب کے ساتھ یہی ہونا ہے۔ لیکن موت کے تعاقب میں جانے کے لئے ہر کوئی بلیو وہیل کے پیچھے نہیں بھاگتا۔ موسم کچھ ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ پرچھائیاں مجھے گھیر رہی تھیں۔ کچھ چہرے تھے، جو اچانک نگاہوں کے سامنے آ گئے تھے۔ سزا یافتہ قیدیوں کی طرح بچپن کی بوجھل یادیں حافظہ میں تیر رہی تھیں۔ کیا وہ گھر تھا، جہاں بچپن گزر گیا۔
کیا صرف تین کمروں کی موجودگی کو گھر کہنا مناسب ہے۔ صرف ممی سارہ جہانگیر تھیں جو روحوں کی طرح ادھر ادھر منڈلایا کرتی تھیں.... اور ہر کچھ دیر بعد ان کی آواز قید خانے میں گونج جاتی تھی.... اچھا... ذرا سنو تو پاشا... پاشا میرے بیٹے۔ دوسرے کمرے میں ایک باپ ہوتا تھا۔ اپنی کتابوں میں کھویا ہوا۔ لکھنے میں مصروف... اکثر یہ خیال گزرتا کہ یہ شخص کوئی کام کیوں نہیں کرتا۔ لکھنے سے حاصل کیا ہے! یہ شخص خودغرض ہے۔ یہ صرف اپنے لیے جیتا ہے۔ اسے نہ ممی کا خیال ہے نہ میرا۔ اسے صرف اپنا خیال ہے۔ اس کی شہرت اس کی اپنی ہے۔ ایسی شہرت سے کیا حاصل، جہاں زندگی کی دو خوشی بھی خریدی نہ جا سکیں۔ ممی کے پاس بہت سے سوالوں کے

جواب نہیں تھے۔

مثال کے لیے میں نے پوچھا....تمہارے کنگن کہاں گئے؟

' اب نہیں ہیں۔'

'تمہیں زیورات پسند نہیں؟'

' بالکل بھی نہیں۔'

' تم حملہ کیوں نہیں کرتیں..'

کس پر؟ ممی یعنی سارہ جہانگیر ایک دم سے چونک جاتیں۔تم پورے پاگل ہو، پاشا بیٹے۔

' ایک شخص نے پورے گھر کو پاگل خانہ بنا رکھا ہے۔'

' وہ انقلابی ہیں۔ترقی پسند رجحان رکھتے ہیں۔ساری دنیا کے لیے لڑتے ہیں۔'

' اور ہمارے لیے...'

ممی کے پاس مسکراہٹ کے سوا کوئی جواب نہیں ہوتا۔اس لیے میری خواہش تھی کہ کاش ممی کے تیور کسی جنگلی بلی کی طرح ہوتے، جس کے ناخن بڑے بڑے ہوں اور جو حملہ کرنا جانتی ہو۔لیکن ممی انتقام کے کسی اصول، کسی راستہ سے واقف نہیں تھیں.....

بارش کے آثار پید ہو گئے تھے۔کچھ دیر میں، میں گھر پہنچ گیا۔پہلا کام اپنی مرضی کا کیا۔مجھے یقین تھا۔ممی کو اس کی خبر لگ جائے گی۔میں اپنے کمرے میں آ گیا۔لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھ گیا۔ٹھیک اسی وقت ممی کی آواز گونجی.... پاشا بیٹے...مجھے اچانک ان کے چہرے میں جنگلی بلے کا احساس ہوا۔وہ اپنے تیور کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

باہر ڈرائنگ روم میں ایک تصویر تھی؟

'میں نے اسٹور روم میں رکھ دی۔'

' لیکن کیوں....؟ممی کے چہرے پر ناگواری کے احساس نمودار ہوئے۔کیا ضروری ہے کہ اس گھر میں وہی ہو جو تم چاہتے ہو۔'

' یہ تو پہلے بھی ہوتا رہا۔'

' پہلے کچھ نہیں ہوا۔یہ تمہارے ڈیڈ تھے جو چھوٹی سے چھوٹی بات کے لیے بھی مجھ سے مشورہ کرتے تھے۔،ان کا بس ایک قصور تھا۔ لیکن پاشا میں اس بات پر ابھی بھی قائم ہوں۔ہماری کائنات میں ایک اچھے آدمی کی کمی ہو گئی ہے۔'

' میں یہ کمی محسوس نہیں کرتا۔'

' میں نے محسوس کیا، سارہ جہانگیر کے چہرے کا رنگ اچانک تبدیل ہوا۔ممی نے اچانک میرے ہاتھوں کو تھاما۔مجھے احساس تھا، ان ہاتھوں میں لرزش ہے....کبھی کبھی انگلیاں، ہتھیلیاں اور لمس بھی بولنے لگتے ہیں۔ممی کے ہاتھوں کی گرفت سخت تھی۔مجھے ایک لمحے کے لیے احساس ہوا، ممی کی ساری ناراضگی ان کی ہتھیلیوں میں سمٹ آئی ہو۔

' وہ صرف ایک تصویر نہیں تھی، جسے تم اسٹور میں ڈال آئے۔تم نہیں جانتے، یہ تصویر مجھے زندہ رکھتی ہے۔میں اکیلی ہوتی ہوں تو تصویر کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہوں۔مجھے کبھی احساس نہیں ہوا کہ وہ نہیں ہیں۔جب میں ایسا کرتی تھی اور مجھے احساس ہے کہ وہ تصویر سے نکل کر میرے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔میرے پاشا، تم اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔زندگی میں کوئی کہیں نہیں جاتا۔سب پاس

ہی تو ہوتے ہیں....اور دیکھو پاشا، مجھے ابھی بھی لگ رہا ہے، وہ دو آنکھیں مجھے دیکھ رہی ہیں۔ کیا تمہیں احساس نہیں ہوا کہ تم مجھ سے کچھ چھین رہے ہو۔'

میں پاشا مرزا، مجھے یقین ہے، میری آواز بوجھل تھی۔ میں نے صرف اتنا کہا.... یہ تصویر مجھے پریشان کرتی ہے۔ انہوں نے کچھ بھی نہیں کیا ہمارے لیے....

'کیا یہ خود غرضی نہیں ہے میرے بیٹے، پیارے بیٹے پاشا۔؟' سارہ جہانگیر کے چہرے پر ابھی بھی خزاں کا کوئی رنگ نہیں تھا۔' وہ اگر تمہارے لیے کچھ کرتے، کیا اسی صورت میں پیار ممکن ہے؟'

' میں نے یہ نہیں کہا۔' میں نے اچانک محسوس کیا، میرے سر کی جگہ بریفومیٹ کے بکرے والا چہرہ آ گیا ہو۔ اس بار میری آواز میں غصہ بھی شامل تھا۔' چلو ممی تمہاری بات مان لیتا ہوں۔ لیکن ایک باپ کا کیا فرض ہوتا ہے۔ صرف بچے پیدا کر دینا۔ تم ٹی وی چینلز دیکھتی ہونا... ٹیلنٹ ہنٹ والے پروگرام۔ چھوٹے چھوٹے بچے اپنے ماں باپ کے ساتھ آتے ہیں اور فخر سے بتاتے ہیں کہ ان کے باپ نے ان کے لیے اپنی زندگی قربان کر دی۔ کوئی بچہ سنگر بننا چاہتا ہے تو باپ اس کو وقت دیتا ہے۔ کوئی ایکٹر بننا چاہتا ہے۔ کوئی اسپورٹس میں جانا چاہتا ہے۔ میرے پاس کیا ہے.... اب سوچتا ہوں تو لگتا ہے کہ میرے خواب شیشے سے بھی زیادہ کمزور تھے۔ تم جانتی ہونا۔ مجھے کرکٹ کا شوق تھا۔ میرے کھیل کو دیکھنے والے میرے کھیلنے کے انداز پر عاشق تھے۔ ڈیڈ نے کیا کیا۔ دو بار مجھے کھیلنے کے لیے باہر لے گئے۔ اس کے بعد کوچنگ کا دروازہ بند۔ ان کے پاس وقت نہیں تھا۔ میں آج بھی نہیں بھول پایا۔ میں کرکٹ دیکھتا ہوں تو زخم تازہ ہو جاتے ہیں۔ کوئی ایک خواہش، میں کچھ دیر کے لیے ٹھہرا، ممی کی طرف دیکھا۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ ڈیڈ نے میری کوئی ایک خواہش بھی پوری نہیں کی۔ وہ صرف اپنے لئے جیے۔'

'ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا لیکن وہ ہمارے لیے جی رہے تھے۔' ممی سارہ جہانگیر کا چہرہ اب بھی پُر سکون تھا.... وہ ایک بہترین باپ تھے۔ وہ تمہارے سوچنے کے درمیان کبھی نہیں آئے۔ وہ ہمیشہ تمہارے فیصلوں کے آگے کھڑے رہے کہ فیصلہ میرے بیٹے نے کیا ہے۔ تم بہت کچھ نہیں جانتے۔ مگر.... اب تمہیں جاننا چاہیے...'

سارہ جہانگیر کی آنکھوں میں اس وقت بھی مسکراہٹ تھی۔ انہوں نے دیوار گھڑی کی طرف اشارہ کیا، ' جانتے ہونا، گھڑی میں تین سوئیاں ہوتی ہیں۔ ایک سوئی سیکنڈ والی سوئی کہلاتی ہے۔ اس سیکنڈ والی سوئی کا کوئی وجود نہیں۔ ہم وقت دیکھتے ہیں تو سیکنڈ کا تذکرہ بھی نہیں کرتے۔ سب یہی کہتے ہیں، بارہ بجکر پندرہ منٹ ہو گئے۔ ایسا ہوتا ہے نا، پاشا میرے بیٹے۔ جبکہ سیکنڈ والی سوئی سب سے زیادہ محنت کرتی ہے۔ وہ ان دونوں سوئیوں کو آگے بڑھانے میں مدد کرتی ہے۔ تمہارے ڈیڈ سیکنڈ والی سوئی تھے۔ ان کے پاس کچھ ہوتا تو وہ ہم پر ہی نچھاور کر دیتے۔ وہ جس دنیا میں تھے، ہر دن اس دنیا سے امید کرتے تھے کہ کوئی معجزہ ہوگا......'

' لیکن معجزہ تو نہیں ہوا۔ یہ صدی معجزوں کے لیے نہیں ہے۔ کچھ کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں چلانے پڑتے ہیں..... اور پاپا کو ایسا کوئی شوق نہیں تھا۔'

مجھے اس بات کی بھی ناراضگی تھی کہ ہر طرح کی شکایت برداشت کرنے کے باوجود ممی کے ہونٹوں پر کبھی ڈیڈ کے لیے شکایت کا کوئی حرف کیوں نہیں آیا۔ ڈیڈ کی حمایت میں ممی کے پاس مضبوط دلیلیں ہوا کرتی تھیں۔ کیا ڈیڈ کی تصویر کو اسٹور میں رکھ کر میں نے غلطی کی ہے؟ کیا حقیقت میں ممی کے دل کو تکلیف پہنچی ہے۔ تصویر تو دل میں بھی رکھی جا سکتی ہے، نمائش کیا ضروری ہے کہ دیوار پر آویزاں ہو۔ میری آواز میں ابھی بھی تلخی

برقرار تھی۔

'وہ مجھے لے کر کہیں نہیں گئے۔ مجھے شکایت نہیں درد ضرور ہے۔لیکن آپ کو لے کر جا سکتے تھے! کہیں بھی سیر کے لئے۔شاپنگ اور فلم دیکھنے کے لئے۔وہ اتنا بھی نہیں کر سکے۔کیونکہ انہیں کسی کا خیال نہیں تھا۔ان کی اپنی دنیا تھی.....اوران کا پیار ایک دکھاوا۔'

سارہ جہانگیر کی آنکھیں محبت سے دیکھ رہی تھیں۔'تم کالج جاتے ہونا؟ کیا وہاں سے میرا تصور کرتے ہو؟ نہیں نا۔وہاں اپنے دوستوں کے ساتھ ہوتے ہو.....اور دوستوں کے درمیان میرے بارے میں کیوں سوچو گے؟ ہے نا پاشا میرے بیٹے۔لیکن میں سوچتی ہوں۔میں ایک تیسری آنکھ بھی رکھتی ہوں جو تمہیں دیکھتی رہتی ہے۔اور سنو پاشا، ایسا نہیں ہے کہ ہم ساتھ ساتھ کہیں نہیں گئے۔کئی بار گئے۔لیکن مجھے گھر میں اس کی موجودگی پسند تھی۔تمہیں یاد ہے نا، ایک خاموش کمرہ، جہاں وہ تنہائی میں اپنے لفظوں کو آواز دیا کرتا تھا، وہ ابھی بھی ہے اور میں اس کی موجودگی محسوس کرتی ہوں۔میرے لیے کہیں جانا ضروری نہیں تھا، میرے لیے اس شخصیت کی اہمیت تھی جو تمہارا باپ تھا۔ایسا نہیں کہ وہ تمہارے بارے میں سوچتا نہیں تھا۔وہ بہت کچھ سوچتا تھا۔مگر اس کے پاس آسائشیں نہیں تھیں۔اس نے کوشش بہت کی۔پھر اس نے بھی ایک تیسری آنکھ پیدا کر لی۔یہ آنکھیں ہر وقت تمہیں تلاش کرتی تھیں اور ان آنکھوں کو مرتے مرتے یہ صدمہ رہا کہ وہ تمہارے لیے کچھ کر نہیں پایا۔اس کے پاس کیا تھا؟ اچھی بھلی بری، جو دنیا بھی اس کے پاس تھی، وہ دنیا اس نے خود حاصل کی تھی۔تم اس لائق ہو کہ اپنی دنیا خود بنا سکو۔'

'آج کے حالات بدل چکے ہیں۔تم نہیں سمجھو گی ممی۔'

میں پاشا مرزا، میں جانتا ہوں کہ میری بات کا ممی پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔کیا یہ وہی دلّی ہے؟ کیا یہ وہی ہندوستان ہے؟ کیا یہ وہی نسل ہے؟ تبدیلی اور وقت نے نئے جوراسک پارک پیدا کر دیے۔دلّی کے بارے میں سنتا تھا کہ بار بار دلّی لوٹی گئی اور بار بار آباد ہوئی۔کیا یہ وقت ماضی کے جھروکوں میں جھانکنے کا ہے؟ قدیم ہندوستان کیا تھا اور آج کا ہندوستان کیا ہے۔آریہ ورت کتنے حصوں میں تقسیم ہوا۔؟ مغلوں نے کیسی حکومت کی اور مغلیہ سلطنت کو زوال کیوں آیا۔؟ دوسو برس تک فرنگیوں نے کیوں حکومت کی۔؟ نادر شاہ جیسے لوگ بار بار ہندوستان کس لیے آتے تھے۔؟ آزادی کے بعد ہندوستان بھی تبدیل ہوا اور دلّی بھی۔کیا دلّی کو صرف تاریخی عمارتوں سے جانا جا سکتا ہے؟ یہاں ایک ینگستان بھی ہے۔دلی کو کبھی بھی اس ینگستان سے وابستہ کر کے نہیں دیکھا گیا۔مجنوں کا ٹیلہ سے لے کر جمنا ندی تک بھاگتی ہوئی نسل، بسوں میں دھکے کھاتی ہوئی، تیز رفتاری سے موٹر سائیکل چلانے والی نسل، کالج اور اسکولوں میں جسم کے مختلف حصّوں پر ٹیٹو بنوانے والی نسل، اس نسل کو دیکھنے کی کب کوشش کی گئی۔؟ کیا ڈیڈ کے وقت جو حالات تھے، وہ اب بھی ہیں۔یہاں فضا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی موجودگی بڑھ گئی ہے اور ریمنڈ جیسے نوجوان بلیو وہیل کے پیچھے بھاگ رہے ہیں اور بھاگنے میں بریفومیٹ ان کی مدد کے لیے تیار رہتا ہے۔یہ نسل ڈرگس لیتی ہے۔خودکشی کرتی ہے۔ایک بڑا طبقہ ہے جس نے کارپوریٹ سوسائٹی میں اپنی جگہ بنا رکھی ہے۔ایک طبقہ ہے جو بے روزگار ہے۔دھکّے کھاتا ہے۔دلّی، جہاں ایک دو نہیں ہزار نربھیا موجود ہیں۔نوجوانوں کا ایک طبقہ اور بھی ہے، جو سیاست میں ساجھیدار ہے۔پستول رکھتا ہے۔گولیاں چلاتا ہے...اور آہستہ آہستہ اسے ہلاکت میں مزہ ملنے لگتا ہے۔اسی ینگستان میں کچھ نوجوان ریلیجس بس کو سیاست سے جوڑ کر پیسہ کماتے ہیں، عبادت گاہیں توڑتے ہیں اور مخصوص مذہب اور فرقہ کے لوگوں کو قتل کرتے ہیں۔کیا یہ وہی ہندوستان ہے؟ وہی دلّی ہے۔پرانی دلّی۔نئی دلّی، جامع مسجد، قطب مینار، لال قلعہ والی دلّی۔اب یہاں اکثر دھام بھی ہے۔ریپ کرنے والے ہیں اور سیکس سے دور رہنے والے بھی۔زندگی میں ورائٹی تلاش کرنے والوں کو موت بھی

اب ایک فنتاسی نظر آنے لگی ہے۔

کیا ایسا پہلے تھا۔اب بھی زیادہ تر ماں باپ نہیں جانتے کہ موت کے اندھے کھیل تماشے ہماری زندگی کا حصہ بن چکے ہیں....اور اسی ینگستان کا میں بھی ایک حصہ ہوں، پاشا مرزا....اور کبھی کبھی میں اچانک غائب ہو جاتا ہوں۔

اس رات ریمنڈ نے فون نہیں اٹھایا۔گریسی، پنیت، نشا، نیتی سب اس کے لیے فکر مند تھے۔نیتی کا فون آیا۔ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔مگر اچانک نیتی نے ایک ایسا سوال پوچھا کہ میں اپنی جگہ سے اچھل گیا۔

' تم فیلیر ہو یا راک؟'

' میں راک ہوں۔راک پاشا مرزا'

' راک کا مطلب سمجھتے ہو؟'

' ہاں۔کیوں۔'

' تم ایک مسلمان ہو۔' نیتی کی آواز بوجھل تھی۔ہماری کلاس میں سمیر بھی ہے نا....جانتے ہو آج اس کے بڑے بھائی کو شکار بنایا گیا۔ماب لنچنگ۔ہم ہندو اور مسلمان ہو گئے۔'

' کچھ لوگ ہو گئے۔' میں زور سے چلایا۔تم بھی راک ہو نیتی۔میں بھی راک ہوں۔باقی سب سیاست ہے۔یہ سیاست بھی ایک دن ختم ہو جائے گی۔ہماری جنریشن الگ ہے۔راک، کول، لٹ یہ سارے لفظ اب مفہوم کھو چکے ہیں۔ہم خود کو ڈسکور کرنے والے لوگ ہیں۔'

' یا بلیو وہیل کے پیچھے بھاگنے والے باسٹرڈ۔نیتی زور سے چلائی۔اسے روکو۔وہ مر جائے گا۔کچھ لوگ دھارمک ہنی مون منا رہے ہیں اور کچھ لوگ بلیو وہیل....تمہیں عجیب نہیں لگتا۔'

' لگتا ہے۔لیکن یہی تضاد ہماری جنریشن کا سچ ہے۔'

' سوسائیڈ کرنا۔موت کے الگ الگ ذائقہ کو پسند کرنا، کیا تم اسے زندگی کہتے ہو؟ ؟ سول سوسائٹی اور کارپوریٹ ورلڈ نے جب سے رات میں اپنی دنیائیں آباد کی ہیں، کچھ تماشے بڑھ گئے ہیں راک پاشا مرزا۔مجھے ڈپریشن ہو رہا ہے....اور مجھے کیوں۔ہماری پوری جنریشن ڈپریشن کا شکار ہو رہی ہے۔'

میں نے گندی سی گالی بکی۔' کیا رات اسی لیے ہے کہ تم اپنا اور میرا دماغ خراب کرو۔'

' کبھی کبھی کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔منچورین اور پزا ابر گر کھانے والی جنریشن اس وقت سب سے زیادہ کنفیوزڈ ہے۔اور اس میں تم بھی شامل ہو راک پاشا مرزا۔'

دوسری طرف سے فون کاٹ ڈالا گیا۔مجھے نیتی پر غصہ آ رہا تھا۔یہ کیا پاگل پن ہے یا ہم سب پاگل پن کی الگ الگ سیڑھیوں پر کھڑے ہیں۔لوگ منزل اور اپرچینیٹی بھول جاتے ہیں۔وقت کچھ لوگوں کو کمزور اور بے سہارا بنا دیتا ہے۔کیا کچھ سوکھے درخت ہمیشہ سوکھے رہتے ہوں گے؟ کیا آج جو بزرگ ہیں، وہ ہمیشہ بزرگ ہی رہے ہوں گے۔؟ آزاد ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اپنی حدیں مقرر کر لیں۔کچھ ہے جو تبدیل ہو رہا ہے۔درخت کٹ رہے ہیں۔پہاڑ کم ہوتے جا رہے ہیں۔موسم بدل رہے ہیں اور تہذیبیں پرانی

ہو کر ختم ہو رہی ہے۔ کبھی کبھی لگتا ہے، میں نے جو کچھ دیکھا ہے، وہ دوسروں نے نہیں دیکھا۔ زمین کی گردش، بم دھماکے، سیاست، چاند اور مریخ کی باتیں، ستارے اور سیّاروں کی باتیں، سائنس اور تکنالوجی کے درمیان انسانی جسم اور بیمایوں کی کہانیاں، ہم ان کہانیوں میں اس تتلی کو بھول گئے، کبھی جس کے پیچھے ریگستان کے معصوم لڑکے لڑکیاں بھاگتے تھے۔ ایک ہرنی جھاڑیوں سے نکلتی تھی اور غائب ہو جاتی تھی۔ کبھی کسی جنگل میں آزادانہ رقص کرتی ہوئی مورنی اس بات سے بے نیاز ہوتی تھی کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے....کوئی طاقت ہے، جس نے کبھی اس دنیا کو سجایا سنوارا تھا۔ اسی پُراسرار طاقت نے انسان کو سب سے طاقتور بنا کر زمین پر بھیجا تھا۔ پھر انسان اچانک اتنا کمزور کیسے ہو گیا۔

اس درمیان ریمنڈ سے ملے ہوئے پندرہ دن سے زیادہ ہو گئے تھے۔ وہ کالج بھی نہیں آ رہا تھا۔ ہمیں اس کی فکر ضرور تھی مگر سوال یہ بھی تھا کہ اس کو تلاش کریں بھی تو کہاں۔ وہ اپنے گھر کبھی نہیں بلاتا تھا اور ہم میں سے کوئی بھی اس کے گھر نہیں جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ ہم اس بات سے واقف تھے کہ اس کے ڈیڈ اور ریمنڈ کے درمیان اچھے تعلقات نہیں ہیں۔ پندرہ دن بعد اچانک ریمنڈ کا فون آ گیا۔ اس وقت میں لیپ ٹاپ پر الجھا ہوا تھا۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ فون اٹھاتے ہی پہلے اس نے جی بھر کر گالیاں دیں۔ پھر ہنستے ہوئے پوچھا۔

'اولڈ اسپائی، کبھی کبھی زندگی کو میری آنکھ سے بھی دیکھا کرو۔'

'سالے تو ہے کہاں۔ ہم سب کو ڈرا دیا۔'

'تیری دنیا میں ہوں۔ ڈرتے کیوں ہو سالو۔ ڈر کے کیا ہوگا۔' اس نے پھر گالیاں دیں اور پوچھا۔ اچھا سن، وہ تو نے ایک کتاب کے بارے میں بتایا تھا۔ دی اولڈ مین اینڈ دی سی۔'

'ہمارے کورس میں ہے سالے۔'

'ریمنڈ زور زور سے ہنسا۔ کالج اور کورس کی باتیں نہ کر۔ اچھا سن، اس کہانی میں کیا ہوا تھا؟ اولڈ مین جیت گیا تھا۔ یہی نا۔'

'ہاں۔'

میں بھی جیت جاؤں گا۔ اچھا سن سالے۔ کل ملتے ہیں۔ کسی اور کومت لانا....وہی، حویلی والی جگہ۔ بارہ بجے۔'

اس نے فون کاٹ دیا.....مجھے احساس ہوا، بلیو وہیل نے اچانک سمندر سے اچھال بھری ہو اور اپنا جبڑا کھول دیا ہو....

(۵)

سمندر میں ایک لہر تیزی سے اٹھی....دور تک جھاگ بنتے چلے گئے۔ پھر سمندر ٹھہر گیا۔ پُرسکون، جیسے کبھی کوئی ہلچل تھی ہی نہیں۔ سمندر،

ایک عظیم طاقت مگر ہیمنگوے کا بوڑھا آدمی اسی سمندر کو شکست دینے گیا تھا۔ انسان کی عظمت کو سلام کرنے والے ہیمنگ وے نے اپنی باپ کی پستول سے خودکشی کر لی۔ ہیمنگوے کے باپ نے بھی خودکشی کی تھی۔ دونوں کے درمیان فاصلہ رہا۔ جن شرطوں کے ساتھ ارنیسٹ ہیمنگوے زندگی گزارنا چاہتا تھا، اس میں کامیاب نہیں رہا۔ بوڑھا مچھیارہ سانتیا گو ایک بڑی مچھلی پکڑنے کے لیے چوراسی دنوں تک سمندر میں جاتا ہے اور بغیر مچھلی کا شکار کئے واپس آ جاتا ہے۔ چالیس دن تک بوڑھے مچھیارے کو ایک نوجوان کا ساتھ ملتا ہے جو بوڑھے مچھیارے سے مچھلی پکڑنے کا ہنر سیکھنا چاہتا ہے۔ مسلسل شکست کے باوجود بوڑھا اپنا حوصلہ نہیں کھوتا۔ وہ اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ انسان کو تقدیر سے زیادہ خود پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ 85 ویں دن ایک کرشمہ ہوتا ہے۔ ایک بہت بڑی مچھلی کانٹے میں پھنس جاتی ہے۔ لیکن بوڑھا بنسی کی ڈور نہیں کھینچ پاتا۔ مچھلی سمندر میں تیرتی رہی۔ بوڑھے مچھیارے کو یقین تھا کہ مچھلی جلد ہی تھک جائے گی۔ پھر جنگ شروع ہوتی ہے اور بوڑھا مچھیارہ شارک مچھلی پر فتح پالیتا ہے۔

ریمنڈ کی کہانی اس بوڑھے مچھیارے سے ملتی جلتی کہانی تھی۔ میں ٹھیک بارہ بجے پہنچ گیا۔ اس وقت تک ریمنڈ نہیں پہنچا تھا۔ پرانا ٹوٹا پھوٹا کھنڈر سامنے تھا۔ میں درخت کے سائے میں کھڑا ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ کھنڈر کم از کم 200 سال پرانا ہوگا۔ دلّی میں ایسے کھنڈرات کی ابھی بھی کمی نہیں۔ لوگوں نے بے وجہ پرانی حویلیوں اور کھنڈرات کو بھوت پریت جنات سے منسوب کر رکھا ہے۔ ریمنڈ نے یہ جگہ کھوج کر نکالی تھی۔ یہاں دور تک درختوں کی قطار تھی۔ ممکن ہے جب یہ کھنڈر اپنی اصل حالت میں رہا ہو، اس وقت اس کے اطراف میں آبادی بھی ہوا کرتی ہو۔ موت نے ایک بار پھر خیالوں کو منجمد کر دیا تھا۔ کبھی یہاں زندہ لوگ ہوا کرتے ہوں گے اور اب ایک عالیشان عمارت کھنڈرات میں تبدیل ہے۔ یہ لوگ کہاں چلے جاتے ہیں؟ ایک دن یہ کھنڈر بھی گم ہو جائے گا۔ میں نے دور سے ریمنڈ کو آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس نے اپنی موٹر سائیکل ڈھلوان سڑک کے کنارے کھڑی کی اور تیز تیز چلتا ہوا قریب آ گیا۔ اس نے جینس پہن رکھی تھی۔ ٹی شرٹ پر ٹرینگل بنا ہوا تھا۔

میں مسکرایا۔ 'اس ٹرینگل میں آنکھیں ہوتیں تو پورے ایلومناتی لگتے۔'

' آنکھیں ہیں سالے۔ بس تجھے نظر نہیں آ رہیں۔ ٹھیک سے دیکھ۔' اس نے قہقہہ لگایا۔

' تیس دن پورے ہوئے یا بوڑھے مچھیارے کی طرح چوراسی دن لگیں گے۔'

' تو بھی نا۔ ابھی صرف آٹھ دن ہوئے ہیں۔ قیامت کے آٹھ دن۔ وہ ہنس رہا تھا۔ چل وہاں بیٹھتے ہیں۔'

مئی کا مہینہ۔ باہر آگ برس رہی تھی۔ شدید گرمی کے باوجود ریمنڈ کی موجودگی نے تپش اور حدت کے احساس کو دور کر دیا تھا۔ میں بس یہ سننے کے لیے بے تاب تھا کہ وہ اتنے دن کیا کرتا رہا۔ کہاں رہا؟ درختوں کی قطار کے باوجود ہوا غائب تھی۔ پتوں کے درمیان نہ کوئی سرگوشی نہ ہلچل۔ دور سے دیکھنے پر درخت کے سائے میں ڈھلوان پر بیٹھے ہم دو لوگوں کو پاگل ہی کہا جا سکتا تھا۔ اس وقت ہم پاگل تھے۔ پتوں کی قطار کے درمیان سورج کہیں چھپ گیا تھا۔ پرانے کھنڈر کو دن میں دیکھنا اچھا لگ رہا تھا۔ کبھی یہ عمارت پرکشش اور عالیشان بھی رہی ہوگی۔ مگر اب ملبے میں تبدیل ہو چکی ہے۔ دروازے سڑ گل گئے۔ دیواریں خستہ ہو گئیں۔ محرابیں جھڑ گئیں۔ اور ریمنڈ پندرہ دن بعد ایک فنتاسی کہانی سے باہر نکلا ہے۔.....کافی دیر تک ہم دونوں میں سے کوئی نہیں بولا۔ خاموشی حاوی رہی۔ پھر ریمنڈ نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ میرے کندھے تھپتھپائے۔

' پیارے اولڈ اسپائی، ایک بات کہوں، موبائل، کمپیوٹر، لیپ ٹاپ سے کبھی ہسٹری (تاریخ) یا پرانے ڈاٹا ز کو تم نے ڈیلیٹ کیا ہے

؟ ڈیلیٹ کرنے کے باجود یہ ہسٹری کہیں نہ کہیں رہ جاتی ہے۔ہم سمجھتے ہیں پرانی ہسٹری کوڈیلیٹ کرنے میں ہم کامیاب ہوگئے۔مگرکوئی کمپیوٹر کا ماہر، کوئی انجینئر، کوئی ہیکر ہمارے پرانے ڈاٹاز اور ہسٹری کی کھوج آسانی سے کرلیتا ہے۔ ہسٹری نہیں مرتی۔ ڈاٹا نہیں گم ہوتے.....ہم صرف ایک غلط فہمی میں ہوتے ہیں کہ ہمارا موبائل کلین ہوگیا۔مگر ایسا نہیں ہوتا۔سامنے کھنڈر دیکھو۔عمارت مرگئی۔ہسٹری زندہ ہے۔ڈاٹا زندہ ہے۔ دیکھنے والی آنکھیں اس میں عالیشان عمارت کی ہسٹری کوکھوج نکالتی ہیں۔'

ریمنڈ مسکرایا، ایک دن سوچتے سوچتے خیال آیا۔ سالے ہماری ہسٹری ہے کیا؟ کچھ رومانٹک اور سیکس چیٹنگ، کچھ گندے پیغامات، کچھ پورن سائٹ، کچھ اسپورٹس کے میدان۔ ایک دن کرشمہ ہوگیا پیارے۔ ایک سائٹ کھل گئی۔ دیر تک چیک کرتا رہا تو احساس ہوا، میرا کوئی بھی ڈاٹا ڈیلیٹ نہیں ہوا تھا، سب ایک خفیہ سائٹ میں موجود تھے۔' ریمنڈ نے قہقہہ لگایا۔میرا باپ بھی ایک ڈاٹا اور ایک ہسٹری ہے۔سالہ مرنے کے بعد بھی رہے گا اور میں بھی رہوں گا۔ زندگی میں بھی میرے باپ کے پاس میرا یہی ڈاٹا اور ہسٹری ہوگی کہ میں ایک بُرا بیٹا تھا، میں نے اس پر ہاتھ اٹھایا تھا۔مرنے کے بعد بھی اس ہسٹری کو وہ ڈیلیٹ نہیں کر پائے گا۔ پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟ ایک زندگی جو میری ہے۔ جو میرے لیے بھی کسی کام کی نہیں۔کسی اور کے کیا کام آئے گی۔ دوست، جو مرنے کے بعد دو آنسو نہیں بہا پائیں گے۔ باپ جو مرنے کے بعد خوش ہوگا۔ہمسائے جو میرے کسی کام کے نہیں اور میں کبھی کسی کے کام کا نہیں رہا۔

پھر کیا کروں؟ میں نے بہت سوچا ہے۔اولڈ اسپائی۔ اچھے برے، غلط، جائز ناجائز طریقوں سے پیسے کماؤں۔ کچھ نہ سہی تو بلڈر بن جاؤں۔ پڑھائی تو کسی کام آئے گی نہیں۔ جتنا پڑھنا تھا پڑھ چکا۔ ویسے بھی ملک میں نوکری کہاں ہے۔ کروڑوں نوجوان روزگار کی تلاش میں بھٹک رہے ہیں۔ایک سو چالیس کروڑ آبادی والے ملک میں ہم جیسے نوجوانوں کی تقدیر میں یا تو بھٹکنا لکھا ہے یا پھر ڈپریشن۔ ایک نہ ختم ہونے والا ڈپریشن جو ایک دن موت کے راستے پر لے جاتا ہے۔اگر موت ہی حقیقت ہے تو، کیوں نہ کوئی بڑا چیلنج قبول کیا جائے۔کیوں میرے اولڈ اسپائی۔'

ریمنڈ کی آنکھیں پتوں کے درمیان بھٹک رہی تھیں۔'ایک آدمی کے نہیں ہونے سے کسی کو کیا فرق پڑے گا۔اور بتاؤ کون ہیں ہم سب؟ کیا ہے مذہب؟ جب سے دنیا بنی، انسانوں نے اپنے اپنے حساب سے اوتار، خدا اور بھگوان تلاش کر لیے۔ پھر ان کے نام پر جھگڑے ہونے لگے۔ہزاروں لاکھوں حصوں میں انسان تقسیم ہوگیا۔امریکہ کا مذہب الگ۔ ہندوستان کا الگ۔سب کی سوچ اور فکر الگ....بڑے بڑے خواب، اونچی اونچی عمارتیں اور زندگی کی تمام حقیقتوں پر ایک دن ایک چیز غالب آجاتی ہے، موت۔کوئی پیدا ہوتے ہی مرگیا۔کوئی دو برس میں مرگیا۔کوئی پچاس برس میں اور کوئی نوے برس کی عمر میں۔مگر مرنا سب کو ہے۔ پرائم منسٹر ہو یا پریزیڈنٹ، ایلیٹ کلاس کا ہو یا نچلے طبقہ کا، مرنا سب کو ہے۔مرسڈیز چلاؤ یا اسکوٹر یا موٹر سائیکل، موت سب کے لیے ایک جیسی ہے۔اور زندگی کے اس کارخانے میں ہم ہیں کیا؟ ہم سے بہتر سمندر ہے، آندھیاں ہیں، طوفان ہے، شارک ہے اور وہیل مچھلی۔ہم سے زیادہ طاقتور—— اور سالے ہم....'

ریمنڈ نے اس بار زور کا قہقہہ لگایا۔'دراصل ایک زندگی میں ہم Existance of the others کے ساتھ چلتے ہیں۔یہ دوسرا ہمارا باپ بھی ہوسکتا ہے، ہمارا باس بھی۔ جب آپ چاروں طرف سے مارے جارہے ہوں، جب آپ چاروں طرف سے شکنجے میں ہوں تو آپ کو اپنی Existance پر بھروسہ کرنا ہوگا۔'

'Existance of the others ' میں ایک دم سے چوکا۔ یہ دوسرا کسی نہ کسی صورت میں تو ہمارے ساتھ ہوگا؟ باپ کی شکل میں، ماں کی شکل میں بیوی اور بچوں کی شکل میں.....؟'

’کیا ضرورت ہے؟ کیا تم اسے بزدلی کہو گے جب ایک شخص، ہیومن بم بن کر آتا ہے اور دھماکے میں خود بھی اڑ جاتا ہے۔ یہ اس کا پاور ہے۔ جب ایک ہوائی جہاز امریکی ٹاور کو ہلا دیتا ہے۔ مجھے ایسے لوگ شارک لگتے ہیں۔ بلیو وہیل۔‘

ریمنڈ ہنس رہا تھا۔ اس وقت وہ مجھے قدیم داستانوں کا کوئی ہیرو نظر آ رہا تھا۔ میں نے ایسی کچھ تصویریں یونانی دیوتاؤں کی دیکھی تھیں۔ میں نے غور سے دیکھا۔ اس کی ٹی شرٹ کا ٹرینگل اب کچھ زیادہ ابھر کر میرے سامنے آ گیا تھا اور مجھے اس میں بریفومیٹ کی آنکھیں صاف صاف نظر آ رہی تھیں۔

’گریسی کا بدن شاندار ہے۔ وہ دل کی اچھی ہے۔ مگر اب میں نئی مہم پر نکل چکا ہوں۔ اس مہم پر نہ نکلا ہوتا تو گریسی کے بارے میں ضرور سوچتا۔‘

’اس کے کیا معنی ہیں۔ کیا گریسی سے....؟‘

’لو ہے‘ ریمنڈ زور سے ہنسا۔ لو، پیار محبت سب دھوکہ ہے۔ تم کیا سمجھنے لگے، میں اس سے شادی کرتا۔ ارے نہیں۔ میں نے اس کے اندر کے تمام رس کو نچوڑ لیا۔ وہ ایک حیرت انگیز دودھ کی نہر ہے۔ ایسی نہر میں نے پہلی بار دیکھی۔ اس نئی مہم پر نہیں نکلتا تو اس کے جسم کی لہروں میں ہزار ڈبکیاں ضرور لگاتا۔ خیر....

ریمنڈ ہنس رہا تھا۔’ کچھ باتیں اور بھی ہیں میرے اولڈ اسپائی۔ میں نے بہت سوچا زندگی کے بارے میں۔ نیچر کے بارے میں۔ دراصل زندگی میں ہر بار کچھ نہ کچھ غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ ایک بے قاعدگی ہے کہ ہم سراب کے پیچھے ساری عمر بھاگتے چلے جاتے ہیں۔ ہم اپنی مثالوں تک محدود ہوتے ہیں جس کا ہمیں علم ہوتا ہے اور جن کا ہمیں علم نہیں ہوتا، غور کرو تو وہ زیادہ حیرت انگیز ہو سکتے ہیں۔ جیسے وہیل کا انسانی آواز نکالنا، جیسے ہم یہاں درختوں کے جھنڈ کے درمیان ہیں۔ الگ الگ مسافر اور مصور کی نظر سے اس کے رُخ لامحدود ہوں گے۔ اور حقیقی شکل پھر بھی واضح نہیں ہوگی۔ ہم صرف یہ سمجھتے ہیں کہ ایک عالیشان عمارت کھنڈر میں تبدیل ہوگئی۔ کل ممکن ہے یہاں دوسری عمارت بن جائے یا فلائی اوور کا جال بچھ جائے۔ ایک انفرادی تصور ہر بار موجود ہوتا ہے۔ جبکہ زندگی کو دیکھنے کے لیے ہماری آنکھیں محدود ہوتی ہیں۔ ہم بہت بہت ایک دو یا زیادہ سے زیادہ تین چار زاویوں پر غور کرتے ہیں اور زندگی کو موت تک لے جاتے ہیں۔ موت۔ پھر موت کا خیال آ گیا نا....؟‘

ریمنڈ زور سے ہنسا۔’اور ہاں سنو میرے اولڈ اسپائی۔ میں نے گیم انسٹال کر لیا۔ چار پانچ دن لگے مجھے سوچنے میں۔ بہت سے خیالات آئے۔ ماضی بہت یاد آیا۔ لیکن میں نے ہر خیال کے نقش کو مٹا دیا۔ تمہارا اولڈ مین بھی تو جیتا تھا۔ انسانی برادری میں ایک آدمی کم ہوا تو ایک اس سے بہتر آدمی آ بھی سکتا ہے اور اس سے بدتر آدمی بھی۔ جب ساری زندگی سراب کے پیچھے ہی بھاگنا ہے تو کیوں نہ چیلنج قبول کیا جائے۔ اور میں نے چیلنج قبول کر لیا۔‘

ریمنڈ نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ ہوا ساکت تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ وقت کی سوئیاں چلتے چلتے ٹھہر گئی ہوں۔ درخت چپ چاپ کھڑے تھے۔ پتوں کا ہلنا بند تھا۔ سورج ابھی بھی درختوں کے درمیان چھپا ہوا تھا۔ گرمی کی شدت کا ہم دونوں میں سے کسی کو ذرا بھی احساس نہیں تھا۔ ریمنڈ کا چہرہ ایک خاموش مجسمے کا چہرہ لگ رہا تھا۔ مجسمے یوں بھی خاموش رہتے ہیں۔ مگر اس وقت پرانے کھنڈر میں مجھے کچھ ہلچل نظر آئی۔ یہ میرا وہم بھی ہو سکتا ہے۔ ریمنڈ جب اپنی کہانی سنا رہا تھا۔ میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ ڈائری، ڈیڈ، ممی اور یہ کہ میں کیا لکھنے جا رہا تھا اور اب ریمنڈ کیسی کہانی لے کر بیٹھ گیا ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ زندگی میں اچانک کوئی کہانی شروع ہو جاتی ہے۔ زندگی کسی افسانے یا ناول کی طرح سیدھا سپاٹ بیانیہ نہیں ہے۔ سیانتا گو کا بوڑھا آدمی اس وقت میری نظروں کے سامنے تھا۔ ایک بڑی

مچھلی اس کی بنسی میں پھنس چکی تھی اور اسے تقدیر سے کہیں زیادہ بہتر وقت کا انتظار تھا کہ وہ اس مچھلی کو سمندر سے ساحل پر لا سکے۔ میں نے سوچ لیا تھا، آئندہ صفحات کے لیے کچھ دیر کے لیے مجھے ریمنڈ بننا ہوگا۔ کیا بریفومیٹ کی روح میں داخل ہونا آسان ہے؟ لیکن ریمنڈ کی روح میں داخل ہونا مشکل نہیں۔ ریمنڈ کے کردار میں داخل ہونے تک، میں نے دو دنوں تک کاغذ اور قلم کو ہاتھ نہیں لگایا۔ میں اس کہانی میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا جو ریمنڈ نے مجھے سنائی تھی۔ پراسرار اور خطرناک۔ مگر ہماری یہ دنیا کسی بھی کہانی سے زیادہ خوفناک اور پراسرار ہے۔ مجھے اس کا اندازہ تھا۔

(۶)

ریمنڈ کی زندگی کا ایک ہفتہ

بوڑھے سیانتا گو کو سمندر سے مچھلی پکڑنے میں چوراسی دن لگ گئے تھے۔ ریمنڈ کو بلیو وہیل تک آنے میں بیس برس اور پانچ مہینے لگے۔ ان بیس برس اور پانچ مہینوں میں چھ دن اس کے لیے فیصلہ کن ثابت ہوئے۔

ریمنڈ کی ماں ایک مذہبی عورت تھی۔ لیکن وہ بھی اپنے بیٹے سے خائف رہتی تھی۔ ریمنڈ کا خیال تھا اس عمر میں عام طور پر عورتیں کئی وجوہات کی بنا پر مذہب کو اپنی مجبوری بنا لیتی ہیں۔ ریمنڈ کا اصل نام اشونی سہائے تھا۔ مگر یہ نام اس کو ذرا بھی پسند نہیں تھا۔ اس لیے اسکول ہو یا کالج، اس نے خود کا تعارف ریمنڈ کی حیثیت سے ہی کرایا۔ بقول ریمنڈ، اس نام سے ایسا لگتا ہے جیسے بہت سے ڈائمنڈ میرے ہاتھ لگ گئے ہوں۔ ڈائمنڈ تو ریمنڈ کے ہاتھ نہیں لگے لیکن جس زندگی کے راستے پر وہ چل رہا تھا، وہاں کنکر پتھر بھرے پڑے تھے۔ ریمنڈ کی ماں کا نام انیتا تھا، باپ کا نام رگھوبیر سہائے۔ رگھوبیر ایک سخت گیر آدمی تھا۔ وہ ایک بلڈر تھا۔ اور اس پیشے میں اس نے بہت پیسے بنائے۔ حکومت بدلی تو بڑے بڑے بلڈرس زمین پر آ گئے۔ بہت سے بلڈرس اپنے پیشے کو خیر باد کہہ کر دوسرے پیشوں میں آ گئے۔ رگھوبیر پریشان رہنے لگا تھا۔ بیوی انیتا سے کوئی زیادہ لگاؤ نہیں تھا۔ وہ اوباش قسم کا آدمی بھی نہیں تھا مگر اس کے لیے سب کچھ پیسہ تھا۔ پیسہ کمانے کے لیے وہ نئی نئی جگت اور ترکیبیں سوچتا رہتا تھا۔ اس لیے ریمنڈ کے لیے کبھی اس کے پاس اتنا وقت نہیں رہا۔ اس کا ماننا تھا کہ ایک دن بچے خود اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب ریمنڈ اور رگھوبیر کے درمیان بول چال کے رشتے بھی ختم ہو گئے۔ ماں انیتا سے بھی ریمنڈ کی گفتگو کم ہوتی تھی۔ مثال کے لئے، کھانا لے آؤں۔ فریج میں کھانا ہے۔ گرم کر کے کھا لینا۔ میں مندر جا رہی ہوں۔ یا ریمنڈ کہتا، دروازہ بند کر لو، مجھے گھر آنے میں دیر ہو جائے گی۔

ریمنڈ سوچتا تھا، کیا ہمیشہ سے ماں ایسی ہے۔ ماں ہمیشہ اسے گھٹن کا شکار نظر آئی۔ رگھوبیر سہائے اکثر انیتا پر اپنا غصہ نکالتا تھا۔ یہ ریمنڈ کو پسند نہیں تھا، مگر ماں باپ کے درمیان اس کی حیثیت کسی بے جان ہنڈولہ کی تھی جو جھول تو رہا تھا مگر جس کی ضرورت گھر والوں کو نہیں تھی۔ دھرم، مندر، پوجا پاٹھ، آہستہ آہستہ وہ سب سے بے نیاز ہوتا چلا گیا۔ بچپن سے تہی دست تھا۔ کالج میں داخلہ ملنے کے بعد بھی اس کے پاس اڑان اور کیریر کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اس لیے آہستہ آہستہ وہ ایلومناتی فرقہ کے قریب ہو گیا۔ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ جارج بش، براک اوباما ان سب کی کامیابی کے پیچھے بھی ایلومناتی فرقہ کا ہاتھ رہا ہے۔ زندگی میں پاور چاہیے تو شیطان کا پجاری بننا ہوگا۔

رگھوبیر ریمنڈ کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس دن رگھوبیر کی ایک ڈیل کینسل ہوئی تھی۔ وہ غصہ میں تھا۔ انیتا کا بنایا کھانا بھی بے مزہ تھا۔ وہ غصے میں بغیر کھائے اٹھ کھڑا ہوا۔ انیتا سر جھکائے کھڑی تھی۔ رگھوبیر لگاتار اس پر برس رہا تھا۔ دروازے کی گھنٹی بجی تو انیتا نے دروازہ کھولا۔ ریمنڈ تھا۔ ریمنڈ نے باہر دروازے سے باپ کی باتیں سن لی تھیں۔ اس نے باپ کو کھری کھری سنانے کا فیصلہ کیا۔ رگھوبیر انیتا سے لڑنے کے بعد ریمنڈ کی طرف متوجہ ہوا۔ بات اتنی بڑھ گئی کہ ہوش وحواس بھول کر ریمنڈ نے باپ پر ہاتھ اٹھا دیا۔ رگھوبیر کو اس بات کی قطعی امید نہیں تھی۔ وہ زور سے چلایا۔ گھر سے نکل جانے کے لیے کہا۔ ریمنڈ کے لیے یہ ہوش گم کر دینے والا لمحہ تھا۔ وہ ابھی تک اپنے غصے پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔ انیتا خاموشی سے یہ ہنگامہ دیکھ رہی تھی۔ ریمنڈ نے پیار سے سمجھایا۔ کنٹرول یور سیلف۔ یہ گھر میرا بھی ہے۔ اور آپ بوڑھے ہو چکے ہیں۔ شمشان پہنچانے کے لیے بھی آپ کو میری ضرورت ہوگی۔ اس کے بعد ریمنڈ ٹھہرا

نہیں۔اپنے کمرے میں چلا گیا اور کمرہ لاک کر دیا۔دیر تک باہر گیلری سے باپ کے چیخنے کی آواز آتی رہی۔لیکن ریمنڈ کو یقین تھا،اسے گھر سے نکالنے کے لیے باپ کوئی بھی راستہ اختیار کر سکتے ہیں۔اسے پیسہ دینا بند کر سکتے ہیں۔اس رات ریمنڈ نے اپنے کمرے کی کھڑکی کھولی تو ہاتھ پر بنا ہوا ٹیٹو،اچھل کر اس کے سامنے آ گیا۔عورت کا جسم اور بکرے کے چہرے والا ہیولہ اس کے سامنے تھا۔

وہ باہر دیکھو.....

’ رات چاندنی اور سائے.....‘

’ نہیں مرغابیاں۔‘

’ مرغابیاں؟‘ ریمنڈ کے چہرے پر ہنسی لوٹ آئی۔

’ ہاں۔وہاں جزیرے کے قریب۔‘

’ لیکن یہاں تو کوئی جزیرہ نہیں۔‘

’ یہی نا۔تم لوگوں کی غلطی یہی ہے کہ تم تصور کرنے سے بھی گھبراتے ہو۔تصور کرو۔پہاڑ،ندی،نالے،جھرنے...دور تک پھیلا ہوا جنگل،آبشار۔کسی سمندری علاقے میں تمہارا ریزارٹ۔یعنی ایک ایسی جگہ جہاں تمہارا باپ نہ ہو۔‘

’ مرغابیاں۔‘ ریمنڈ ہنسا...مجھے مرغابیاں نظر آ رہی ہیں۔

’ اب سامنے والی ایک مرغابی کو ختم کر دو۔‘

ریمنڈ اچانک چونکا۔یہ کیسا خیال ہے۔وہ کشمکش میں تھا۔اس نے غور سے ہاتھ پر بنے ٹیٹو کو دیکھا۔ٹیٹو میں اسے ہلچل محسوس ہوئی۔باہر نیلے آسماں پر چاند روشن تھا۔دور تک مکانوں کی قطار۔رات کے گھنے سائے کے درمیان پھیلی ہوئی چاند کی روشنی اسے اچھی لگ رہی تھی۔سامنے والی ایک مرغابی کو ختم کر دو۔بس یہیں سے ریمنڈ نے سوچنا شروع کیا۔اب بلیو وہیل اس کے سامنے تھی۔کاش،وہ انسانوں کی طرح اس سے باتیں کر سکتا۔ریمنڈ کا خیال تھا، Existance of the others کے بھنور سے اسے باہر نکلنا ہوگا۔وہ گھر کے لیے ایک بیکار کل پرزہ ہے۔مستقبل نام سے وحشت ہوتی ہے۔لیکن کہیں کوئی زندگی کی رمق محسوس نہیں ہوتی۔کالج جانے میں اس کا دل نہیں لگتا۔پڑھنے کے نام سے اسے وحشت ہو جاتی ہے۔یہ زندگی کم موت زیادہ ہے۔پھر ایک چیلنج قبول کرنے میں خطرہ کس بات کا ہے۔

ریمنڈ کو نیند آ رہی تھی۔پھر وہ بستر پر لیٹ گیا۔دیر تک گھوڑے بیچ کر سوتا رہا۔صبح اٹھنے کے بعد اس نے ماں کو اپنا فیصلہ سنا دیا۔

’ وہ کالج نہیں جائے گا۔وہ باہر بھی نہیں جائے گا۔وہ ایک ضروری کام کر رہا ہے۔اور اس کام میں مہینوں لگ سکتے ہیں۔اس درمیان وہ گھر میں رہے گا اور کوئی اسے پریشان نہ کرے۔‘

اس نے باپ سے رات کے حادثے کے لیے معافی مانگی۔مگر رگھو بیر سہائے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ریمنڈ جانتا تھا،باپ کی ناراضی دور نہیں ہوگی۔ناشتہ کے بعد وہ اپنے کمرے میں آ گیا۔وہ دیر تک ایلومناتیوں کے بارے میں لیپ ٹاپ پر ویڈیو دیکھتا رہا۔بند کمرے میں کئی طرح کے خیالات اس پر شب خون مار رہے تھے۔یہ خیالات دو حصوں میں منقسم تھے۔اس کی زندگی اطمینان اور سکون کی نہیں ہے۔اس کی زندگی میں محبت نہیں ہے۔اس کی زندگی میں ضد اور انقلاب نہیں ہے۔ماضی سے اس کا کوئی رشتہ نہیں رہا ہے۔بے

گھری اور آزمائشوں کے درمیان اسے اپنے لیے راستہ پیدا کرنا ہے لیکن امید کے دروازے کی طرف کوئی راستہ نہیں جاتا۔ ماضی کے بارے میں وہ زیادہ نہیں جانتا۔ مستقبل کے بارے میں ناامید۔ ایک ٹرین تھی جو تیز رفتاری سے اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ ان دیکھے خداؤں میں اسے کبھی یقین نہیں رہا۔ ریمنڈ دیر تک اپنے دونوں ہاتھوں کو رگڑتا رہا۔ اس وقت تک جب تک اس کی ہتھیلیاں گرم نہیں ہو گئیں۔ وہ انتہا پسندی کے ذریعہ اپنی زندگی میں ہلچل پیدا کرنا چاہتا تھا۔ ایک فنتاسی تھی، جس کو کھیلنا چاہتا تھا۔

پہلا دن گزر گیا۔ لیکن کھیل کا سامنا کرنے کے لیے وہ خود کو تیار نہیں کر سکا۔ اس رات وہ دیر تک ہٹلر، مسولینی، چنگیز خاں اور ہلاکو پر بنی فلمیں دیکھتا رہا۔ ریمنڈ کو یقین تھا، اس کے پاس ابھی وقت ہے۔ کوئی جلدی بازی نہیں ہے۔ اس درمیان کئی دوستوں کے فون آئے۔ لیکن ریمنڈ نے فون سائلنٹ پر رکھا تھا۔ کبھی کبھی موبائل اٹھا کر دیکھ لیتا۔ اسے کسی سے کوئی بات نہیں کرنی تھی۔ اسے کھیل تک پہنچنا تھا... اور وہ جانتا تھا، یہ کھیل آسان نہیں۔ اس کھیل میں جس نے بھی ہاتھ ڈالا موت اسے اپنے ساتھ لے گئی۔ موت کیا ہے؟ ایک خوبصورت فنتاسی۔ موت کے بعد کوئی زندگی ہے یا نہیں۔ موت کے بعد کیا سب کچھ نظر آنا بند ہو جائے گا۔ مثال کے لیے وہ کھڑکی کھولتا ہے۔ سامنے چاند ہے۔ نیلا آسمان ہے۔ پرچھائیاں ہیں۔ رات کی چادر اوڑھے ہوئے عمارتیں ہیں، سڑک ہے۔ وہ اپنے کمرے میں دیکھ سکتا ہے، ایک بکھرا ہوا کمرہ، ایک میز، ایک کرسی، میز پر رکھا ہوا لیپ ٹاپ.... وہ کالج جاتا ہے تو موت کے خیال سے بے نیاز ادھر ادھر گھومتے نوجوان لڑکے لڑکیاں، ماڈرن لباس میں۔ پھر گریسی ہے، نشا ہے، نیتی ہے۔ آنکھیں بند اور تمام مناظر سے رشتہ منقطع۔ یا موت کے بعد کوئی زندگی ہے؟ پہلے جسم ٹھنڈا ہوتا ہے۔ پھر دماغ کام کرنا بند کرتا ہے۔ ایک چلتا پھرتا جسم بے جان ہو جاتا ہے۔ بے حس و حرکت۔ کچھ دیر کے لیے اس مردے کو زندہ کر دیجیے تو اس کے پاس ایک ماضی ہوتا ہے۔ واقعات و حادثات کی لمبی فہرست ہوتی ہے۔ دوست یار ہوتے ہیں۔ میلے ٹھیلے ہوتے ہیں۔ پرب، تہوار، ہنسنا ہنسانا۔ جسم مردہ ہوا اور وقت ٹھہر گیا۔ پھر آہستہ آہستہ رشتہ دار بھی اسے ذہن کے کسی گوشے میں رکھ کر بھول جائیں گے۔ کیا مرنا آسان ہوتا ہے۔ جیسا کہ آئے دن وہ خبروں میں خودکشی کی خبریں پڑھتا رہتا ہے۔

ریمنڈ کو فکر اس بات کی تھی کہ وہ یہ سب کیوں سوچ رہا ہے۔ کیا وہ اس کھیل سے خوفزدہ ہے۔ کیا وہ موت سے خوفزدہ ہے۔ کیا اس زندگی کو جو اسے حاصل ہے، وہ کوئی نام دے سکتا ہے۔؟ کیا اس کی زندگی میں خوشیوں کی کوئی ساعت ہے، یا صرف فرار ہے۔

تیسرا دن

تیسرے دن ریمنڈ نے ایک تجربہ کیا۔ اس تجربے کے لیے بھی خاص طور پر اس نے خود کو تیار کیا تھا۔ وہ کچھ دیر کے لیے باہر نکلا۔ اور اس نے خودکشی کے لیے مضبوط رسی اور کیلوں کا انتظام کیا۔ اس کے بعد وہ گھر آ گیا۔ دروازہ انیتا نے کھولا۔ ریمنڈ کچھ بولا نہیں۔ خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گیا۔ کچھ دیر تک بستر پر آرام کیا۔ ذہن و دماغ پر کھیل کی تیاریاں چل رہی تھیں۔ اسے ہینری کی یاد آئی۔ اسکول کے آخری دنوں میں ہینری کا ساتھ ملا تھا۔ اس کا باپ بڑا آفیسر تھا۔ کوارٹر ملا ہوا تھا۔ اس کے گھر سے ہینری کے کوارٹر پہنچنے میں زیادہ زیادہ پندرہ منٹ لگتے تھے۔ کوارٹر کے ایک طرف چرچ تھا۔ دوسری طرف بھورے رنگ کی لکڑی کے گودام بنے ہوئے تھے۔ دو ایک بار وہ ہینری کے گھر بھی گیا تھا۔ خاص کر اس کے برتھ ڈے کے موقع پر۔ گودام سے ذرا ہٹ کر ایک کنواں تھا۔ کنواں سوکھ چکا تھا۔ پاس میں ایک پارک تھا، جہاں درخت کے سوکھے پتے گرے ہوتے تھے اور انہیں کوئی صاف کرنے والا نہیں ہوتا تھا۔

ریمنڈ اپنی خواب گاہ سے نکلا۔ موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور ہینری کے گھر کے پاس بیس منٹ میں پہنچ گیا۔ اس نے لزی کے گھر کو اداسی بھری نظروں سے دیکھا۔ ہینری اب اس گھر میں نہیں تھی۔ کوارٹر میں کوئی اور آ چکا تھا۔ ہینری کے ڈیڈ کی کہیں اور پوسٹنگ ہو گئی تھی۔ اس نے ہیزی سے بھی رشتہ قائم کیا تھا اور پھر ہینری کے جانے کے بعد اسے بھول گیا۔ پھر کبھی اس طرف آنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ کنویں کے قریب گیا۔ اندر جھانکا۔ کنویں گہرا تھا۔ مگر سوکھ چکا تھا۔ ریمنڈ نے ادھر ادھر دیکھا کہ کہیں کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ آس پاس کے گھروں کی کھڑکیاں بند تھیں۔ چار بج رہے تھے۔ دھوپ میں شدت تھی۔ پارک ابھی بھی سوکھے پتوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ پھر کنویں کو دیر تک دیکھتا رہا۔ ریمنڈ کے ذہن میں ایک ہی خیال رقص کر رہا تھا۔ کیا وہ کنویں میں چھلانگ لگا سکتا ہے۔؟ ادھر ادھر دیکھ کر وہ کنویں کی اوپری سطح پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ ہزاروں بارش اور طوفان سہنے کے باوجود کنویں کی دیواریں سخت تھیں۔ ریمنڈ نے قہقہہ لگایا۔ اسے یقین تھا، وہ ایسا کر سکتا ہے۔ اور یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ اگر وہ یہ فیصلہ کرے کہ اسے زندگی ہر قیمت پر ختم کرنی ہے تو کنویں میں چھلانگ لگانے کے لیے اسے ایک سیکنڈ بھی سوچنا نہیں پڑے گا۔ اسی لمحہ اس کا داہنا پاؤں ذرا سا لڑکھڑایا۔ ریمنڈ نے خود کو سنبھالا۔ جسم میں توازن قائم کیا۔ اس کے چہرے پر اب بھی مسکراہٹ تھی۔ کنویں سے اتر کر وہ کچھ دیر تک ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس کے پاؤں میں ذرا سی لڑکھڑاہٹ آئی تھی، ریمنڈ نے سوچا، کیا وہ گرنے کے تصور سے خوفزدہ تھا؟ کچھ دیر کے لیے ڈر کا احساس ضرور ہوا تھا۔ ممکن ہے، خودکشی کرنے والوں میں بھی یہ احساس ہوتا ہو۔ کیونکہ فیصلے کے لیے ایک لمحہ ہوتا ہے۔ اس طرف زندگی، اس طرف موت۔ ایک لمحے میں، زندگی اور موت میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ کچھ لوگ ڈر جاتے ہیں اور کچھ زندگی سے کھیل جاتے ہیں۔ ایک لمحہ اس کے لیے بھی بھاری تھا جب اس کے پاؤں لڑکھڑائے تھے۔ ریمنڈ کو احساس ہوا کہ اچانک دل اچھل کر باہر آ گیا ہو۔ ایک لمحے کے لیے سناٹا چھا گیا تھا۔ یہ لامتناہی، نہ ختم ہونے والا سناٹا زندگی اور موت کے درمیان حائل ہے۔ کھیل کے درمیان ریمنڈ کو اسی سناٹے پر فتح حاصل کرنی ہے۔ کیا یہ مشکل کام ہے۔؟

سورج سر پر آ گیا تھا۔ زمین گرم تھی۔ لزی کے گھر کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ اسے احساس ہوا، دو آنکھیں اس کی طرف دیکھ رہی ہیں۔ اگر ہیزی ہوتی تو وہ دوڑ کر اس کے پاس آ جاتی۔ کچھ دیر تک سوچتے رہنے کے بعد وہ اپنی موٹر سائیکل کے پاس واپس آ گیا۔ اس نے سوچ لیا تھا، مرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ بے وجہ انسان موت سے خائف رہتا ہے۔

گھر پہنچنے کے بعد احساس ہوا کہ کچھ غیر معمولی حرکتیں اس کے جسم کے ساتھ ہو رہی ہیں۔ جسم اچانک غائب ہو جاتا ہے۔ کبھی صرف سر رہتا ہے اور آدھا دھڑ غائب۔ کبھی اچانک اس کا جسم ہرن کی طرح قلانچیں بھرنے لگتا ہے۔ کبھی احساس ہوتا ہے کہ خون کی گردش بہت تیزی سے بڑھ گئی ہو۔ اور کبھی یہ احساس کہ جسم میں خون منجمد ہو گیا ہے۔ وہم ہے اس کا۔ ریمنڈ مسکرایا۔ پھر یہ کیسی تبدیلیاں ہیں اور اس طرح کی ہلچل جسم میں کیوں ہو رہی ہے، یہ سمجھنے سے وہ قاصر تھا۔

چوتھا دن

چوتھے دن صبح اٹھنے کے بعد ماں نے صرف اتنا دریافت کیا کہ کیا کالج میں کسی سے جھگڑا ہو گیا ہے۔؟

'نہیں'۔

’ پھر کالج کیوں نہیں جا رہے ہو؟‘

’ جاؤں گا۔ابھی کچھ ضروری کام کر رہا ہوں۔اور کوئی مجھے ڈسٹرب کرے، مجھے پسند نہیں۔‘

اس کے بعد انیتا نے کچھ نہیں پوچھا۔صرف اتنا کہا کہ وہ مندر جا رہی ہے۔دروازہ بند کر لے۔

ریمنڈ کے لیے یہ سنہرا موقع تھا۔رگھو بیر بھی نہیں تھا۔ویسے بھی رگھو بیر گھر پر کم ہی ہوتا ہے۔اس سے قبل کہ ماں مندر سے لوٹ آئے، وہ ایک تجربہ اور کرنا چاہتا تھا۔دروازہ بند کرنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔میز سے رسی کا گچھا نکالا۔چھت کی طرف دیکھا۔چھت اور زمین کے درمیان کے فاصلے کی پیمائش کی۔چھت سے پنکھا بھی جھول رہا تھا۔پنکھے کی پنکھڑیوں کے درمیان بھی رسی کا پھندہ پھنسایا جاسکتا تھا۔رسی کا پھندہ تیار کرنے اور اسے پنکھے کی پنکھڑیوں کے درمیان پھنسانے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ریمنڈ نے کرسی نکالی اور کرسی پر چڑھ گیا۔کھڑکی کھلی رہ گئی تھی۔آس پاس کی عمارتوں سے کوئی اسے دیکھ سکتا ہے۔وہ کرسی سے اترا اور پہلے کھڑکی بند کی۔دوبارہ کرسی پر چڑھ گیا۔رسی کے پھندے کو غور سے دیکھا۔اب پھندے کو گلے میں ڈالنے کی باری تھی۔یہ سوچ اس پر حاوی تھی کہ وہ تجربہ کرنے جا رہا ہے یا مرنے جا رہا ہے۔؟ مان لیا گلے میں پھندہ ڈال دیا اور کرسی پر اس کا توازن بگڑ گیا، اس صورت میں پھندہ گلے میں کس جائے گا اور موت یقینی ہے۔اس نے سنا تھا، اس طرح خودکشی کرنے والوں کی زبانیں باہر نکل آتی ہیں۔ہوسکتا ہے یہ سچ نہیں ہو۔مگر سارا زور آنکھوں پر پڑے گا۔اس نے آوارہ خیالوں کو پرے کیا اور پھندے کو چھو کر دیکھا۔اب باری گلے میں پھندہ ڈالنے کی تھی۔اس نے گلے میں پھندہ ڈال دیا اور ہاتھوں سے آہستہ آہستہ پھندے کو کسنے لگا۔ایک ایسا مقام آیا جب اس کے گلے سے گھڑ گھڑانے کی آواز نکلنے لگی۔آنکھیں باہر کو نکل آئیں۔اس نے پھندے کو ڈھیلا کیا۔ایک لمحے کے لیے یہ خیال بھی آیا کہ پھندہ ڈال کر، کرسی گرا کر بھی دیکھا جائے۔لیکن ریمنڈ کو یقین تھا، کرسی گرنے کے بعد ساری ترکیبیں ہوا ہو جائیں گی......اور جسم مردہ ہو جائے گا۔اتنا تجربہ کافی تھا۔پنکھے کی پنکھڑیوں سے اب اس نے پھندے کو باہر نکال دیا۔کرسی سے اتر گیا۔کچھ دیر تک خاموشی سے کرسی پر بیٹھا رہا۔دل زور زور سے دھڑک رہا تھا......اور گلے میں ابھی بھی تکلیف ہو رہی تھی۔ریمنڈ کو احساس تھا، مرنے کے لیے بہت زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں۔لیکن اس طرح موت کو گلے لگانا بھی آسان نہیں۔لیکن جس کھیل کا انتخاب اس نے کیا ہے۔وہاں قدم قدم پر انہی تجربوں کا ساتھ ہوگا۔اس لیے جلد بازی کی جگہ اسے سوچنے سمجھنے کے لیے تھوڑا وقت لینا ہوگا۔

سب سے خوشگوار وہ چند لمحے تھے جب بارش ہوئی تھی۔لیکن بارش کچھ دیر بعد بند ہوگئی۔بارش کا شور ریمنڈ کو پسند ہے۔اس درمیان ماں واپس آ چکی تھی۔خیالات کا سلسلہ بہت حد تک منقطع ہو چکا تھا۔اس رات ڈنر کرنے کی خواہش نہیں تھی۔لیکن ان دونوں تجربوں سے ریمنڈ نے بہت کچھ سیکھا تھا۔موت زیادہ مشکل نہیں۔موت کا حوصلہ ہونا چاہیے۔اس لیے ہر وہ خطرناک کھیل جو آپ کی زندگی کو تبدیل کر سکتا ہے، کسی چیلنج سے کم نہیں۔اور جب آپ کے پاس ہارنے کے لیے کچھ نہیں رہ جائے گا تو ایسے کھیلوں کا چیلنج قبول کیا جاسکتا ہے۔

اس رات ریمنڈ گہری نیند سویا لیکن صبح جلد اٹھ گیا۔

پانچواں دن

گیم انسٹال کرنے سے پہلے ریمنڈ تمام نتائج پر از سر نو غور کرنا چاہتا ہے۔اگر مرنے والے کو احساس ہو کہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ

پیدا ہوگا جیسا کہ اس کے دھرم میں ہے۔ مگر پنرجنم فلسفہ پر یقین رکھنے والوں میں سے کسی ایک نے بھی یہ نہیں بتایا کہ وہ مرنے کے کتنے عرصے بعد پیدا ہوا۔؟ یا پہلے جنم میں وہ کیا تھا۔؟ فرضی کہانیاں ضرور گڑھ لی گئیں لیکن حقیقت سے ان کا کوئی واسطہ نہیں۔ وہ دو ایسے تجربوں سے گزرا، جو اس کے نزدیک خاصے دلچسپ تھے۔ مگر وہ اب موت کے بعد کی زندگی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مسی سپی میں رہنے والے ایک شخص والٹر اسنوبال کو ڈاکٹر نے مردہ قرار دیا مگر کچھ دیر میں ہی وہ زندہ ہوگیا اور اس نے اپنے تجربے ڈاکٹروں کو بھی بتائے۔ اسی طرح 2011 میں 57 برس کے ولیم کو اسپتال کے آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا جہاں اسے ہارٹ اٹیک آ گیا اور ڈاکٹر نے اسے مردہ قرار دے دیا۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد ولیم نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس نے بتایا کہ کافی تیز روشنی تھی۔ اس نے ایک سایہ کو بھی دیکھا، شاید یہ وہی سایہ تھا جو مردہ شخص کی روح کو اپنے ساتھ لے کر جاتا ہے۔ اس ضمن میں سب سے دلچسپ کہانیاں اہرام مصر سے وابستہ ہیں۔ ان مقبروں میں فراعین کی لاشیں حنوط کر کے رکھی جاتی تھیں۔ کچھ فرعون ایسے بھی تھے جن کی وصیت ہوتی تھی کہ تمام آسائشوں کے ساتھ انہیں آخری پناہ گاہ کے حوالہ کیا جائے۔ فراعین کا خیال تھا کہ ایک دن وہ زندہ ہو جائیں گے۔ اور اس لیے انہیں تمام آسائشوں کی ضرورت پیش آئے گی۔ اہرام مصر کی تعمیر کا معمہ کبھی حل نہیں ہوسکا۔ وید، پران، بائبل تمام مذہبی کتابوں میں مرنے کے بعد کے احوال الگ الگ بیان کئے گئے ہیں۔ ریمنڈ کو ان میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ جنت اور سورگ جیسے عقائد کو تسلیم کرنے میں اسے پریشانی ہوتی تھی۔ مرنے کے بعد انسان روحوں کی شکل میں ہوتا ہے یا روحوں کو جسم مل جاتا ہے۔؟ ایسے ہزاروں سوال تھے، جن کا جواب کبھی خاطر خواہ اسے نہیں مل سکا۔ اور اس بارے میں اس نے سوچنا ہی چھوڑ دیا۔

پانچواں دن مطالعہ میں گزرا۔ مرنے کے بعد کی زندگی کے بارے میں وہ مختلف طرح کے ویڈیو دیکھتا رہا۔ مگر کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔ اس رات بھی وہ چین سے سویا۔ اس کے بعد کے دو دن فیصلہ لینے کے دن تھے۔ فیصلہ تو وہ لے چکا تھا مگر فیصلے کو عملی شکل دینے کے لیے یہ چھٹا دن اس کے بہت کام آیا۔ رگھوبیر سہائے صبح سے شراب پی رہے تھے۔ ادھر مسلسل ملنے والی ناکامیوں سے بھی وہ پریشان تھے۔ دو بجے دوپہر کا وقت ہوگا جب تیز تیز ریمنڈ کے دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو سامنے باپ کھڑے تھے۔ باپ نے یہ نہیں پوچھا کہ کالج کیوں نہیں گئے؟ مسئلہ کیا ہے؟ ممکن ہے کہ ماں نے بتایا ہو کہ سارہ سارہ دن دروازہ بند کر کے اندر رہتا ہے۔ دروازہ کھلتے ہی رگھوبیر نے غصے میں پوچھا۔

'مجھے گھر سے نکالنے کی ترکیبیں سوچ رہے ہو یا مارنے کی؟'

ریمنڈ نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اچانک اس طرح کے سوال سے اس کا واسطہ پڑے گا۔ اس نے محسوس کیا، اس کے اندر کچھ ہو رہا ہے۔ ایک بلیو وہیل ہے، جس نے پوری طرح اپنے جبڑے کھول دیے ہیں۔ اب یہ وہیل پانی سے باہر نکل کر چھلانگ لگانے کے لیے تیار ہے۔ اس نے سنا تھا، وہیل انسانی لہجے میں بات کرتی ہے۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

'آپ انسانی لہجے میں بات کر رہے ہیں۔'

'کیا۔' غیر متوقع جواب سن کر رگھوبیر زور سے چیخا۔ تم سمجھتے ہو کہ میں انسان نہیں۔

آپ ایک بلیو وہیل ہیں۔ مگر یہ جملہ ریمنڈ ادا نہیں کر سکا۔ رگھوبیر نے اسے زور سے دھکا دیا تھا۔ اچانک لڑکھڑا کر وہ اپنے بیڈ پر گرا۔ مگر اس نے کسی قدر خود کو سنبھال لیا۔ رگھوبیر نشے میں تھے اور چیخ رہے تھے۔ 'تم کو پیدا ہوتے ہی مار دینا چاہیے تھا۔ یہ میری غلطی تھی کہ میں نے تم کو زندہ رکھا اور رہنے کے لیے گھر دیا۔ تم جیسوں کو زندہ رہنے کا ہی حق نہیں۔'

ریمنڈ کو احساس تھا، وہیل چیخ رہی ہے۔ لیکن بریفومیٹ اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا، وقت کا انتظار۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ

بلیووہیل تمہیں کھا جائے۔ تم جیت بھی سکتے ہو۔ ایک بار جیت گئے تو ساری دنیا بدل جائے گی تمہارے لئے۔ تم نے سن لیا نا، تم اپنے باپ کی نظر میں کیا ہو۔ باپ تمہیں پیدا ہوتے ہی مار دینا چاہتے تھے۔ کمرے میں حبس بڑھ گیا تھا۔ اسے گھٹن ہو رہی تھی۔ اس نے دوبارہ کمرہ اندر سے لاک کر دیا۔ اور یہ چھٹا دن تھا جب نیم شب اس نے فیصلہ کر لیا، اسے شکار ہونے کا خوف نہیں ہے۔ وہ شکار کر بھی سکتا ہے۔ جب سب کچھ اس کے لیے بے معنی ہے تو اسے سمندر میں اترنے کا خطرہ مول لینا چاہیے۔

ریمنڈ نے اس رات خود کو سمندر کی تہہ میں محسوس کیا، تیز لہروں کے درمیان۔ وہ تیر رہا ہے۔ لہریں تیز تیز اٹھ رہی ہیں۔ اس میں ہمت اور حوصلہ کی کمی نہیں۔ وہ ہاتھوں اور پاؤں کو اچھالتا ہوا دور تک تیرتا ہوا نکل جاتا ہے۔

(۷)

پرانا کھنڈر اور ریمنڈ سے گفتگو

'اس کا مطلب ہوا، تم نے گیم کی شروعات کر دی؟'

'ہاں۔' ریمنڈ کا جوش سے بھرا جواب تھا۔ میں نے شروعات کر دی.... اور 8 دن گزر گئے۔ اس نے ٹھہر ٹھہر کر بتایا۔ اس رات ہی میں نے فیصلہ کر لیا تھا۔ اس رات اگر بریفومیٹ نہیں سمجھا تا تو میں اپنے باپ کا خون کر چکا ہوتا۔ دوسرے دن اس کھیل کی شروعات ہوئی۔ 'اس گیم کا لنک تم کو کہیں نہیں ملے گا میرے اولڈ اسپائی۔ ایڈمن ہی کھیلنے والوں کو انوائیٹ لنک بھیج کر اسے اس کھیل میں شریک کر سکتا ہے۔ آپ اس گیم کو موبائل پر بھی کھیل سکتے ہیں۔ ایک بار آپ نے اس گیم کو اسٹارٹ کر دیا تو پھر چھوڑ نہیں سکتے۔'

میں نے غور سے ریمنڈ کی طرف دیکھا۔ حالانکہ وہ اپنے چہرے کو پُر سکون بتانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ایک کشمکش اس کے اندر چل رہی تھی اور میرا ذاتی خیال تھا کہ وہ ابھی تک سمندر کے خوف سے باہر نہیں نکلا ہے۔ یہی لمحہ تھا، جب مجھے دنیا کے تمام باپوں سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ ان میں میرے ڈیڈ بھی شامل تھے۔ دھوپ کا کارواں آہستہ آہستہ رخصت ہو رہا تھا۔ ہوا چلی تھی، اس کے باوجود شاخوں سے جھولتے پتے ابھی خاموش تھے۔

آگے کیا ہوا، میں نے پوچھا۔

'پہلے پوری بات سن لو۔' ریمنڈ پر جوش لہجے میں بولا۔ 'اس کھیل میں شامل ہونے والوں کو بہت سے ٹاسک دیے جاتے ہیں۔ جیسے جیسے کھلاڑی اس ٹاسک کو پورا کرتے ہیں، ویسے ویسے کھیل کا لیول بھی بڑھتا جاتا ہے۔ تمہارے اولڈ مین کو چوراسی دن ملے تھے۔ اس گیم میں 50 لیول ہوتے ہیں..... اور آخری ٹاسک میں...'

'ریمنڈ نے میری طرف دیکھا۔ وہ ہنس رہا تھا۔

'آخری ٹاسک میں؟ تم خاموش کیوں ہو گئے۔'

'پلییئر کو سوسائیڈ کرنا ہوتا ہے۔' ریمنڈ مسکرایا۔ جبکہ ہر ٹاسک موت کے قریب ہوتا ہے۔ کچھ لوگ 50 لیول تک پہنچ ہی نہیں پاتے۔ لیکن یہ گیم مزیدار ہے۔ آپ ایک بار اس گیم کا حصہ بن گئے تو پھر گیم سے باہر نہیں ہو سکتے۔ یعنی مرنے کے بعد بھی آپ کا پیچھا گیم سے چھوٹ نہیں سکتا ہے۔'

ریمنڈ ہنس رہا تھا۔

کچھ باتیں مجھے معلوم تھیں۔ ہم نے کالج میں بھی دیر تک اس گیم کے بارے میں باتیں کی تھیں۔ اس کو شروع کرنے والا علم نفسیات کا ایک طالب علم فلپ بدیکین تھا۔ پہلی بار اس گیم کو روس میں 2013 میں شروع کیا گیا۔ بدیکین کی غیر اخلاقی حرکتوں کی وجہ سے اسے یونیورسٹی سے نکال دیا گیا تھا۔ اس گیم کو دوسرے لوگوں تک پہنچانے کا کام ایک ڈیتھ گروپ نے کیا، جسے F57 کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اور جو سوشل میڈیا کا استعمال کر کے نوجوانوں کو جوش دلایا کرتا تھا۔ کیا پہلے کی نسل ایسی تھی؟ خودکشی کے واقعات کل بھی

ہوتے ہوں گے، لیکن اس طرح نہیں جس طرح کھیلتے کھیلتے موت کو گلے لگانے جیسے حادثات میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ ایک پوری نسل ڈیجیٹل میڈیا اور سوشل میڈیا کا شکار ہے۔ بلیو وہیل کے بارے میں اس نئی دنیا کو پتہ اس وقت چلا۔ جب ایک صحافی نے خودکشی کے شکار لوگوں کے بارے میں ایک مضمون لکھا۔ مضمون میں اس گیم کا ذکر تھا۔ اس وقت تک اس گیم نے سولہ لڑکیوں کو اپنا شکار بنالیا تھا۔

ریمنڈ نے بتایا کہ جب آپ گیم شروع کرتے ہیں تو پھر آپ کو کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ موت کا خوف بھی دور چلا جاتا ہے۔ اس نے اپنے دایاں ہاتھ کو آگے کیا، جسے اتفاق سے میں دیکھ نہیں سکا تھا۔ وہاں بلیڈ کے ذریعہ L57 لکھا ہوا تھا۔

' یہ خوفناک ہے۔' میں زور سے چلایا.... ہاتھ کی نسوں میں ابھی مجھے خون جمع ہوا نظر آیا۔ مجھے اپنے اندر خون منجمد ہوتا محسوس ہوا۔ میں کانپ رہا تھا۔ یہ سب کیا ہے.....

' یہ گیم کا پہلا راؤنڈ تھا۔ مجھے بلیڈ سے اپنے ہاتھ پر لکھنا تھا اور لکھ دیا۔ دوسرے راؤنڈ میں، مجھے صبح 4 بجے اٹھنا تھا اور کچھ خوفناک ویڈیو دیکھنے تھے۔ میں اب تک ان وی ڈی او کو بھول نہیں پا رہا ہوں۔ تیسرے دن مجھے اپنے ہاتھوں پر لمبی لمبی لکیریں کھینچنی تھیں۔'

مجھے احساس تھا، مجھ سے ملنے میں وہ کچھ چھپانے کی کوشش کررہا ہے۔ خاص کر اپنے ہاتھوں کو۔ اس کے ہاتھوں کی لکیریں نمایاں تھیں۔ مجھے یقین کرنا مشکل تھا کہ میرا ایک دوست بلیو وہیل کے جبڑے میں اپنا منہ دے چکا ہے اور اس وقت میرے پاس بیٹھا ہے اور میں اس سے گفتگو کررہا ہوں۔ چوتھے دن ریمنڈ نے ایک وہیل مچھلی کی تصویر بنائی۔ پانچویں دن اس سے کہا گیا کہ اگر آپ وہیل بننا چاہتے ہیں تو اپنے پاؤں پر ہاں لکھیں۔ اور ہاتھوں پر بہت جگہ کٹ کے نشان ہوں۔ چھٹے دن بھی جسم پر یہ نشان بنوائے گئے۔ ساتویں دن بھی L 40 اسکریچ کرنے کو کہا گیا۔

' آج آٹھواں دن ہے۔' ریمنڈ نے بتایا آج میں نے ایڈمن کو بتادیا ہے کہ میں وہیل ہوں۔ میں وہیل ہوں یار بلیو وہیل۔ دیکھو مجھے۔ اس نے ٹی شرٹ ہٹا کر سینے کے آس پاس کے نشانات دکھائے۔ یہاں بھی اسکریچ پڑے ہوئے تھے۔

' میرے پاس بہت زیادہ وقت نہیں ہے۔ لیکن میں چاہتا تھا کوئی میری باتوں کا گواہ ضرور ہو۔ کھیل شروع کرنے سے پہلے میں نے ایک تجربہ اور کیا میرے اولڈ اسپائی۔ میں نے کئی بار ایک جملے کو دہرایا۔' یہ زندگی ہے۔ یہ موت ہے۔ یہ زندگی ہے۔ یہ موت ہے۔ مجھے احساس ہوا، ان دونوں باتوں میں کوئی فرق نہیں۔ زیادہ کا فاصلہ نہیں ہے، بلکہ فاصلہ ہے ہی نہیں اور ہاں تم لوگ اس گیم کو شروع مت کرنا۔' ریمنڈ اب بھی مسکرا رہا تھا۔ گوگل اور دوسرے سوشل میڈیا نے بلیو وہیل نام کو بلاک کردیا ہے، مجھے بھی پریشانی ہوئی کھوجنے میں۔ اب اس کے دوسرے نام ہیں۔ A Silent house wake me up 4.20 A.M, A sea of whales یہ گیم اب ایک جگہ نہیں رہ گیا ہے بلکہ کئی سرور میں اپ لوڈ ہوچکا ہے۔ لیکن بریفومیٹ بھی کہے تو اس کھیل کو مت کھیلنا۔'

اس وقت ریمنڈ مجھے سمندر کی پرسکون لہروں کی طرح نظر آرہا تھا۔ ایک ایسا کھلاڑی جو اپنا گیم سمجھ چکا ہے۔ ہم زندگی میں اسی طرح داخل ہیں جس طرح سمندر میں لہریں ہیں۔ پانی کبھی کبھی انسانی علم سے زیادہ اونچا ہوجاتا ہے۔۔ ہماری دنیا میں جدید ترین ایجادات کا داخلہ ہمیشہ ہوتا رہا ہے اور یہ انسان ہے جو مختلف صورتوں میں اور ناقابل یقین حد تک اپنی بے کیف دنیا کو انگیز کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ ریمنڈ کی کوشش یہی تھی اور میرے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ اس نے اپنے لیے غلط راستہ کا انتخاب

کیا ہے۔

' اب میں چلوں گا۔کوشش کرنا کہ میری بات کا علم دوستوں کو نہ ہو۔آ گے کیا ہوگا میں نہیں جانتا۔لیکن اس کھیل میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔ مجھے نہیں معلوم، ہم ملیں گے یا نہیں۔یا کب ملیں گے،ابھی کچھ بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔'

' ریمنڈ اس کے بعد ٹھہرا نہیں۔تیز تیز چلتا ہوا نگاہوں کے آگے سے غائب ہو گیا، جیسے پرندے اڑتے اڑتے غائب ہو جاتے ہیں،آسمان میں۔ میں تادیر وہیں بیٹھا رہا۔میں ریمنڈ کی گفتگو کے آخری حصے پر غور کر رہا تھا۔اس وقت میرے سامنے بلیو وہیل نہیں تھی، بلیو وہیل کی جگہ ریمنڈ کا باپ تھا۔رگھوبیر سہائے۔ مجھے رہ رہ کر اس کے باپ پر غصہ آ رہا تھا۔ریمنڈ کے اس کھیل کی طرف قدم بڑھانے میں یقینی طور پر اس کے باپ کا ہاتھ تھا،میرا خیال ہے، دنیا کے سارے باپ ایسے ہی ہوتے ہیں۔

◆◆

ایک مہینہ گزر گیا تھا۔ریمنڈ کا کوئی اتہ پتہ نہیں تھا۔اس درمیان گھر پر بھی میں خاموش ہی رہتا تھا۔ممی سارہ جہانگیر میری تبدیلی پر حیران تھیں۔اس نے ہمیشہ کی طرح مجھے سمجھانے کی کوشش کی کہ زندگی کا مقابلہ کرو۔ یہ دنیا سب کیلئے ایک جیسی ہے۔لیکن میں یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا۔دوستوں کے درمیان بھی ریمنڈ کو لے کر گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ہم میں سے کوئی بھی اس کے گھر جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔خوف اسی بات کا تھا کہ ریمنڈ کوئی غلط قدم نہ اٹھالے۔ایک دن ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم ریمنڈ کے باپ سے بات کریں گے۔ کچھ وقت اور نکل گیا۔اس درمیان ریمنڈ نے کسی کا بھی فون اٹھانے کی زحمت گوارہ نہیں کی۔میرا قیاس تھا کہ اب کھیل کے 50 دن گزر گئے ہیں۔اگر ریمنڈ مستقل اس کھیل کا حصہ ہے تو اس کی پریشانیاں یقینی طور پر بڑھ گئی ہوں گی۔پنیت کو رگھوبیر سہائے کا نمبر مل گیا۔

پنیت نے بتایا۔ یہ نمبر اس کو آفس کے رجسٹر سے ملا۔ایمرجنسی میں کسی کو بلانے کے لیے طلبا کو ایک نام دینا ہوتا ہے۔ریمنڈ نے اپنے باپ کا موبائل نمبر لکھا تھا۔اب سوال تھا،اس نمبر پر فون کون کرے گا۔گریسی نے کہا کہ وہ فون کرے گی۔ریمنڈ کی گمشدگی کا اثر ہم سب پر تھا لیکن گریسی کچھ زیادہ ہی پریشان تھی۔ مجھے یقین ہے ریمنڈ کی یادوں کو بھولنا،اس کے لیے ممکن نہیں ہے۔

گریسی نے خوفزدہ لہجوں میں بتایا۔ابھی تو اس نے آٹھ راؤنڈ ہی ختم کیے ہیں۔میں نے پڑھا ہے،کھیل کو اکثر تبدیل کیا جاتا ہے۔ اب ریمنڈ سب سے پہلے خوف کو جیتنے کی کوشش کرے گا۔یہ بھی کھیل کا حصہ ہے۔ایڈمن کے ذریعہ بھیجی گئی موسیقی کو سننا ہوگا۔اس کو اپنے ہونٹ کاٹنے ہوں گے۔بدن پر کچھ زیادہ گہرے نشانات بنانے ہوں گے۔اپنے ہاتھ پر بھی وہیل کی تصویر بنانی ہوگی اور اپنے ہاتھ میں سوئی سے سوراخ کرنا ہوگا۔اسکائپ پر کسی دوسری وہیل کے ساتھ آپ کو چیٹ کرنا ہوگا۔ایک خفیہ مشن بھی دیا جا سکتا ہے۔پھر آپ سے پوچھا جائے گا کہ کیا آپ مرنے کے لیے تیار ہیں۔آپ کو رضامندی ظاہر کرنی ہوگی اور مرنے کا دن خود طے کرنا ہوگا۔

' بالکل سہی۔' پنیت کے لہجہ میں ٹھہراؤ تھا۔کچھ لڑکوں نے ریل کی پٹریوں پر آ کر اپنی جان دی ہے۔یہ بھی کھیل کا حصہ ہے۔اس درمیان گیم آپ کو اس طرح جکڑ چکا ہوتا ہے کہ آپ باہر نہیں نکل سکتے۔

دلچسپ یہ ہے کہ اس جیسے کتنے ہی گیم مارکیٹ میں آ چکے ہیں۔ایک گیم ہے۔دی پاس آؤٹ چیلنج۔اس میں دو لوگ ایک دوسرے کو چیلنج کرتے ہیں اور ہر کہانی موت پر ختم ہوتی ہے۔ایک گیم ہے، دی سالٹ اینڈ آئس چیلنج۔نمک اور برف کے اس کھیل کا اثر سیدھے

نوجوانوں کے جسم پر پڑتا ہے۔نوجوان نسل اپنے کارنامے دکھانے کے لیے اس کے ویڈیو بھی لیتی ہے۔ یہ کھیل بھی موت کے انجام پر ہی پہنچتا ہے۔اسی طرح ایک گیم، فائر چیلنج ہے۔اس گیم میں جسم کے جل جانے کا خطرہ ہے۔لیکن نوجوان اس کھیل کو بھی پسند کرتے ہیں۔ایک کھیل ہے، دی کٹنگ چیلنج۔اس میں جسم کے کئی حصوں پر بلیڈ یا چھری سے کٹنگ کرنا ہوتا ہے۔ یہ کھیل بھی موت کو دعوت دینے جیسا ہے۔وقت کے ساتھ ایسے کھیلوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔

نئی نسل خاموشی سے موت کی طرف قدم بڑھا رہی ہے،لیکن زیادہ تر گھر والے عزیز رشتے دار یہاں تک کہ اساتذہ بھی کبھی اس بات پر غور نہیں کرتے کہ آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے۔؟

◆◆

ہم دیر تک ریمنڈ کے باپ سے گفتگو کے لیے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے رہے۔ ہوسکتا ہے،اجنبی نمبر دیکھ کر فون ہی نہ اٹھائے، گریسی نے دو بار فون لگایا۔گھنٹی بجتی رہی۔تیسری بار فون اٹھالیا گیا.....

' ہیلو'ایک کرخت آواز گونجی۔

' رگھو بیر انکل۔' دوسری طرف سخت لہجے میں ہامی بھری گئی۔

' میں ریمنڈ کی کلاس میٹ ہوں۔'

' تو میں کیا کروں۔' دوسری طرف لہجہ میں اور زیادہ سختی آ گئی تھی۔ ریمنڈ نہیں ہے۔گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ پندرہ دن ہو گئے۔آئندہ فون کرنے کی ضرورت نہیں۔

فون کاٹ دیا گیا۔گریسی کا لہجہ خوفزدہ تھا۔'ریمنڈ پندرہ دن سے غائب ہے۔'

' مائی گاڈ۔' پنیت نے ٹہلنا شروع کر دیا۔اس کا مطلب....

'لیکن پندرہ دن پہلے تو پچاس دن پورے نہیں ہوئے ہوں گے؟' نیتی نے کہا۔

' پچاس دن سے پہلے بھی۔' گریسی کہتے کہتے ٹھہر گئی۔

' کیا اس کے باپ نے ریمنڈ کو تلاش کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی؟' پنیت غصے سے بولا۔' کم از کم ایف آئی آر تو درج کرنی چاہیے تھی۔'

' ہوسکتا ہے کیا ہو۔' گریسی نے کہا،اس نے تو فون ہی کاٹ دیا۔

میں نے آہستہ سے پوچھا۔' کیا ہم ریمنڈ کے باپ سے ملنے کی کوشش کریں؟'

' کوئی فائدہ نہیں۔'

' لیکن ایک بات ہے' نیتی نے ہم سب کی طرف دیکھا۔ہم اس بات سے واقف تھے کہ وہ کون سا گیم کھیل رہا ہے۔کیا اس کی اطلاع ہمیں کالج کے پرنسپل یا پولیس کو نہیں دینی چاہیے تھی؟'

' ہم میں سے کس کو پتہ تھا کہ ریمنڈ غائب ہو جائے گا۔' نشا نے کہا۔

' لیکن اب وہ غائب ہو چکا ہے۔' گریسی نے ہماری طرف دیکھا۔کیا اس کی اطلاع کالج یا پولیس کو دینی چاہیے؟'

' میرا دل کہتا ہے دینی چاہیے۔اگر ریمنڈ زندہ ہے اور محض گھر چھوڑ کر گیا ہے تو پولیس مزید انکوائری کر سکتی ہے۔'

' اوراس کے ڈفر باپ کو گرفتار بھی کر سکتی ہے۔' میں نے کہا۔
' ہاں ہمیں پہلے کالج کے انتظامیہ سے بات کرنی چاہیے۔ ممکن ہے یہی لوگ کچھ راستہ نکال لیں۔
' پرنسپل سے ملنا چاہیے۔' پنیت کا جواب تھا۔ ایک بڑی وہیل ہماری طرف بھی بڑھ رہی ہے۔ اس کھیل کو روکنا ہوگا۔'

◆◆

پرنسپل سے ملنے کے بعد کالج کا انتظامیہ حرکت میں آچکا تھا۔ کالج کیمپس میں آہستہ آہستہ یہ خبر آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔ ریمنڈ کا نام سب کی زبان پر تھا۔ انتظامیہ نے رگھوبیر کو بھی طلب کیا۔ اس وقت ہم چاروں کو بھی پرنسپل نے اپنے کیبن میں طلب کیا۔
رگھوبیر کا جواب تھا۔ وہ ایک غیر ذمہ دار نوجوان تھا۔ اسے کچھ نہیں معلوم۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم یہ کس طرح کا گیم ہے۔ وہ اپنا موبائل اپنے ساتھ لے گیا ہے اور موبائل بند آرہا ہے۔

پولیس کی تحقیق آگے بڑھی تو کچھ اطمینان ہوا۔ لیکن دو تین مہینے گزرنے کے بعد بھی ریمنڈ کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ ممکن ہے، پولیس نے تلاش کرنے کی کوشش کی ہو مگر ریمنڈ کہاں گیا، کسی کو نہیں معلوم۔ دو تین مہینوں کے اندر ہم بھی ریمنڈ کو بھول گئے۔ یہ خام خیالی ہی ہے کہ بھولنا مشکل ہوتا ہے۔ اس دنیا میں بھول جانا سب سے آسان ہے۔ کوئی مر جاتا ہے تو کچھ لمحے ہوتے ہیں جو ممکن ہے عزیز رشتے داروں کو غمگین کر جاتے ہوں۔ اس کے بعد مرنے والے کو دماغ کے کسی بند گوشے کے حوالے کر دیا جاتا ہے، یہ گوشہ شاذ و نادر کھلتا ہے۔ ریمنڈ زندہ ہے یا مر گیا، یہ کہنا مشکل تھا۔ مگر ریمنڈ جس طرح اور جس راستہ پر جا رہا تھا، ہم نے اسے مردہ تسلیم کر لیا تھا۔ اگر زندہ ہوتا تو باپ سے نہ سہی، وہ ہم دوستوں سے ملنے کی کوشش ضرور کرتا۔

◆◆

ریمنڈ کی کہانی سے ایک سبق ملا تھا کہ زندگی بہت آسان نہیں ہے۔ موت کہیں زیادہ آسان ہے۔ گم ہو جانا اس سے بھی زیادہ آسان۔ ممی سارہ جہانگیر سوچتی ہیں کہ زمین کی سطح اس قدر نرم ہے کہ ہم چلتے ہیں تو ان پر آسانی سے نقش ابھر جاتے ہیں۔ لیکن نقش مٹ بھی جاتے ہیں۔ یہاں خواب کچھ ہی لوگوں کے پاس ہے۔ نوجوانوں کی ایک بڑی آبادی خواب سے دور ہے۔ اس لیے غیر معمولی اور غیر متوقع کامیابیوں کی جگہ کوئی شارک، کوئی بلیو وہیل راستے میں آجاتی ہے۔ ریمنڈ کی کہانی ختم ہوگئی۔ ذہن میں پرچھائیاں اڑتی ہیں، پھر ان کے نقش غائب ہو جاتے ہیں۔ وہ ڈائری میرا تعاقب کر رہی ہے۔ ممی نہیں جانتیں کہ میں موت کو ریمنڈ کی شکل میں بہت قریب سے دیکھ چکا ہوں۔ ممی کی زندگی کا فلسفہ الگ ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بیٹے کی زندگی سے ماں باپ کی زندگی کا فلسفہ مختلف ہوتا ہے۔ یہ جنریشن گیپ بچوں کی سمجھ میں تو آتا ہے لیکن ماں باپ کی سمجھ میں نہیں آیا۔ میں ممی کی آہٹ سن رہا ہوں۔ میں اکثر بیزار ہو جاتا ہوں جب کوئی میرے اندر کے سناٹے کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے۔

چہرے دھند میں کھو جاتے ہیں، مرتے نہیں

—سارہ جہانگیر

سارہ جہانگیر کے زاویہ سے زندگی کا اقرار نامہ

(۱)

میں اس پار دیکھی رہی ہوں...... گہری دھند ہے— مگر صرف دھند کہاں ہے......؟ برف پوش وادیاں ہیں...... لاتعداد گلیشیرس ہیں...... جو مسلسل تپش اور موسم کی تبدیلی کی وجہ سے پگھلتے جارہے ہیں...... حدنظر روئیدگی سے بھرپور حسین ترین وادیاں...... اور ایک لمحے میں منظر تبدیل ہوجاتا ہے—قدرت کا قہر نازل ہوتا ہے...... قیامت خیز لہریں شور کرتی ہیں...... شہر کے شہر پانیوں میں ڈوب جاتے ہیں—پاشا، تم نے سنا...... یقیناً تم سن رہے ہو پاشا...... لوگ ایسے بھی گم ہوجاتے ہیں کہ کچھ دن، کچھ مہینے اور کچھ سال بعد تاریخ سے دریافت کرو تو تاریخ کا ''ٹھٹھا'' گونجتا ہے کہ کون لوگ......؟ کیا کبھی یہ لوگ تھے......؟ کبھی یہ نام...... جسموں میں بھی آباد تھے؟ کبھی یہ نام تمہاری طرح یعنی زندہ آدمیوں، بھیڑ بکریوں کی طرح انسانی شاہراہوں پر گھومتے ہوئے بھی نظر آتے تھے—؟ محبت کرتے ہوئے...... یا انسانی تقاضوں کی رسم کو پورا کرتے ہوئے...... پاشا...... کچھ دن کے بعد یہ چہرے تو کہیں محفوظ بھی نہیں رہتے...... کوئی ایک آتش فشاں، کوئی ایک برقی لہر، کوئی ایک زلزلے کا جھٹکا...... کوئی قدرتی عتاب یا پھر ایک قدرتی حادثہ یا موت...... پاشا—اس وسیع کائنات، اس براعظم سے زندہ انسانی چہروں کا کھوجانا...... نہیں پاشا— میری طرف ایسے مت دیکھو اور یقین کرو...... میں بالکل ٹھیک ہوں......

پاشا کون......؟

میرا بیٹا............ اور اس وقت اس فلیٹ کی ویران آرام گاہ' میں ہم دونوں کا ہی بسیرا ہے...... ایک کھڑکی کھولتی ہوں— باہر کی طرف دیکھتی ہوں...... دور تک دھند کی چادر بچھی ہوئی...... اطراف کے درخت اس دھند میں کھو گئے ہیں— دھند میں راستے بنتے ہیں...... اور کھو جاتے ہیں— پھر راستے بنتے ہیں اور کھو جاتے ہیں...... چھپن چھپیا کا یہ کھیل چلتا رہا ہے— لیکن یہ کھیل ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں لاتا— اور کہنا چاہیے...... میں اندر سے خالی ہوں یا بجھ گئی ہوں— یا صرف کتابیں رہ گئی ہیں جو تھکے ہوئے وجود کے لیے بھی تسکین کا سامان کرنے سے قاصر ہیں— اور ان کتابوں سے ہو کر ارنیسٹ ہیمنگوے، سمندر کا بوڑھا آدمی میرے سامنے نکل کر کھڑا ہو جاتا ہے...... پاشا...... تم سن رہے ہو مجھے...... اور یقین کے ساتھ یہ میرا وہم نہیں ہے...... وہ میرے ساتھ ساتھ اس دھند کا حصہ بن گیا ہے— پھر میری طرف دیکھتا ہے...... 'مٹی کا ایک ٹکڑا بھی سمندر بہا کر لے جائے تو زمین کم ہو

جاتی ہے......ایک بھی آدمی......ایک بھی آدمی کم ہوتا ہے تو......؟

نہیں، اب مجھے ہنسی آرہی ہے— اور ان سارے واقعات کو سمیٹنا میرے لیے آسان نہیں— مثال کے لئے...... یہ میرے سامنے تاحدنظر دھند کی چادر بچھی ہوئی ہے......اور ایک لمحہ ایسا بھی آئے گا کہ یہ دھند کی چادر تو ہوگی لیکن یہ جسم نہیں ہوگا— یا اسے یوں کہیں کہ وہ روح نہیں ہوگی...... جو اس وقت اس جسم کا حصہ ہے— باہر سب کچھ ویسا ہی چل رہا ہوگا...... بندر کا تماشہ......شور...... بازار کی رونقیں— تیز رفتاری سے بھاگتی ہوئی گاڑیاں— محبت کرتے ہوئے لوگ...... بارش کے قطروں کو ہتھیلیوں پہ لے کر روشن، چمکنے والی آنکھوں کے گیت......اخبار...... ٹی وی...... حادثے......سب کچھ...... پھر دیکھنے والے کون ہوں گے......؟ دوسرے لوگ......اور پاشا— تمہاری زندگی سے وابستہ بھی دوسرے لوگ ہوں گے...... ہے نا......؟ یوں چونک کر میری طرف مت دیکھو— اور اس بات کو رہنے دو کہ اس وقت میری دماغی کیفیت ٹھیک نہیں...... میں بالکل ٹھیک ہوں پاشا— اور میں سمجھ نہیں پارہی ہوں کہ ایک ایسے معمولی سے سوال پر تم اس طرح چونک کر میری طرف کیوں دیکھ رہے ہو— جب سے دنیا قائم ہوئی ہے، کیا یہ سوال کرنے والی میں پہلی عورت ہوں......یا یہ سوال پہلے بھی قائم کیے گئے— یوں حیران مت ہو......اور سنو غور سے میری بات سنو— یہاں ایک حادثہ ہوا ہے— ایک بڑا حادثہ— کچھ لوگ گم ہو گئے ہیں— اور مجھے پولیس میں ان کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانی ہے......کون چلے گا میرے ساتھ؟ تم چلو گے پاشا— تم بڑے ہو گئے ہو......اور یقیناً تم کو چلنا بھی چاہیے ان میں سے ایک وہ بھی تھا— جس کے ساتھ تمہارا قریبی رشتہ رہا ہے—

◆◆

''ہم ایک دن ملیں گے— ایک دن اسی دھند میں ملیں گے— ممکن ہے ہم ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوں......ممکن ہے، گفتگو کرنے کی بھی خواہش ہو— مگر یہ بھی ممکن ہے کہ شاید ہم ایک دوسرے سے بات نہ کر پائیں— کھلی آنکھوں سے ایک دوسرے کی موجودگی محسوس کی جارہی ہو......مگر......کیا اتنا کافی نہیں— کہ ہم ملیں گے— اور ایک دن اسی دھند میں ملیں گے اور پھر دھند سے بھی اوجھل ہو جائیں گے......'

دھواں دھواں ہوتی ہوئی یادوں میں اس کے یہ مکالمے اب بھی بسے ہوئے ہیں— میں سامنے ہوتی تو وہ بانہیں پھیلا کر میری طرف محبت سے دیکھتا......دور اشارہ کرتا، جہاں......تاحدنظر نیلگوں آسمان کی چادر بچھی ہوتی اور میں خاموشی سے مجسم سوال بنی اُس کی طرف دیکھ رہی ہوتی......پھر وہ مسکرا دیتا— اور کہتا— ایک دن اسی نیلی دھند میں ہم ہوں گے......ہم اسی طرح کھو جاتے ہیں— یا اس وادیِ طلسمات میں ہم اسی طرح کھونے کے لیے پیدا ہوئے ہیں......

کیا وہ سچ مچ کھو گیا ہے......؟

ممکن ہے باہر گیا ہو......ابھی لوٹ کر آجائے گا— کبھی کبھی وہ جان بوجھ کر دیر سے آتا ہے...... مجھے غصہ دلانے کے لئے—

میں نے آنکھیں بند کیں— پھر آنکھیں کھول دیں— پاشا کی طرف دیکھا......

'وہ پہلے تھا، کچھ دن پہلے تک اور یقین کے ساتھ......'

'ہاں—'

’اور اس بات سے تم بھی واقف ہو......؟‘

ہاں......

اور وہ دوسروں سے بہت حد تک مختلف تھا......

’ہاں—‘

’وہ باپ تھا تمہارا—‘

میں نے ٹھڈی پر ہاتھ رکھتے ہوئے گہری آنکھوں سے بیٹے پاشا کو دیکھا، جو ناپسندیدگی کی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا— عام طور پر وہ اس طرح کی گفتگو کے حق میں کبھی نہیں تھا— مگر یہ پاشا کی مجبوری تھی کہ میں اس کا ہاتھ تھام کر اس کے کمرے سے اُسے لے کر اس کمرے میں آ گئی تھی، جہاں ہمارا بیڈ روم تھا— اور یقیناً پاشا کو یہ بات بری لگی تھی— اور اسے بُری لگنی بھی چاہیے تھی— کیونکہ ہمیشہ کی طرح وہ اپنے کمرے میں اپنے لیپ ٹاپ پر جھکا ہوا تھا— اُس کے سر پر چھوٹے چھوٹے بال تھے، یہ بال درمیان سے اٹھے ہوئے آسمان کی جانب تھے—ایک زمانے میں پاشا کے باپ کو یہ بال سخت ناپسند ہوا کرتے تھے— مگر پاشا کی ہر بار یہ مضبوط دلیل ہوتی کہ وقت کے ساتھ فیشن بدل جاتے ہیں— جیسے افریقیوں کی طرح اٹھے ہوئے بال اور ہپّیوں کی طرح پھٹی ہوئی جینس، جو اس وقت وہ پہنے ہوئے تھا اور جینس سے میچ کرتا ہوا ٹی شرٹ......اور یہ بھی حقیقت ہے کہ محض بالوں کی وجہ سے اس کا پرکشش چہرہ یوروپ کے کسی ایک ایسے، جپسی بچے کا تصور پیدا کر رہا تھا جو مجھے کسی بھی صورت میں متاثر نہیں کر سکتا تھا۔اور پاشا کی دلیل ہوتی کہ آپ لوگ پرانے زمانے کے ہیں— اور اس وقت پاشا کا ہاتھ تھامنے والی وہی پرانے زمانے کی عورت تھی جو بدقسمتی سے اس کی ماں بھی تھی— اور یہ بھی حقیقت ہے کہ پاشا کے لئے، یا ان نئے بچوں کے لیے یہ ماں ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا— میں پاشا کو لے کر کمرے میں آ گئی— اور اس فریم کی طرف اشارہ کیا جو دیوار پر ایستادہ تھا—

’اس تصویر کو پہچانتے ہونا......‘

’ہاں......‘

اور تمہارے لیے یہ معنی نہیں رکھتا کہ......‘ میں نے ٹھہر کر پاشا کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی......کہ اس کائنات سے ایک بھی آدمی کم ہو جائے......ہاں ایک بھی آدمی......‘

میں پاشا کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور اس وقت پاشا کی حالت یہ تھی کہ وہ مشکوک نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا— اس کی آنکھیں بغور میرا جائزہ لے رہی تھیں اور ممکن ہے، اس نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہی ہوں کہ اس وقت میری دماغی حالت کیا ہے؟

آؤ میرے ساتھ—‘

میں پاشا کو لے کر اس کمرے میں آئی، جو اس کا ناپسندیدہ کمرہ تھا۔ اس وقت یہ کمرہ بے رونق بھی تھا اور ویران بھی— پہلے یہ کمرہ اس قدر ویران نہیں ہوتا تھا— جب کہ باپ اس کمرے میں عام طور پر کم بولا کرتے تھے— اور اس کمرے میں چاروں طرف الميرا میں ان کی کتابوں کی حکومت تھی— اور ایک بڑی سی ریوالونگ چیئر تھی، جس پر سر رکھے یا تو وہ کسی سوچ میں گم رہتے تھے— یا پھر سگریٹ کا دھواں چھوڑے ہوئے لکھنے میں گم ہو جاتے تھے۔ کئی بار ایسا ہوا جب میں کمرے میں اندر آتی تو سگریٹ کی مہک سے پریشان ہو کر زور سے چیخ پڑتی—

خدا کے لئے......خدا کے لیے اسموکنگ بند کرو—

'بند کردوں گا—'

'نہیں خدا کے لئے—اور تم سن رہے ہو—اس کمرے سے سگریٹ کی مہک کبھی جاتی بھی نہیں—اور خدا کے لیے پاشا کے بارے میں سوچو......'

وہ ہمیشہ کی طرح مسکراتے ہوئے ایش ٹرے میں سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر دوبارہ لکھنے میں گم ہو جاتا......

یادوں کی پرچھائیوں سے باہر نکل کر میں نے دیکھا......ریوالنگ چیئر خالی تھی۔اور المیرا سے جھانکتی کتابوں کے شور اس وقت مجھے پریشان نہیں کرر ہے تھے......کتابوں کے شور—' میں جب بھی اس کمرے میں داخل ہوتی، ایسا احساس ہوتا کہ اچانک المیرا کی بند کتابوں میں زندگی کی رمق پیدا ہوگئی ہو......پھر ایسا لگتا جیسے کتابیں بولنے لگی ہوں......پھر ایسا ہوتا کہ میں ان کتابوں کی چیخ کی زد میں ہوتی......اور کئی بار ایسا ہوا جب میں نے دونوں ہاتھ سے اپنے کان بند کر لئے—اور سراسیمہ انداز میں اس کی طرف دیکھ کر گویا ہوتی—خدا کے لئے......خدا کے لیے ان کتابوں کا کوئی اور انتظام کرو—

'لیکن کیا؟'

'کچھ بھی—'

'مشکل یہ ہے کہ کتابیں جلائی بھی نہیں جاسکتیں—'

'جانتے ہو—پاشا بھی تمہارے کمرے میں آتے ہوئے گھبراتا ہے—اور کہتا ہے مجھے ان کتابوں سے نفرت ہے—سن رہے ہو تم......'

حالانکہ ایسی باتیں سن کر عام طور پر وہ مسکرا کر خاموش ہو جاتا تھا— مگر مجھے یاد ہے......وہ طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھ رہا تھا......

'سمندر میں خزانے چھپے ہیں......'

ہاں—

'اور اس کے لیے سمندر کے اندر جانا ہوتا ہے......گہرائی تک......'

'ہاں—'

'ایک دن وہ اس گہرائی کو سمجھ لے گا......تب اس کے ہاتھ بیش قیمت موتیوں سے بھرے ہوں گے......اور ابھی ان باتوں کا اندازہ لگانے کے لیے تمہاری عمر بہت کم ہے—تم پاشا سے زیادہ بڑی نہیں ہو......'

وہ پھر سے کتابوں کی دنیا میں گم تھا اور مجھے یاد ہے، میں زور زور سے چیخ رہی تھی '......تم سمجھتے کیا ہو اپنے آپ کو...... میں چھوٹی ہوں......دماغی طور پر میری عمر وہی ہے—جو پاشا کی ہے......تم یہی کہنا چاہتے ہونا......حالانکہ وہ اپنی کتابوں میں الجھا ہوا تھا مگر مجھے احساس تھا کہ وہ مسکرا رہا ہے—اور یہ مسکراہٹ مجھے کس قدر گراں گزرتی ہے—یہ میں ہی جانتی تھی—

میں نے یادوں کے جھروکے سے باہر نکل کر پاشا کی طرف دیکھا—اُس کی آنکھیں بجھی ہوئی تھیں—چہرہ سپاٹ—پاشا کبھی بھی اپنے چہرے سے اپنے جذبات کو عیاں نہیں ہونے دیتا تھا—پاشا ناگواری کے انداز میں اُس کی طرف دیکھ رہا تھا—

'مجھے کیوں لائی ہو یہاں—؟'

’وہ یہاں بیٹھتا تھا— اس ریوالنگ چیئر پر— اور دیکھو تو...... یہاں میز پر اُس کی کتابیں، کاپیاں، ڈائری ہوا کرتی تھیں— وہ کہاں گئیں......؟ اُس کی ہر چیز وہیں ہونی چاہیے— جہاں وہ رہتا تھا— تم سن رہے ہو نا پاشا— وہ آئے گا— اور چیخنا شروع کردے گا......‘ مجھے ہنسی آرہی تھی......کوئی چیز نہیں ملے گی تو اُس کا پارہ ساتویں آسمان پر ہوگا— اور دیکھو...... لکھتے لکھتے وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر اس طرف آتا تھا— یہ کھڑکی باہر کی طرف کھلتی ہے...... باہر جامن کے پیڑ بھی ہیں— ہرے ہرے سبز سخت پتے...... وہ مجھے چڑایا کرتا تھا— یہ تمہاری ہتھیلیاں ہیں— اب پہلے کی طرح ملائم نہیں رہیں......قدرت کے سحر میں کھو جانا اسے پسند تھا اور اسی لیے وہ لکھتے ہوئے تھک جاتا تو کھڑکی کھول کر دیر تک باہر کے مناظر میں گم رہتا— ‘میں نے مسکرا کر پاشا کی طرف دیکھا—

’باہر ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے......‘

’ہاں......‘

’دیکھو...... جامن بھی پیڑوں سے گر رہی ہیں......کبھی کبھی مجھے لگتا تھا— قدرت میں اُس کی کوئی دلچسپی نہیں ہے......مگر محبت......میں ایک لمحے کو ٹھہری— انسان میں محبت کا یہ تخم قدرت ہی ڈالتی ہے......اور اس طرف: یہاں......اُس کی کرسی پر بیٹھ کر دیکھو......‘

پاشا نے برا سا منہ بنا کر اُس کی طرف دیکھا— ’نہیں—‘

’کیوں—؟‘

مجھے نہیں بیٹھنا— اور سنو ماں......تم اس کی جگہ بیٹھ جاؤ— اور اس کے بعد پہلے تمام معاملات پر نئے سرے سے غور کرلو— تم تو سمجھ رہی ہو نا......میں کیا کہہ رہا ہوں......

’ہاں......‘

’اور جیسا کہ تم نے کہا، وہ تھا— اور اچانک ایک صبح......‘

’موسم خراب تھا— پیلی آندھی چلی تھی......تمہیں یاد ہے پاشا— موسم نے اچانک رنگ بدل دیا تھا— باپ تم کو تلاش کرتے ہوئے کمرے میں آئے تھے......ان کا لہجہ ذرا سا اکھڑا ہوا تھا...... یاد ہے؟ مجھے ان کے لفظ اب بھی یاد ہیں— پولیوشن...... یہ انسانی تحفہ قدرت نے ہمیں واپس کردیا— بہتر ہے پاشا آج گھر میں ہی رہے— اُسے باہر مت نکلنے دینا......یاد ہے تمہیں......؟‘

’ہاں......‘

میں کچھ دیر تک بکھری ہوئی کتابوں والی الماری کو دیکھتی رہی— پھر میرے ہاتھوں نے آگے بڑھ کر ریوالونگ چیئر کے ہینڈل پر لرزتا ہوا ہاتھ رکھ دیا......ایک سہرن وجود میں اترتی چلی گئی— لمس یوں بھی بے جان اشیاء میں جاگتے رہتے ہیں، مجھے پتہ ہی نہیں تھا— کرسی خالی تھی......میں کچھ دیر تک ساکت و جامد کھڑی رہی— پھر کرسی پر بیٹھ گئی— پاشا واپس اپنے کمرے میں لوٹ چکا تھا— اور جیسا پاشا نے کہا مجھے تمام واقعات کو نئے سرے سے سمجھنا تھا اور اس کے بعد گمشدہ ہستیوں کی تلاش میں باہر نکلنا تھا—

میں کرسی پر بیٹھ گئی— سر کو پیچھے کیا— آنکھیں بند کرلیں— اب میرے لیے واقعات کی سرنگ میں اترنا آسان تھا اور شاید میں ایسا کرسکتی تھی—‘

◆◆

موت کے بارے میں کوئی نظریہ قائم نہیں کر سکی— مگر اس بات کا اشارہ ضروری ہے کہ موت مجھے ڈراتی ہے اور موت کا احساس مجھے پاگل کرتا ہے— حالانکہ وہ زندہ تھا تو موت کو لے کر اُس کے خیالات مختلف تھے— وہ اکثر کہتا تھا— زندگی 'کن' ہے— ہم ایک سفر پورا کرنے کے بعد 'فیکون' میں چلے جاتے ہیں— یہ جو 'کن فیکون' ہے— اسے ایک گول دائرہ یا بچوں کی، بائیسکل کی چین سمجھ لو— ہم اس یونیورس میں قرنوں، صدیوں سے بڑھتے اور پھیلتے جا رہے ہیں— ہم اس کائنات میں کس جگہ ہوں گے نہیں معلوم— لیکن یاد رکھو— کوئی بھی— اُس نے زور دے کر کہا، کوئی بھی جو ہماری آپ کی اس دنیا سے جا رہا ہے— وہ واپس نہیں لوٹے گا— ممکن ہے وہ دو مہینے کا بچہ ہو یا سو سال کا— اور یہ حقیقت ہے کہ آپ اُسے نہیں دیکھیں گی— اور ذرا غور کرو کہ ایک شخص سانس لیتا ہے، گوشت پوست کا انسان جو اپنی خواہشوں کے محل تعمیر کرتا ہے...... اپنی آسائش کے لیے مکانات اور بنگلے بناتا ہے— ڈسکو جاتا ہے— موسیقی سے لطف اٹھاتا ہے— اور گھر کے افراد کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا ہوا کھانا بھی نوش فرماتا ہے اور گپیں بھی ہانکتا ہے— اور ایک دن اچانک وہ کائنات کے کسی بلیک ہول میں پھینک دیا جاتا ہے— اور ذرا غور کرو تو سارہ...... (کبھی کبھی اچانک وہ میرے نام کو مسکرا کر لیا کرتا تھا— اور اتنے پیار سے کہ مجھے اپنے نام سے محبت ہو گئی تھی......) سارہ...... اس نے دوبارہ اس لفظ کو دہرایا...... اور ذرا غور تو کرو...... حالاں کہ اب وہ ایک انجان سیارے، کہکشاں یا بلیک ہول کا حصہ ہے— مگر آپ اُسے تلاش کر رہے ہیں— اُسے تلاش کرتے ہوئے ڈرائنگ روم سے کچن اور بیڈ روم تک آتے ہیں— ڈائننگ میز پر بھی آپ آنکھیں پھیلا کر اُس کرسی کو بار بار دیکھتے ہیں، جہاں وہ ہوا کرتا تھا— مطلب بیٹھا ہوتا تھا اور اب وہ کرسی خالی ہے...... ذرا غور تو کرو سارہ...... اور کتنی عجیب بات، بلکہ میں کہتا ہوں، اداس کرنے کی بات کہ ایسے ہزاروں لوگ، کبھی جن کے دم سے یہ ہماری بزم آباد ہوا کرتی تھی— اور ہم یہ سوچنے سے قاصر تھے کہ آیا ایک دن یہ نہیں ہوں گے— اور نہیں ہوں گے تو ان کے نہ ہونے سے ہماری زیست کے طریقوں میں کیا فرق آئے گا...... مگر سارہ— ' وہ ہنسا تھا— اب ان لوگوں کی کہانیوں کو بھولے ہوئے بھی زمانہ ہو گیا...... لیکن دیکھو تو...... ہم زندہ ہیں اور مسکرا بھی رہے ہیں— ہم ان کے بغیر بھی زندہ ہیں، ایک زمانے میں جن کے گم ہونے کا تصور بھی محال تھا— مگر دیکھو تو...... آج ہم زندہ ہیں کہ نہیں......؟'

(۲)

حالانکہ اس طرح کے موضوعات پر گفتگو کی گنجائش کم ہی پیدا ہوتی تھی مگر میں جانتی تھی، گمشدگی کا کوئی بھی واقعہ اُسے پریشان کر جاتا ہے— سیلاب میں کسی شہر یا گاؤں کا گم ہونا...... یا مثال کے لیے پرانی عمارتوں کی جگہ نئی عمارتوں کا بننا، یا مثال کے لیے جب اُس کے پرانے گھر کا بٹوارہ ہوا...... تو وہ نئی عمارت کے بن جانے تک بہت دنوں تک اداس رہا— وہ اشارہ کرتا تھا— وہاں ہم کھیلا کرتے تھے— اور اُس جگہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا— وہ وہاں پڑھائی کرتا تھا— اور دیکھو— وہ بالائی منزل پر دائیں طرف والا کمرہ— وہاں

ایک زمانے تک داداحضور اور ابا حضور کی کتابیں ہوا کرتی تھیں — اب یہ جگہ بھائیوں کے حصے میں چلی گئی...... اور مثال کے لیے وہ مسکرانے کی کوشش میں کہا کرتا کہ ایک دن اُسے علاؤالدین کا چراغ ملے گا...... اور دیکھنا تمام پرانی چیزیں اصل حالت میں لوٹ آئیں گی...... وہ مسکرا کر کہتا...... ایف آئی آر درج کراتے ہیں — میں پوچھتی — ایف آئی آر میں کیا لکھواؤ گے — اُس کی آنکھوں میں بچپن کا عکس لہراتا — وہ مسکراتے ہوئے گویا ہوتا...... کچھ بھی لکھوا دوں گا...... ایک پرانا شیونگ کٹس، میری بائیسکل، جسے میں چھوٹی عمر میں چلایا کرتا تھا — اور میرے بڑے ہونے کے بعد بھی اسٹور روم میں محفوظ تھی — ایک لکڑی کا بلاّ، جسے کچھ دنوں تک میں نے کرکٹ کے طور پر استعمال کیا...... اور تمہارے ہونے کا مکمل احساس جو وہیں رہ گیا ہے...... تمہیں یاد ہے سارہ...... جب پہلی بار شادی کر کے تم گھر آئی تھیں...... تمہیں یاد ہے......

'تو وہ مکمل احساس اب تمہارا حصہ نہیں —'

اُس کی آنکھوں میں اچانک بہاروں کی جگہ خزاں لرزتی ہوئی نظر آئی...... وہ گلزار کے لفظوں میں آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا...... آدھا بھیگا پن وہیں رہ گیا...... آدھا میں اپنے ساتھ لے آیا — آدھے، بیقرار رت جگوں کے شکارے وہیں رہ گئے — آدھے میرے ساتھ آ گئے...... آدھی سارہ وہیں رہ گئی...... وہ دبلی پتلی سی — دوڑ کر میری پیٹھ پر سوار ہو جانے والی...... اور یاد ہے سارہ...... وہاں بڑی بڑی سیڑھیاں تھیں — اور میں تمہیں گود میں اٹھا کر سیڑھیوں سے ہوتا ہوا چھت پر لے جاتا تھا...... میرا بھی آدھا سرمایہ وہیں رہ گیا — آدھا میں اپنے ساتھ لے آیا......'

دھند بڑھ گئی ہے...... پاشا نہیں ہے۔ چاروں طرف کتابوں کے درمیان صرف ایک اداس موسیقی کی گونج رہ گئی ہے۔ میں اچانک چونک گئی ہوں...... وہ وہیں ہے...... اپنی کرسی پر موجود...... میں اسے دیکھ سکتی ہوں...... اس کے ہاتھوں میں ابھی بھی سگریٹ کا آدھا ٹکڑا ہے...... وہ شاید کچھ سوچ رہا ہے...... ممکن ہے، کچھ لکھنا چاہتا ہو...... کیا وہ سچ مچ ہے یا میرا وہم...... کیا میں آگے بڑھ کر اسے پہلے کی طرح چھو سکتی ہوں...... وہ ہے...... یا وہ نہیں ہے...... ہونے اور نہ ہونے کے درمیان میں اس دھند کا احساس کر سکتی ہوں جو تیزی سے کمرے میں پھیل رہی ہے...... پہلے کتابیں غائب ہوئیں...... پھر وہ کرسی بھی...... میں دھند اور تاریکی کے درمیان معلق ہوں...... میں پاشا کو آواز دینا چاہتی ہوں...... مگر میں ٹھہر گئی ہوں...... یہ وہ لمحہ ہے جہاں میں دھند میں تیر رہی ہوں...... یا رقص کر رہی ہوں......

سینہ خواہم شرح شرح از فراق
تا بگویم شرحِ دردِ اشتیاق

وصال کے اس ٹھہرے ہوئے لمحے میں، میں ہونے اور نہ ہونے کی منزلوں سے دور نکل آئی ہوں۔

زندگی بلیو وہیل سے زیادہ خطرناک ہے

وہ مر گیا ہے اور اس کا آخری خط میرے ہاتھوں میں ہے

(۱)

دوستو! جیسا آپ نے دیکھا۔ یہ میری ممی تھی۔ عام ممیوں جیسی ہی ایک ممی۔ دنیا چاہے جس قدر آگے بڑھ جائے، یہ ممیاں وہیں رہتی ہیں۔ ان ممیوں کی اپنی ایک دنیا ہوتی ہے۔ اور زیادہ تر ممیاں اپنی اس دنیا سے باہر نہیں نکلتیں۔ سوشل میڈیا، وہاٹس ایپ، فیس بک اور ٹویٹر کی دنیا میں قدم رکھنے کے باوجود یہ ممیاں ایک جذباتی قید خانے میں قید رہتی ہیں۔ قید خانہ، دراصل یہ قید خانہ بھی انہی کا آباد کیا ہوا ہوتا ہے۔ اور حقیقت اس سے مختلف نہیں کہ وہ ان قید خانوں سے باہر نہیں نکلنا چاہتیں۔ میں اپنے دوستوں کی ایسی ممیوں سے بھی واقف ہوں جو باہر کی دنیاؤں میں چاہے جس قدر آزاد ہوں لیکن گھر کی چہار دیواری میں قدم رکھنے کے بعد وہ عام زندگی میں لوٹ آتی ہیں۔ یعنی ایک معمولی سی ممی۔ پزا، برگر یا شوہر اور بچوں کے کھانے کے بارے میں سوچتی ہوئی۔ جم یا یوگا کرتے ہوئے بھی فیس بک فرینڈس، لوافیئرس اور موبائل چھپاتے ہوئے بھی ان کی دنیا اپنے گھر کی مخصوص دنیا کے درمیان ٹھہری ہوتی ہے۔

مثال کے لیے بار بار ممی کا اس طرح کمرے میں آنا یا آواز دینا مجھے برا لگتا ہے۔ وہ بار بار آواز دیتی ہوئی میرے کمرے میں آجاتی ہیں۔ ادھر کچھ دنوں سے ڈیڈ کے انتقال کے بعد انہوں نے گلاس یعنی چشمہ لگانا بھی شروع کر دیا ہے۔ یہ ایک پرانے ماڈل کا گلاس ہے، جو مجھے ذرا بھی پسند نہیں۔ اور یہ ممی کی پوری آنکھوں کو گھیر کر سنجیدہ بنا دیتا ہے۔ مجھے اکثر لگتا ہے۔ چشمہ کے، شیشے کے گھیرے میں دو پتلیاں ہیں اور یہاں پھر مجھے اسٹیو جابس کی یاد آتی ہے، جس نے کہا تھا، ڈیزائن صرف یہ نہیں ہے کہ چیز کیسی دکھتی یا محسوس ہوتی ہے، ڈیزائن یہ ہے کہ چیز کام کیسے کرتی ہے...... اس لیے معاملہ صرف ممی کے چشمہ کا نہیں ہے۔ اس چشمے کے فریم سے جھانکتی دو پتلیوں کا ہے...... یہ پتلیاں، جیسا کہ مجھے احساس ہے، ماضی، حال اور مستقبل میں ایک ساتھ دیکھ سکتی ہیں۔ مجھ سے باتیں کرتے ہوئے بھی یہ آنکھیں ماضی کے فریم میں گم ڈیڈ کے ساتھ بھی ہوتی ہیں۔ اور اس لمحہ میرے ساتھ بھی کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ اور میرے ساتھ رہ کر اس مستقبل کو بھی دیکھ رہی ہوتی ہیں، جس پر میرا یقین نہیں ہے۔ یعنی اگر زندہ رہنے کے لیے ایک حال آپ کے پاس ہے تو آپ کو اس حال یعنی پریزنٹ کو انجوائے کرنا ہے، اور آپ بہت زیادہ مستقبل سے وابستہ ہوتے ہیں تو اپنے حال کو ہی گم کر دیتے ہیں—— اور جیسا کہ اسٹیو جابس نے کہا کہ جب آپ سمندری ڈاکو بن سکتے ہیں تو نیوی میں جانے کی کیا ضرورت ہے—— مجھے یقین ہے، میں سمندری ڈاکو نہیں بن سکتا...... اور اس بات پر بھی یقین کہ میں آرمی یا نیوی میں بھی نہیں جا سکتا۔ اور یقین کے ساتھ کہ اس وقت ڈیڈ ہوتے تو وہ اس بات پر زبردست قہقہہ لگاتے...... کیوں؟ سمندری ڈاکو کیوں نہیں ہو سکتے۔ اس کے لیے بہادر ہونا ہوتا ہے۔ اور جو تم نہیں ہو پاشا...... تم ایک

چوہے یا باتھ روم کے کاکروچ سے بھی ڈر جاتے ہو......اور یقینی طور پر ممی ناگوار سا منہ بنا کر کر ڈیڈ کو اپنا جواب سنا دیتیں۔ آپ ہر بار پاشا کو کمزور کرتے ہیں۔ اور ایک دن وہ سمندری ڈاکو بن کر دکھائے گا۔ پھر ممی کو خود ہی اپنی بات کمزور لگتی۔ وہ ہنس کر کہتیں......وہ سمندری ڈاکو کیوں بنے گا۔ خدا نہ کرے۔ لیکن پاشا وہ بنے گا، جو تم نہیں بن سکے۔ اور تم ساری زندگی نہیں بن سکتے۔ اور اس کے بعد جیسا ہمیشہ ہوتا آیا ہے، ڈیڈ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلے جاتے......

◆◆

ایک زندگی سے، ایک مختصر زندگی سے بھی وابستہ ہزاروں کہانیاں ہوتی ہیں اور ان کہانیوں سے دکھ سکھ کے سانپ بھی لپٹے ہوتے ہیں۔ مگر آخر ایسا کیا ہے کہ ڈیڈ مرنے کے بعد بھی میرے ذہن پر حکومت نہیں کر سکے؟ نیتی میری دوست ہے۔ نیتی سکسینہ—وہ اکثر میری باتوں میں برس پڑتی ہے......

'تم پاگل ہو......'

'اور تم ایک ایموشنل اتیاچار......' میں ہنسنا چاہتا ہوں......

'تم ایک روڈیز ہو......ایک پاگل روڈی......نئی تہذیب میں بہتا ہوا جو یہ بھول گیا ہے کہ کوئی اب نہیں ہے......وہ کوئی، جس سے نفرت کرنے کا تمہیں حق نہیں ہے۔'

'کیوں نہیں۔ اور یہ نئی تہذیب کیا ہے—؟' یہاں میں ان گالیوں کا ذکر نہیں کر سکتا جو ایسے موقع پر میں نیتی کو دینے کا عادی رہا ہوں—یہ ہمارے کالج کلچر کا ایک حصہ ہے اور نیتی بھی ایسی رف ٹف گالیوں کا برا نہیں مانتی۔ مگر میرے منہ سے غیر جذباتی باتوں کو سن کر اس کا چہرہ بن جاتا ہے۔

جیسے اس نے کہا۔ میں نہیں مانتی کہ ایک دن میرے ڈیڈ نہیں ہوں گے۔'

'لیکن ایسا ہوگا۔ اور بہت جلد ہوگا......'

گیٹ لاسٹ۔ اسٹوپڈ......وہ زور سے چیخی۔ میں تمہارے جیسی نہیں ہوں۔ میں ڈیڈ ممی دونوں سے پیار کرتی ہوں۔'

'لیکن تم ہی کہتی ہو کہ تمہارے ڈیڈ ہائپر ٹینشن اور شوگر کے مریض ہیں......؟'

'تو کیا ہوا۔ وہ زندہ ہیں۔ وہ مرے تو نہیں۔'

'یہ زندہ لوگوں کو اس قدر سینے سے کیوں لگا کر رکھتی ہو۔؟'

'پاگل ہو تم۔ مینٹل بھی۔' وہ پھر زور سے چیخی۔

لیکن اس بار میں بھی زور سے چیخا—'کنٹرول یور سیلف بے بی۔ جو ہے وہ جائے گا۔ ہم فول نہیں ہیں۔ فول انجوائے نہیں کرتے۔ یہ فول ایک ایٹو پیا میں جیتے ہیں۔ پھول مرجھاتے ہیں۔ چاند رات میں غائب ہو جاتا ہے۔ گھر پرانا ہو جاتا ہے۔ ایک دن کرکٹ کا بلاّ بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ فٹ بال کی چمڑی پھٹ جاتی ہے۔ اور انسان مر جاتا ہے۔ پھر انسان کے مرنے پر اتنا واویلا کیوں؟'

'کیونکہ انسان فٹ بال کی چمڑی نہیں ہے۔ کرکٹ کا بلا نہیں ہے۔ رات میں غائب ہونے والا چاند بھی نہیں۔ اسٹوپڈ۔ فیملی کا ساتھ ایٹو پیا میں جینا نہیں ہے۔ تم جانتے ہی نہیں کہ جینا کیا ہوتا ہے۔ فیملی کیا ہوتی ہے۔ جو زندہ ہیں، میں ان کی دھڑکنوں کے ساتھ اس لیے جیتی ہوں کہ ان دھڑکنوں کو محسوس کرتی ہوں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ ایک دن ڈیڈ نہیں ہوں گے۔ یا ایک دن مام نہیں ہوں گی......میں یہ تصور بھی نہیں کر سکتی۔'

نیتی کے جانے کے بعد بھی گھنٹوں یہ سوچ مجھ پر حاوی رہتی ہے۔ چیونگم یا چاکلیٹ چباتے ہوئے یا کینٹین سے برگر یا پزا پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے میرے لیے سوچنا مشکل ہوتا ہے کہ مجھ میں اور نیتی سکسینہ میں کیا فرق ہے؟ نیتی کیوں ایسا سوچتی ہے۔ اور میں کیوں نہیں ایسا سوچتا—اور یہاں کالج فرینڈس میں صرف نیتی ہی واحد لڑکی ہے جو ایسا سوچتی ہے۔ باقی فرینڈس ماں باپ کے گلے شکوے اور برائی کرنے کا بہانہ تلاش کرتے ہیں۔ جیسے ایمل ڈیڈ کو فراڈ کہتا ہے۔ راگھو، کرپٹ، تنیش، ایک نمبر کا باسٹرڈ، روی سلم ڈاگ......اور ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو پیرنٹس کا نام احترام سے لیتا ہوں......پھر یہ نیتی مجھ پر ہی غصہ کیوں کرتی ہے......؟

میں سوالوں کے اس جھولے پر سوار ہوں، جہاں ہر جواب کو میں نے ایک بلیک ہول میں پھینک دیا ہے۔ اور میں نہیں چاہتا کہ اس بلیک ہول سے خوفناک جوابات باہر آ کر میرے وجود کو ریزہ ریزہ یا زخمی کر ڈالیں۔ تو کیا میں فرار چاہتا ہوں......؟ جیسا کہ ممی، ڈیڈ کی زندگی میں بار بار کہتی رہیں کہ ڈیڈ فرار چاہتے ہیں۔ خود سے بھی۔ گھر سے بھی— کیا مفرور طبیعت کا یہ جین یا ڈی این اے مجھے ڈیڈ سے ورثے میں ملا ہے— میرا بس چلتا تو میں اس ڈی این اے کو اپنی زندگی سے کھرچ کر الگ کر دیتا۔ مگر ظاہر ہے، ایسا میں نہیں کر سکتا اور ایسے دور میں جہاں ڈائناسور اور قدیم جانوروں کے ڈی این اے سے سائنس پورا جوراسک پارک تیار کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو، میں اس رشتے کے ڈی این اے کی کہانی لکھ رہا ہوں، جس میں میری ذرا بھی دلچسپی نہیں ہے—اور جیسا کہ کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے، زندگی ایک ایسی ڈسکوری ہے کہ زندگی کو اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔ لیکن اس بات سے بھی کئی پہلو نکلتے ہیں۔

ریمنڈ زندہ ہوتا تو کہتا....زندگی کیہر ڈسکوری بلیو وہیل کی طرف جاتی ہے۔ ایک دن ہم اس کے جبڑے میں سما جاتے ہیں۔

(۲)

......اور کتنی عجیب بات ہم اپنے آپ کو ہی ڈسکور کرتے ہیں اور لگاتار کرتے رہتے ہیں۔ پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو ہی کاٹتے چلے جاتے ہیں......جیسے تیز دھار کا بلیڈ یا قینچی ہوتی ہے۔ یہ اذیت ناک ہوتا ہے۔ لیکن بچپن سے ہی یہ اذیت ہمیں پسند ہوتی ہے......ممی......سارہ جہانگیر کہتی ہیں......تم کچھ نہیں جانتے......اور ابھی کچھ بھی جاننے کے لیے تمہاری عمر بہت کم ہے......ممی کی باتوں پر ہنسنے کو دل چاہتا ہے کہ ہم تو اتنا کچھ جانتے ہیں کہ آپ شاید اس بارے میں سوچ بھی نہیں پائیں......ٹھہریے—اور جیسا کہ اس ماڈرن ڈیڈ کے ساتھ ہوا تھا، جسے خیال آیا کہ اب وہ وقت آ چکا ہے جب اپنے پندرہ سالہ بیٹے کو سیکس ایجوکیشن کے بارے میں بتایا جائے۔ وہ سنجیدہ ہو کر اپنے بیٹے کے کمرے میں آیا تو بیٹا اس وقت بھی لیپ ٹاپ پر چپکا ہوا تھا......

باپ نے بے حد سنجیدہ چہرے کے ساتھ بیٹے سے کہا......اب وہ وقت آ گیا ہے جب تم سے سیکس کے بارے میں پوچھا جا سکتا ہے......اور بیٹے نے بیبا کی سے جواب دیا......تو پوچھیے نا ڈیڈ...... مجھے خوشی ہوگی۔ آپ سیکس کے بارے میں کیا جاننا چاہتے ہیں......؟

اور جیسا کہ نیتی سکسینہ کہتی ہے......ایک نئی دنیا ہمارے تعاقب میں ہوتی ہے......ہمیں دنیا کے پیچھے نہیں جانا ہوتا......اور یہاں ڈیڈ کو یاد کرنا مجبوری ہے جو کہا کرتے تھے کہ ہمارے پاس کھونے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اور اس لیے ہم جو اپنی محنت سے پاتے ہیں، وہ ہمارا بونس ہے......

وہ تیز دھار بلیڈ یا قینچی ابھی اس لمحہ بھی میرے ہاتھ میں ہے اور آپ میرے کمرے میں آئیں تو اس وقت میرا کمرہ کسی سونامی یا زلزلہ کی کہانی سناتا ہوا نظر آئے گا۔ وائی فائی کا کنکشن نکلا ہوا ہے۔ وارڈ روب سے سارے کپڑے زمین پر پھیلے ہوئے ہیں۔ میز پر لیپ ٹاپ کھلا ہے۔ کتابیں بکھری ہوئی ہیں...... میں ریوالونگ چیئر پر جھول رہا ہوں، اور اپنے اندر کی چیخیں سن رہا ہوں۔ اور کتنی عجیب بات کہ اس لمحہ میں خود کو ڈسکور کرنا بھول گیا ہوں۔ اور یہی وہ لمحہ تھا جب ڈیڈ کے کمرے سے نکلتی ہوئی ممی میرے سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہیں...... وہ حیرانی سے بکھرے ہوئے کمرے کو دیکھ رہی ہیں۔ ان کے چشمہ کے اندر سے جھانکتی پتلیوں میں ناراضی ہے۔

'یہ کیا پاشا۔ کمرے کی کیا یہ حالت بنالی......؟'

'یہ مجھے پسند ہے......'

'یہ بکھراؤ......؟'

'ہاں۔'

'جانتے ہو......ڈیڈ کیا کرتے تھے......؟'

'وہ زمین پر پھینکے گئے ریپر، اور کاغذ کو چنتے رہتے تھے......'

'لیکن ڈسٹ بن میں ڈالنے کے لیے...... کیونکہ ان کو گندگی پسند نہیں تھی۔'

'ان کے لیے ہم بھی ریپر تھے یا بیکار کے کاغذ— ڈسٹ بن بڑا ہوتا تو شاید وہ ہمیں بھی ڈسٹ بن میں ڈال چکے ہوتے۔'

سارہ جہانگیر نے پوری طاقت لگا کر غصہ سے کہا— بند کرو۔ ڈیڈ کے خلاف بولنا۔ تم جانتے ہی نہیں کہ وہ کیا تھے۔'

'اور میں یہ جاننا بھی نہیں چاہتا۔'

'ہاں تم جاننا بھی نہیں چاہتے......'

سارہ جہانگیر کی آنکھیں اب بھی کمرے کے بکھراؤ کا معائنہ کر رہی تھیں......لیکن تم کو جاننا چاہیے۔ اور شاید اس کے لیے اب وہ وقت آچکا ہے......' ان کی آنکھوں میں نمی تھی۔ جانتے ہو ہم کیا کرتے تھے......تب ہم چھوٹے تھے۔ اور میرا دعویٰ ہے، اس عمر میں دنیا کا ہر ننھا بچہ یہی کرتا ہوگا...... ہر ننھی بچی یہی کرتی ہوگی۔'

'مگر کیا......'

'تنہا ہوتے ہی ہم ان دیکھے خداؤں کی بارگاہ میں ہوتے تھے کہ ہمارے پیرنٹس کبھی بیمار نہ ہوں۔ کبھی زخمی نہ ہوں۔ اور کبھی انہیں خدا اپنے پاس نہ بلانا......'

'تم لوگ فریبی اور مکار دنیاؤں میں ہوتے تھے۔ ایسی دنیا کا فائدہ بھی کیا ہے......اور کون جانتا ہے ممی کہ تم پہلے جاؤ گی یا میں......'

'شٹ اپ۔' سارہ جہانگیر کا غصہ اب بھی سرد نہیں ہوا تھا۔ وہ بار بار چیخ رہی تھیں......تم پاگل ہو پاشا......کوئی اپنے ڈیڈ سے بھلا اتنی شدید نفرت کیسے کر سکتا ہے۔'

اور یہی لمحہ تھا، جب میں نے انہیں روتے ہوئے دیکھا۔ وہ آنسو خشک کر رہی تھیں......

'وہ اس دنیا کے سب سے لاجواب ہسبنڈ تھے۔ اور شاید سب سے ناکام باپ۔ انہیں زندگی کو جینا نہیں آیا۔ اور اس دنیا میں ایسے لوگ اب ہیں ہی نہیں، جنہیں جینا نہیں آتا۔ لیکن......تمہارے ڈیڈ واحد تھے، جنہیں جینا نہیں آتا تھا۔ اور ہم چاہتے تھے کہ وہ

دوسروں کی طرح جینا سیکھ جائیں۔ مگر وہ دوسروں کی طرح کیسے ہو سکتے تھے......؟ اور وہ نہیں ہو سکے......' سارہ جہانگیر اپنے آنسو خشک کر رہی تھیں۔ اور اسی لیے......اور اس لیے پاشا تمہارے اندر نفرت کی تہیں بیٹھتی چلی گئیں۔ خیر......'

میں اس وقت ایک ضروری کام سے تمہارے پاس آئی ہوں...... میں کئی دنوں سے الجھی ہوئی تھی۔'

میں ممی کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ یہ چہرہ یا تو سپاٹ تھا یا اس وقت چہرے پر ابھری ہوئی جذباتی لکیریں مجھے نظر نہیں آ رہی تھیں......

'میں نہیں جانتی کہ تم ڈیڈ کے بارے میں کیا سوچتے ہو۔ اور کیوں سوچتے ہو۔ مگر وہ تنہائی میں بہت سی باتیں کیا کرتے تھے۔ کچھ ایسی باتیں بھی جو میں تم کو بتا نہیں سکتی۔ ہاں مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ انہوں نے اپنی مکمل زندگی میں کچھ باتیں مجھ سے چھپالی تھیں۔ اور دو چار بار میں نے ان کے جھوٹ کو پکڑا بھی تھا......شاید...... میں تم کو سمجھا نہیں پاؤں......مگر یہ سچ ہے۔ تب وہ ہارے ہوئے کھلاڑی کی طرح نہیں ہوتے تھے۔ وہ گلاس اتار دیتے تھے اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتے......کبھی کبھی مرد ہو جانا برا ہوتا ہے۔ کیونکہ مرد ہونا ایک خوفناک ایجاد بھی ہے اور خیال بھی......ایجاد اس لیے کہ آپ نہیں جانتے کہ اس مشین سے اگلے لمحے آپ کیا کام لینے والے ہیں......؟'

سارہ جہانگیر کا چہرہ اس وقت شعلوں کی لپٹوں میں گم تھا۔ شاید میں ایسی کچھ کہانیوں کا گواہ رہا تھا۔ ایسی کچھ کہانیاں، جنہوں نے ایک باپ کے وقار کو مجروح کیا تھا۔ مگر شاید تب سوچنے کے لیے میری عمر کافی کم تھی۔ کیا واقعی ایک باپ کے پاس وقار یا ڈگنیٹی ہونی چاہیے—؟ اس وقار سے الگ بھی وہ ایک جسم یا مرد ہوتا ہے، یا ہو سکتا ہے، میں سمجھنے سے قاصر تھا— مگر اس وقت اس لمحے میری آنکھیں غور سے ممی کو دیکھ رہی تھیں......سارہ جہانگیر کی آنکھیں چھت کو دیکھ رہی تھیں......

'مگر اس کے باوجود...... میں کہہ سکتی ہوں وہ ایک معصوم مرد تھا۔ ایک بیحد پیار کرنے والا باپ بھی مگر وہ اپنی خامیوں اور کمیوں سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا، وہ اپنے بیٹے کو وہ سب کچھ نہیں دے سکتا، جس کی اس کو ضرورت ہے مگر صرف اس لیے کہ وہ ان ضرورتوں کو پورا کرنے میں ناکام تھا، ہم اسے برا نہیں ٹھہرا سکتے۔ یا اس کے مرجانے پر اس پر الزاموں کی بارش نہیں کر سکتے...... وہ دوسروں سے بہت الگ تھا۔ مگر...... یہ سچ ہے...... وہ مرد بھی تھا۔ اور میں بھی کئی کئی موقعوں پر یہ بھول جاتی تھی کہ وہ صرف شوہر نہیں ہے۔ مرد بھی ہے......اور کون کہہ سکتا تھا کہ اچانک اس طرح وہ ہمیں چھوڑ کر چلا جائے گا......'

سارہ جہانگیر کی آنکھیں دوبارہ نم ہو گئی تھیں، آواز میں لرزش تھی......

'تم سمجھ رہے ہو نا، پاشا۔'

'اچھی طرح......اور یہ کہ تم ناحق ایک مردے کی سفارش لے کر آئی ہو۔'

'مردہ...... ہاں۔ وہ مر چکا ہے۔ وہ نہیں ہے۔ ناحق...... ناحق ہی میں اسے محسوس کرتی ہوں۔ چلتے پھرتے۔ اٹھتے بیٹھتے۔ اور تم نہیں کرتے۔ یہ تمہارا سچ ہے۔'

'یقین کے ساتھ میرا سچ۔ اور یہ بھی کہ تمہاری ان جذباتی سفارشوں کے باوجود میں اسے پیار نہیں کر پاؤں گا۔'

'جانتی ہوں۔ مجھے یقین ہے۔'

........اور اسی لمحہ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر ایک پیکٹ میرے ہاتھوں میں رکھ دیا۔ مجھے تعجب ہے کہ ڈیڈ کے کمرے سے جس وقت وہ میرے کمرے میں داخل ہوئیں، یہ پیکٹ میں نہیں دیکھ پایا تھا، مگر یہ پیکٹ ظاہر ہے، اس وقت بھی ان کے ہاتھوں میں ہوگا اور کس خوبصورتی سے، اتنی دیر کی گفتگو میں یہ پیکٹ انہوں نے مجھ سے پوشیدہ رکھا تھا۔

'یہ کیا ہے۔'

'مرنے سے پہلے تمہارے ڈیڈ نے یہ پیکٹ مجھے دیا تھا۔شاید یہ ان کی ڈائری ہے۔میں اکثر انہیں رات رات بھر لکھتے ہوئے دیکھا کرتی تھی۔مرنے سے پہلے انہوں نے مجھے کہا تھا۔جب تم ۲۰ سال کے ہو جاؤ......انہوں نے لرزتے ہوئے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ جب تم ۲۰ سال کے ہو جاؤ،تب ہی میں یہ ڈائری تمہارے حوالہ کروں......'

'لیکن پہلے کیوں نہیں—؟ انہیں مرے ہوئے دو سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔'

'ہاں۔ممکن ہے،انہیں اس بات کا احساس ہو کہ دو برس میں......'

سارہ جہانگیر کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں— 'شاید تم زیادہ بالغ اور سمجھ دار ہو جاؤ۔یا شاید ان کے لیے جو نفرت تمہارے وجود میں ہے،اس میں کمی ہو جائے۔مگر یہ ڈائری تمہارے لیے ہے......'

'کیا تم نے......؟'

'نہیں—میں چاہتی تھی۔مگر مرنے سے پہلے تمہارے ڈیڈ نے ایسا کوئی اشارہ نہیں کیا تھا کہ اس ڈائری کو مجھے بھی پڑھنا ہے۔انہوں نے صرف تمہارا نام لیا ہے۔یہ جو بھی ہے۔تمہارے لیے ہے.....اور میرا خیال ہے،نفرت کی گرد کچھ موقعوں کے لیے ہٹا کر تمہیں اس ڈائری کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

اتنا کہہ کر سارہ جہانگیر کمرے سے باہر نکل گئی تھیں۔

◆◆

فرینڈس،میں نہیں جانتا تھا یہ سب پڑھتے ہوئے آپ میرے جیسے بچوں کے بارے میں کیا نظریہ قائم کر رہے ہیں۔مگر کوئی بھی نظریہ ابھی قائم کرنا جلد بازی ہوگی۔جیسے میں نے جب تک ڈیڈ کے خط کو شروع نہیں کیا تھا،میں اسی نظریہ پر قائم ودائم تھا،جو ڈیڈ کی زندگی میں قائم کیا تھا— مگر خط کی شروعات نے جیسے مجھے دھاکوں کے درمیان لا کر کھڑا کر دیا۔وہ ایک ڈھلتی ہوئی دوپہر تھی۔ایک بیکار دوپہر۔اور اس دن سب کچھ میری امیدوں کے خلاف ہو رہا تھا۔

سارہ جہانگیر کا آخری بیان

میں یہاں سے آپ کے درمیان سے رخصت ہو رہی ہوں۔اور یہ سچ ہے کہ آئندہ جو داستان آپ سننے جا رہے ہیں،اسے سنانے اور آپ تک پہنچانے کی ذمہ داری میرے بیٹے یعنی پاشا مرزا نے قبول کی ہے۔اور آپ غور کریں تو یہ کارنامہ بھی میری خوبصورت سازش کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے،جسے پاشا مرزا سمجھنے سے انجان رہا۔یعنی زندگی کے زیادہ تر لمحوں میں وہ اپنے ڈیڈ کے ساتھ نہیں رہا۔مگر ان لمحات میں،جب وہ اپنے ڈیڈ کی ڈائری کے بوجھل یا دلچسپ صفحات سے گزر رہا ہوگا،میں تسلیم کرتی ہوں،اس کا زیادہ اور شاندار وقت اپنے ڈیڈ کے ساتھ گزرے گا—اور شاید یہی میں چاہتی ہوں۔مجھے نہیں معلوم کہ جہانگیر مرزا نے مجھے اپنی ڈائری پڑھنے کی منظوری

کیوں نہیں دی۔ ممکن ہے کئی ایسی باتیں ہوں، جو وہ صرف اپنے بیٹے کے ساتھ ہی شیئر کرنا چاہتا ہوگا۔ اور مجھے اس سچ کو قبول کرنا چاہیے کہ بہت زیادہ پیار کرنے یا دکھانے کے باوجود وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں اس کی زندگی کے خاموش صفحوں میں جھانک سکوں۔ میرا ایسا کوئی ارادہ بھی نہیں۔ اور جب وہ نہیں ہے تو میں اس کے بارے میں کچھ بھی غلط سوچ کر خود کو پریشان کرنا نہیں چاہتی...... اور آئندہ صفحات میں آپ جو کچھ بھی پڑھیں گے، شاید وہ مجھ سے بھی راز ہی رہے گا۔ اور یہ میرے بیٹے پاشا مرزا پر ہے کہ ڈائری کی کچھ خوفناک حقیقتوں کا سامنا وہ مجھ سے کراتا ہے یا نہیں— خوفناک حقیقتیں...... یہ بھی ایک نفسیاتی پیچ ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ اس بارے میں مجھے نہیں سوچنا چاہیے۔ یعنی اگر جہانگیر کی زندگی سے وابستہ کچھ ایسی حقیقتیں رہی ہوں، تو وہ اس بات کا خواہشمند کیوں ہے کہ اس کا بیٹا جان لے، مگر اس حقیقت کی رسائی اس کی ماں تک نہ ہو— عام طور پر انسانی نفسیات یہ کہتی ہے کہ زیادہ تر باپ ہمارے معاشرے میں ایسے ہوتے ہیں جو کڑوی اور تلخ حقیقتوں کو اپنے بیٹوں کے سامنے بے نقاب کرنا نہیں چاہتے۔ اگر کوئی ایسی حقیقت ہے تو جہانگیر مرزا نے مرنے کے دو برس تک یہ راز کیوں رکھا؟ اور محض دو برس بعد ہی بیٹے کو اپنی زندگی کے قید خانے میں اترنے یا جھانکنے کی اجازت کیوں دی۔؟

میں تسلیم کرتی ہوں کہ انسانی زندگی ابھی بھی ایسا معمہ ہے جسے نہ سمجھا جا سکتا ہے اور نہ سمجھایا جا سکتا ہے۔ اور میں سمجھتی ہوں، موت زندگی کی ایجاد نہیں ہے۔ موت میرے لیے ایک دہشت ہے اور اصل دہشت زندگی کا طلسمی انداز ہے— جادوئی انداز سے ایک مکمل زندگی تبدیل ہو رہی ہے۔ ہم ایک ایسے دور کے گواہ ہیں جہاں بڑے بڑے پیسے والے لوگ سو سے زیادہ عمر یا کبھی نہ مرنے کے جادوئی نسخوں پر کروڑوں اور اربوں روپے کا سرمایہ خرچ کر رہے ہیں۔ امید بھی جادو اور زندگی بھی— اور جہانگیر مرزا اس الجھی الجھی زندگی کے اندر چھپی ہوئی موت کو بھی مسکراتے ہوئے دریافت کر لیتا تھا۔ اور کسی کے بھی مرنے پر اس کا معصوم ردعمل ہوتا...... ایک بہتر آدمی۔ صفحۂ ہستی سے نکل کر ایک بہتر وجود، عدم کے لیے روانہ ہو گیا...... مگر دیکھو تو سارہ...... وہ ہے...... اسے تلاش تو کرو...... وہ مل جائے گا......'

.... اور اسی لیے جیسا کہ پچھلے مکالموں میں، میں نے پاشا مرزا سے کہا تھا...... وہ ہے...... اور ہمیں اس کو تلاش کرنا چاہیے۔ اور پاشا کا ردعمل ہمیشہ کی طرح مذاق اڑانے والا تھا...... میں اکثر سوچتی ہوں کہ موت کی جنگ کیا ماڈرن سائنس کے ذریعہ جیتی جا سکتی ہے—؟ اور اگر یہ ممکن ہوتا تو...... اور جیسا میں نے پچھلے صفحات میں بتایا کہ ایک صبح اچانک وہ بستر سے اٹھا...... اور وہ گم ہو گیا...... اور اس کے باوجود وہ اپنے کمرے میں تھا۔ بیڈروم میں تھا۔ لکھنے کی میز پر تھا۔ اپنی ریوالنگ چیئر پر تھا اور میں محسوس کرتی تھی، فلیٹ کی دیواروں میں، دروازوں، کھڑکیوں میں، سوراخوں میں، روشن دانوں میں ابھی بھی اس کی آواز محفوظ ہے۔ اور جیسا کہ وہ بھی دہرایا کرتا تھا۔ ہم کھو جاتے ہیں مگر کائنات ایک ندی کی مثل ہے تو ہماری آوازیں اس کی نازک سطح پر تیرتی ہوئی مل جائیں گی...... اور وہ مسکرا کر کہتا...... میری پیاری سارہ...... ذرا تم آواز تو لگا کر دیکھو میری جان۔ اور کیا پتہ...... میرے گم ہو جانے کے بعد، تمہارے آواز لگانے پر اگر کسی انجانے دریچے سے میں گنگناتا ہوا نکل آیا تو تم کہیں خوفزدہ نہ ہو جاؤ......

اور کسی بے حد عام آدمی کی طرح جہانگیر مرزا اس سچ سے واقف تھا کہ اس نے اپنے بیٹے کو کھو دیا ہے۔ کیا عام زندگی میں اس سے بڑا کوئی حادثہ ہو سکتا ہے—؟ ایک بیحد پیار کرنے والے باپ کو اچانک اس بات کا احساس ہو کہ ہوش سنبھالتے ہی اس کے بیٹے میں ایک باغی بیٹے کی واپسی ہو گئی ہے۔ ایک ایسے باغی بیٹے کی، جو ہر لمحہ اس سے دور ہوا جا رہا ہے۔ ایک بیحد پیار کرنے والے شفیق باپ کے لیے، کہ وہ اس حقیقت سے واقف ہو کہ اس کی چادر چھوٹی ہے۔ بہت سے دوسرے باپوں کی طرح...... اور بیٹے کی لمبی ہوتی فرمائشوں میں وہ ایک ایسے اپاہج انسان کی طرح ہے، جو اپنی کمزوریوں سے بھی واقف ہے اور اپنی مقررہ حد سے بھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنی خوشیوں میں سیندھ لگاتا ہوا اکثر پرواز کرنے کی کوشش کرتا تھا اور میں دیکھتی رہ جاتی تھی کہ اس پرواز میں اکثر اس کے پر

جل جاتے ہیں۔
میں تسلیم کرتی ہوں کہ یہ زندگی الجھی ہوئی پہیلی یا ان قدیم ہندوستانی کتابوں کی طرح رہی ہے جن کے بوسیدہ صفحوں پر ایک ساتھ ہی علم الحساب سے کوئی مشکل سوال یا غزلوں، گیتوں کے ٹکڑے ڈال دیے جاتے تھے اور اس پہیلی یا معمہ میں زندگی کے جواب پوشیدہ ہوتے تھے۔ ایسا کچھ سلسلہ دیوان حافظ یا ان کتابوں کے ساتھ بھی دہرایا جاتا تھا جہاں ایک ننھا سا بچہ، آنکھیں بند کیے کوئی بھی صفحہ کھولتا ہے اور ساتویں سطر یا گیت کے ٹکڑوں سے زندگی کا حال جاننے کی کوشش کی جاتی ہے...... زندگی کی تفسیر یا تفہیم آسان نہیں۔ اس طرح ان نغموں، گیتوں، دوہوں یا رباعیوں سے کبھی مثبت زندگی کا کوئی صفحہ کھلتا ہے، کبھی منفی زندگی کا..... اور میرے لیے مشکل یہ کہ میں جہانگیر مرزا کی پراسرار ڈائری کا تعاقب کروں تو کس نتیجہ پر پہنچوں۔ مثبت یا منفی نتائج پر۔ یا کوئی ایسی بات جو مجھ سے بھی پوشیدہ رکھی گئی۔ جبکہ زندگی کے کولاژ میں نہ وہ مشکل تھا، نہ مشکل میں تھی۔ نہ وہ لاینحل عقدہ اور نہ میں کوئی الجھی ہوئی داستان در داستان۔ قدیم ویدانت میں گناہ کوئی مسئلہ نہیں کہ یہ انسانی زیورات میں سے ایک ہیں۔
میں شاید اندر سے خوفزدہ ہوں۔ یا نہیں ہوں۔ یا میں محض معاملات کو سمجھنا چاہتی ہوں۔ یا اس وقت میں اس قدیم کتاب کی طرح ہوں، جس کا ہر صفحہ بوسیدہ ہے اور ہر صفحہ پر شب و روز کے خوفناک قصوں کے علاوہ اس موسیقی کی بھی گونج ہے جو میرے وجود میں زلزلہ پیدا کر رہی ہے۔ زندگی کی شروعات میں ہی مجھے احساس ہو گیا، وہ اتنا آسان نہیں، جتنا کہ میں سمجھ رہی ہوں۔ وہ مشکل بھی ہے اور پیچیدہ بھی۔ اور وہ ایک ساتھ کئی دنیاوی رنگوں کو اپنے وجود میں شامل کر لیتا ہے۔
یہ وہ دور تھا، جب ادب کی دنیا میں اس کی سرگرمیاں جاری تھیں..... اور میں اس کی زندگی کا حصہ بننے لگی تھی۔ اور یہ وہ تھا، جہانگیر مرزا جو اچانک کسی لمحہ ہنستے ہنستے کوئی ایسی بات کہہ جاتا، جس کی میں نے پہلے سے کوئی امید نہیں کی ہوتی تھی۔ ایک طرف وہ اخلاقیات کا پابند اور مہذب تھا اور دوسری طرف ادبی محفلوں اور سمیناروں میں وہ ادبی حد سے تجاوز کر جاتا۔ میں اس رویہ پر پوچھتی تو وہ کھلکھلا دیتا۔
'تم نہیں سمجھو گی......'
'میں کیوں نہیں سمجھوں گی جہانگیر؟'
'کیونکہ......' وہ مسکرا دیتا۔ 'سیاست ہو رہی ہے۔ سیاست سے زیادہ ادب میں سیاست ہو رہی ہے۔ اور میں اس سیاست کو برداشت نہیں کر پاتا۔'
'برداشت کرنا سیکھو نا......'
'زندگی ہی نہیں سیکھ پایا تو برداشت کرنا، کہاں سے سیکھوں۔ کم بخت زندگی کا ہر موڑ مشکل ہے۔ کہاں لے جائیگی، کچھ پتہ نہیں ہوتا...... مگر سیاست۔ یہاں دلال پیدا ہو گئے ہیں۔ اور میں خود کو روک نہیں پاتا......
'لیکن روکنا تو ہوگا نا...... ایسے تو الجھ جاؤ گے...... زندگی الجھ جائے گی۔
ہاں۔ میں سمجھتا ہوں۔ اور یہ گھر کے لیے آسان نہیں۔ کیونکہ بہت سارے دوسروں کی طرح اب میرا بھی ایک گھر ہے۔ اور اس گھر کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔'
'لیکن تم پر یہ ذمہ داری الگ سے تو نہیں ہے کیونکہ اس زندگی میں، میں بھی شامل ہوں اور میں بھی اپنی ذمہ داری نبھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔'

یہ وہ دن تھے، جب کبھی کبھی سگریٹ کے ساتھ وہ شراب کے بھی دو ایک پیگ لے لیا کرتا تھا۔ لیکن وہ بلانوش نہیں تھا۔ اس لیے مجھے کبھی الجھن نہیں ہوتی تھی۔ ہاں الجھن تب ہوئی۔ جب ایک دن اس کی ڈائری کے کچھ صفحے میرے ہاتھ لگ گئے۔ وہ اکثر ڈائری لکھتا تھا۔ وہ راتوں کو جاگتا تھا اور اکثر یہ راتیں سگریٹ پیتے ہوئے، ٹہلتے ہوئے اور لکھتے ہوئے گزر جایا کرتی تھیں۔ میں اکثر نیند سے چونک چونک کر اٹھ جایا کرتی۔ یہ وہ دور تھا جب زندگی کے برہنہ رنگوں میں کھو کر ہم ایک ایسی شاہراہ میں کھڑے تھے جہاں کوئی راستہ امید و منزل کی طرف نہیں جاتا تھا۔

لیکن میں سارہ جہانگیر مرزا...... میں یہ سب کیوں سوچ رہی ہوں......؟ کیا میں ان لمحات سے ڈر گئی ہوں، جس کا سابقہ ابھی کچھ دیر بعد میرے بیٹے کو ہونے والا ہے۔ یعنی کچھ ہی دیر بعد وہ خود کو ڈائری کھولنے کے لیے تیار کرے گا اور پڑھنا شروع کرے گا۔ لیکن آخر ان صفحات میں ایسا کیا ہے کہ میں اپنی ذات کی ادھیڑ بن میں گرفتار ہوں۔

ہاں یہ صحیح ہے...... یہ ذات کی گرہیں آہستہ آہستہ کھل رہی ہیں۔ ہم ایک ہی ذات کو کباڑ خانہ بنا کر ایک ساتھ کتنا کچھ رکھ لیتے ہیں۔ شرافت بھی اور گندگی بھی۔ ہم کتنا کچھ دکھا دیتے ہیں اور کتنا کچھ چھپا لیتے ہیں۔ کیا کسی کے مرنے کے بعد یہ آسان تبصرہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ بہت شاندار تھا۔ جبکہ حقیقت میں، وہ بہت ساری بدمعاشیوں، گندگیوں اور ذلتوں کی پٹاری کو بھی اپنے ساتھ ساتھ لے گیا ہے۔ کیا آپ کسی کو مسکراتے ہوئے دیکھ کر یہ سوچ سکتے ہیں کہ ابھی اس لمحہ وہ آپ کے بارے میں کیا رائے قائم کر رہا ہوگا۔ ایک الجھی ہوئی پہیلی اور ان لمحوں میں، میں یہ الجھی ہوئی پہیلی ہوں اور میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں کہ دو برس قبل کی ڈائری میں وہ کیسے بارود ہوں گے جس کا انکشاف وہ اپنے بیٹے پر کرنے والا ہے اور اسی لیے اب آپ کے درمیان سے میں رخصت ہوتی ہوں اور یہ میرے بیٹے پاشا مرزا پر ہے کہ وہ زندگی کی الجھی الجھی صداقتوں کا چہرہ آپ کے سامنے رکھنے میں کتنی ایمانداری سے کام لیتا ہے۔ مگر مجھے یقین ہے، یہ نسل باغی ہے لیکن ایماندار بھی، کیونکہ بہت برا سوچتی ہے تو اس فکر کو اچھائی میں بدلنے کے لیے بھی تیار رہتی ہے..... اور جیسا کہ جہانگیر مرزا کو شدت سے اس بات کا احساس تھا کہ وہ ایک اچھا باپ نہیں ہے۔ تو کیا مرنے کے بعد بھی وہ اپنے بیٹے سے جذباتی ہمدردی کی امید کرتا ہے کہ وہ اسے ایک اچھا باپ تسلیم کر لے۔ اور جہاں تک میں پاشا مرزا کے پریکٹیکل رویہ سے واقف ہوں، باپ کی موت کا احساس بھی اس کے فیصلے کی راہ میں حائل نہیں ہوگا۔ اس فیصلے کے لیے کہ اس کا باپ ایک برا آدمی تھا۔

میں باہر نکل کر آ گئی ہوں، ابھی دوپہر ہے۔ کھلی کھڑکیوں سے میں باہر کا نظارہ دیکھ سکتی ہوں۔ جامن کا پیڑ خاموش ہے۔ ہوا ساکت۔ سڑک پر اکا دکا گاڑیاں آ جا رہی ہیں۔ کمرے میں حبس ہے۔ ممکن ہے اس حبس کے پیچھے بھی جہانگیر مرزا کی ڈائری کا ہاتھ رہا ہو۔ میں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی پاشا کے کمرے کے پاس آ کر ٹھہر گئی ہوں۔ اس کا دروازہ ذرا سا کھلا ہے۔ جبکہ احتیاط کے طور پر وہ دروازہ اکثر بند کر لیتا ہے۔ میز پر پیکٹ پڑا ہے۔ یعنی ڈائری اب تک نہیں کھلی۔ وہ ریوالنگ چیئر پر بیٹھا ہے۔ ٹھیک اپنے باپ کی طرح۔ اس کی آنکھیں بند ہیں۔ کیا وہ بھی میری طرح لہولہان یا خوفزدہ ہے......اس کا کمرہ ابھی بھی بکھرا ہوا ہے۔ کتابیں، جوتے، کھلا ہوا وارڈروب۔ میز پر پھیلی ہوئی کتابیں اور ان کے درمیان دو سال پرانا پیکٹ—— مجھے یہ مکمل نظام پراسرار لگ رہا ہے۔ میں واپس اپنے کمرے میں آ گئی ہوں اور شاید ڈائری سے نکلی پراسرار کہانی کے باہر آنے تک کے لیے اب میرا کوئی کام نہیں۔ اور اس لیے میں نے سونے کا فیصلہ لیا ہے۔ اب میں چلتی ہوں۔ آئندہ صفحات میں جو کچھ بھی آپ پڑھیں گے، اس کے لیے میں ذمہ دار نہیں۔ لیکن مجھے یہ احساس ہے کہ کچھ ہونے والا ہے...... کچھ بیحد برا ہونے والا ہے۔ اچھا...... خدا حافظ......

باب دوم

''جہانگیر مرزا کی ڈائری''

آپ کسٹمر سے یہ نہیں پوچھ سکتے کہ وہ کیا چاہتے ہیں اور آپ انہیں کیا بنا کر دیں۔ جب تک آپ اسے بتائیں گے، وہ کچھ نیا چاہنے لگیں گے۔

..

آپ کا وقت محدود ہے۔ اس لیے کسی اور کی زندگی جی کر اپنے وقت کو برباد نہ کیجیے۔

—اسٹیو جابس

برانڈ مجھے پسند نہیں

(۱)

میں پاشا مرزا۔ ایک بیحد گرم دوپہر میں اس کہانی کا گواہ بننے جارہا ہوں، ایک گرم دوپہر جس نے میرے موڈ کو خراب کردیا ہے۔ مجھے اپنے غصے پر قابو نہیں رکھنا آتا۔ مجھے یہ کمرہ بھی شرارتی بندروں کی طرح کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ یہ کمرہ مجھے ناپسند ہے اور ڈیڈ کی زندگی میں، میں بار بار یہ دہراتا رہا کہ مہربانی کر کے میرے کمرے کو ہی ٹھیک کرادو۔ لیکن مجھے یاد ہے، ایسے ہر موقع پر وہ خاموش ہو کر اپنے کمرے میں بند ہو جایا کرتے تھے۔ ابھی کئی اور برے واقعات ہوئے۔ میں کچن میں آیا تو کافی بناتے ہوئے ٹرے زمین پر گر گئی۔ کپ سنبھالتے ہوئے دوھ کے برتن سے ٹکرایا اور گرم دودھ کے قطرے اچھل کر میرے ہاتھوں کو جلا گئے۔ میں غصے میں مام کو آواز لگاتا ہوا کمرے میں آیا، تو دیوار پر ڈیڈ کی تصویر کو دیکھ کر بوجھل ہو گیا۔ تصویر میں ان کے ساتھ مام بھی تھیں اور میں بھی تھا۔ تب میں چھوٹا تھا اور اس بات کا احساس ہونے لگا تھا کہ میں غلط گھر میں پیدا ہوا ہوں....اور اس گھر میں میری تمام خواہشیں گھٹ کے رہ جائیں گی۔ میں کافی لے کر اپنے کمرے میں آیا تو دیوار پر ایک لیزارڈ (چھپکلی) کو چڑھتے دیکھ کر مجھے غصہ آ گیا۔ اس چھپکلی میں، میں ہمیشہ سے ایک آدم قد دہاڑتے ڈائنا سور کو دیکھتا ہوں۔ مجھے یاد ہے، بچپن کے دنوں میں ڈیڈ مجھے لے کر ایک سائنس اکیڈمی گئے تھے جس کی دوسری منزل پر دو آدم قدم ڈائنا سور موجود تھے۔ اس کمرے میں میری طرح کئی اور بھی بچے تھے جو ان ڈائنا سوروں کی موجودگی اور خوفناک ساؤنڈ ایفکٹ سے پریشان تھے۔ یہ بات میرے دل کو پریشان کرتی رہی کہ ڈیڈ میری پریشانیوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ مجھے یاد ہے اس خوفناک کمرے میں، میں بار بار ان کا ہاتھ تھامے ان سے لپٹنے کی کوشش کررہا تھا اور وہ بار بار میرا ہاتھ جھٹکتے ہوئے مجھے ڈائنا سور کے قریب کرنے کی کوشش کررہے تھے۔

کافی پیتے ہوئے نیتی سکسینہ کا فون کرنا مجھے پسند نہیں آیا۔ ان لڑکیوں کو زندگی میں اور کوئی کام ہی نہیں۔ بے دلی سے فون اٹھایا۔ غصہ مجھ پر ابھی بھی حاوی تھا۔

نیتی پوچھ رہی تھی۔ 'کیا کر رہے ہو......'

'ایک ایٹم بم پاس میں ہے۔'

'تم سے زیادہ خطرناک؟' نیتی کا قہقہہ گونجا تھا۔

'ہاں۔ مجھ سے کہیں زیادہ۔'

'کیوں؟'

'کیوں کہ اس ایٹم بم میں میرے باپ بند ہیں، جو کچھ دیر میں آزاد ہونے والے ہیں......'

'کیا......؟' نیتی کا لہجہ بدل گیا تھا۔ اس نے چونک کر پوچھا۔ میں سمجھی نہیں۔ کیا کہہ رہے ہو......

'اسٹوپڈ...... باسٹر......' میں کہتے کہتے رک گیا تھا۔ اب اس سے زیادہ صاف کیوں بولوں......

'لیکن تمہارے باپ کو تو مرے ہوئے......'

'دوسال ہو گئے۔'

'ہاں۔'

'دوسال میں سافٹ ویئر پرانے ہوجاتے ہیں۔'

'ہاں۔ برانڈ بھی۔ نئے برانڈ آجاتے ہیں۔'

'ہونہہ۔ نیتی نے قہقہہ لگایا۔ اب تک پرانے برانڈ کے ساتھ چپکے ہوئے ہو۔؟'

'ہاں جیسے تم چپکی ہوئی ہو۔ اور تمہاری انفارمیشن کے لیے بتادوں دوسال پہلے میں اس برانڈ کو کھو چکا ہوں۔ اور تم......'

نیتی کا لہجہ پریشان کن تھا۔ 'تم کہنا کیا چاہتے ہو......'

میں زور سے ہنسا۔ اب باری تمہاری ہے نیتی۔ تم بھی اپنے برانڈ سے آزاد ہوجاؤ۔'

'پاگل ہو۔'

یار، یہ پرانے برانڈ بہت پریشان کرتے ہیں۔ زندگی میں بھی۔ مرنے کے بعد بھی۔'

نیتی کا لہجہ بدل گیا تھا۔ وہ سمجھانے کی کوشش کررہی تھی— 'پاگل مت بنو۔ خون کے رشتوں کو سمجھا کرو۔ دیکھو، انسان کے ساتھ پرندے، کیڑے مکوڑے بھی، جانور بھی ان رشتوں کو سمجھتے ہیں۔ چرند پرند بھی، بچوں کو جنم دیتے ہیں تو قدرت ان کے اندر بھی محبت کا جذبہ بھر دیتی ہے۔ چمگادڑ لاکھوں کی تعداد میں رہتے ہیں لیکن اپنے اپنے بچوں کو پہچانتے ہیں۔ خوراک کی تلاش میں نکلنے کے بعد اپنے ہی بچوں کے پاس واپس لوٹتے ہیں۔'

'میری وائلڈ بلی۔ یہ مورال کسے پڑھایا جارہا ہے۔؟'

'ایک وائلڈ بلے کو......'

'اس وائلڈ بلے کی ابھی کوئی طلب نہیں۔ ایسے بھی جانور ہیں جو پیدا کرتے ہی اپنے ہی بچوں کو کھاجاتے ہیں۔'

'تم سچ مچ پاگل ہو۔'

.......'اور اسی لیے اپنی نصیحتیں اپنے پاس رکھو۔ میرے پاس ابھی ایک ایٹم بم ہے اور مجھے سوچنا ہے اس ایٹم بم کا کیا کرنا ہے۔'

میں نے فون رکھ دیا۔ پیکٹ کو غور سے دیکھا۔ یہ ایک زرد رنگ کے لفافہ میں تھا۔ اور لفافہ دو برس میں کافی پرانا ہو چکا تھا۔ میں نے اسے ہاتھ میں لیا۔ پھر میز پر رکھ دیا۔ مجھے اپنے لفظ ایٹم بم پر ہنسی آئی...... ناگاساکی اور ہیروشیما پر برسوں پہلے اس ایٹم بم کا استعمال ہو چکا ہے۔ کم وبیش ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ لوگ مارے گئے۔ شہر کی تین چوتھائی عمارتیں ملبے کا ڈھیر ہوگئیں اور اس کے اثرات برسوں میں نمایاں ہوتے رہے۔ تو کیا میں بھی......؟ میں بھی اس کے موذی اثرات سے بچ نہیں پاؤں گا—؟ کیا اس ڈائری کو پڑھنا ضروری ہے— مجھے یاد آیا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا جب امریکہ نے جاپان کے شہر ہیروشیما پر ایٹم بم گرایا تو دھماکہ کی جگہ سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر 'جنگجو بلابا' کے ٦ درخت لگے ہوئے تھے۔ ایٹمی دھماکے کے بعد یہ ٦ درخت ان چند جانداروں میں سے تھے جو زندہ بچ گئے تھے جبکہ تقریباً تمام پودے اور جانور مر گئے تھے جبکہ یہ درخت آج بھی زندہ اور اپنی جگہ پر قائم ہیں۔

جنگجو بلابا کی یاد سے کوئی بہت زیادہ خوش ہونے کی بات نہیں تھی مگر میں اس ایٹم بم کو کھولنے سے قبل خود کو تسلی دینا چاہتا تھا کہ میں اس کے اثرات سے خود کو بچانے میں کتنا کامیاب رہوں گا۔

♦♦

میں ابھی کئی باتیں سمجھنے سے قاصر ہوں اور یہ بھی کہ زندگی سے لے کر نہانے، کھانے پینے اور جینے کا انداز بدلا ہے تو اسے بڑوں کو تسلیم کرنے میں پریشانی کیوں ہے؟ میں اپنے بارے میں سوچتا ہوں، ڈیڈ بہت حد تک میری زندگی یا زندگی کے فیصلوں پر اپنی مہر نہیں لگاتے تھے۔ بلکہ میں اس کے لیے آزاد تھا۔ اور ایسا بھی ہوتا جب کئی فیصلوں کی آزادی لینے کے لیے انہوں نے مجھے با اختیار بھی بنایا تھا۔ جیسے مثال کے لیے اڑنے کی آزادی۔ اور یہ آزادی ان کے پاس بھی تھی اور وہ ایک آزاد انسان کی حیثیت سے اس آزادی کی حفاظت بھی کیا کرتے تھے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کیا یہ nature ہے جس نے بچوں کے منہ کا ذائقہ بدل دیا— ؟ یا اسکول، جہاں تمام بچے پزا، برگر جیسے فاسٹ فوڈ کی طرف لپکتے تھے اور باپ کے لفظوں میں...... یہ بچے فاسٹ فوڈ کلچر میں ہیں اور اسی لیے فاسٹ ہیں کہ ہم ان کی تیزی اور برق رفتاری کی برابری نہیں کرسکتے۔ اب سوچتا ہوں کیا ڈیڈ فرار کا راستہ اختیار کرتے تھے؟ یا انہوں نے مجھے اپنی ذمہ داریوں کے لیے آزاد کرتے ہوئے اپنی کوئی ذمہ داری رکھی ہی نہیں—

◆◆

میں پاشا مرزا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اپنی ہی کہانی سے خوفزدہ ہوں۔ اندر سے ایک آواز اٹھتی ہے......

'تمہیں احساس ہے، اس سطح پر پہلی بار تم نے سوچنا شروع کیا ہے۔'

'ہاں۔'

اور یہ راستہ ایک بار پھر تمہارے ڈیڈ نے ہی بتایا ہے۔؟'

'ہاں۔'

'تم مانو نہ مانو، لیکن ڈیڈ نے تمہاری نسل کو قبول کیا تھا۔'

'ہاں۔'

'شیکسپیئر سے یہ دنیا کافی آگے نکل آئی ہے...... ایک نئے ینگستان نے خاموشی سے تمہاری مہذب دنیا کے دروازے پر دستک دی ہے۔'

'ہاں۔ میں اسی ینگستان کا ایک حصہ ہوں— پاشا مرزا مطمئن تھا— یہاں، اس ینگستان میں تمام اڑانیں ایک جیسی ہیں— مقاصد ایک جیسے اور...... فیس بک سے لنک دین اور ٹوئیٹر تک— گاؤں کا ینگستان بھی ۴۰ فیصد تک چمکدار مال اور ملٹی پلیکسیز کا حصہ بن رہا ہے— گاؤں اور چھوٹے شہروں سے نکل کر ایک بڑا طبقہ جی میٹ اور مینجمنٹ کے اسکولوں میں داخل ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ نئی نئی ینگستان لہر کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کھادی کے کرتے، پائجامے اور ٹوپیوں میں سیاست کی ٹوٹی پھوٹی بیسا کھیاں بھی سنبھال رہا ہے— فیشن سے عام زندگی تک یہاں سب کچھ بدل رہا ہے— سب کی اڑانیں الگ اور مقصد بھی الگ ہیں...... ہم ایک برانڈ بنتی تہذیب یا دنیا کے دروازے پر ہیں۔ جہاں نئی پرانی، انٹرنیشنل ملٹی نیشنل کمپنیوں کے سکے چل رہے ہیں۔ یہاں نوجوانوں کے لیے الگ سے مال بنائے جا رہے ہیں۔ یہاں بچے بھی ایک پروڈکٹ ہیں اور ۴۰ پلس کی ضروریات کا خیال بھی رکھا جا رہا ہے...... ڈیڈ ان اڑانوں کو سمجھتے تھے اور ممی ان اڑانوں پر خوفزدہ ہو جاتی تھیں—

ممی سارہ جہانگیر کی ناک پر ہمیشہ غصہ رہتا تھا۔

'میں کہتی ہوں۔ اس کے پنکھ کاٹ دو—'

'نہیں—'

'ایک دن پچھتاؤ گے......'

اسے یاد ہے، ڈیڈ جہانگیر مرزا اپنی سوئفٹ ٹائی کے کناروں سے کھیلتے ہوئے مسکرا دیتے تھے— 'کیوں پچھتاؤں گا؟— سارہ— تم بدلتی ہوئی دنیا کو سمجھنے کی کوشش تو کرو۔'

مجھے سب کچھ یاد آرہا تھا۔

......اوراس پرندہ کی کہانی بھی— ڈیڈ کے لفظوں میں...... جو آسمان پر پرواز کرتا ہوا 'جوناتھن سوئفٹ' کی طرح اپنی اڑان کو روکنا نہیں چاہتا تھا—

(۲)

میز کی دراز میں بند ہیں

پنیت، گریسی اور نشا سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے بعد بھی میں اپنے حواس کو بحال کرنے میں ناکام تھا۔ پنیت نے بیکار میں گالیاں سنائیں اور گریسی دیر تک Incest کے موضوع پر بات کرتی رہی۔ نشا سے گفتگو کے بعد احساس ہوا کہ تھری ڈی کلاسیز اور اسمارٹ ایجوکیشن کے باوجود یہاں زندگی اور سیکس دونوں کو لے کر ایک بورڈم موجود ہے۔ ایک کنفیوژن بھی۔ جیسے گریسی کو شکایت تھی کہ وہ کنڈوم سے غبارے پھلانا تو پسند کرتی ہے مگر سیکس کے موقع پر یہ کنڈوم اسے گوارہ نہیں۔ اور یہ بھی کہ اب وہ بور ہو چکی ہے تو کیا اسے نشہ کا عادی ہو جانا چاہیے—؟ اور جیسا کہ گریسی دو سال تک نشہ کی زیادتی کو لے کر علاج میں رہی۔ اسے خطرہ اس بات کا تھا کہ ایک نشہ، دوسرے نشہ کے لیے راستہ کھول دیتا ہے۔ اور اس لیے نشہ پر قابو پانا آسان نہیں۔ زندگی ہی نشہ ہے اور پنیت کا خیال تھا کہ تیزی سے قبضہ کرتی ہوئی اچانک کی موت کسی فنتاسی سے کم نہیں۔ اور پنیت کے خیال میں زندگی سے زیادہ نشہ موت کے احساس میں ہے۔ اور وہ بتایا کرتا تھا کہ جب اس کی پھوپھی کینسر سے مر رہی تھی، وہ زیادہ لمحے ان کے ساتھ رہا۔ اور یہ دیکھنے میں رہا کہ پھوپھی کے جسم سے روح یا جان کیسے نکلتی ہے۔ 'شٹ'۔ یہ موت پر اس کا بھدا تبصرہ تھا کہ تمام کوششوں کے باوجود رات کے وقت اس کو نیند آ گئی اور وہ پھوپھی کو قریب سے مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکا۔ زندگی سے موت تک اس نئے ینگستان کے پاس ہزاروں 'پکاؤ' موضوع ہیں اور مزہ یہ کہ سب ایک دوسرے پر ناراض ہوتے رہتے ہیں کہ تمہارے پاس تو کوئی نیا ایشو ہی نہیں۔ ہاں، بگڑتی ہوئی بدحال اور خوفناک سیاست میں ہماری دلچسپی نہیں......اور جیسے ہم ملنے پر مذاق کرتے ہیں کہ ایک دھوتی سے سوٹ پر آ گیا۔ دوسرے نے سوٹ اتار کر پائجامہ پہن لیا اور یہاں حال یہ کہ نہ دھوتی پسند اور نہ پائجامہ۔ نہ مکاری پسند نہ سیاست کی طرف جاتے ہوئے راستے۔ یہاں آزادی ہے کیونکہ بنداس ہیں ہم اور تنہائیوں میں اکثر کنڈوم کے اشتہار کو زور زور سے یاد کرتے ہیں کہ— بنداس بولو۔

کمرے میں ہوا نہیں ہے۔ کھڑکی بند ہے اور اس پر ریشمی پردہ جھول رہا ہے۔ میں اٹھ کر بستر پر لیٹنا چاہتا ہوں مگر بدن میں ہزاروں کانٹے ہیں جو چبھ رہے ہیں۔ میں بار بار بھٹک کر اس ڈائری کی طرف آ جاتا ہوں، جو میری آنکھوں کے سامنے پڑی ہے۔ مگر میں اسے ابھی دیکھنے یا پڑھنے کا خطرہ نہیں اٹھانا چاہتا۔ میں اس سے پہلے اپنی زندگی کے تمام کچرے، پھٹے ہوئے، بیکار اور واہیات صفحوں کو کھولنا چاہتا ہوں۔ میرے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ میں کب کن موقعوں پر زیادہ زخمی ہوا۔ لیکن ایک تکلیف دہ سچ اور بھی ہے،

گزری ہوئی زندگی کے خوفناک صفحوں میں جھانکتے ہوئے مجھے ڈر لگتا ہے۔ میں خود کو سمجھاتا ہوں کہ وہ نہیں ہے۔ وہ مر چکا ہے تو اسٹیو جابس خاموشی سے چلتے ہوئے میرے سامنے آکر ٹھہر جاتے ہیں۔ ان کی آنکھیں روشن ہیں اور وہ صاف گوئی سے زندگی سے موت کی حقیقت تک کی داستان اس طرح کہہ جاتے ہیں جیسے عام دنوں میں ہم چیونگم چوستے ہیں، کافی پیتے ہیں یا الکوہل کا مزہ لیتے ہیں۔

''آپ سچ مچ کیا کرنا پسند کرتے ہیں یہ آپ کو جاننا ہوگا— جتنا اپنے پیار کو تلاش کرنا ضروری ہے، اتنا ہی اس کام کو تلاش کرنا ضروری جس سے آپ سچ مچ مزہ لیتے ہیں، آپ کا کام آپ کی زندگی کا ایک بڑا حصہ ہوگا— اور truly-satisfied ہونے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ آپ وہ کریں جسے آپ سچ مچ ایک بڑا کام سمجھتے ہوں۔ اور بڑا کام کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ آپ وہ کریں جسے آپ انجوائے کرتے ہوں۔ اگر آپ کو ابھی تک وہ کام نہیں ملا ہے تو آپ ٹھہریے مت...... اسے تلاش کرتے رہیے۔ جیسا کہ دل سے وابستہ ہر چیز میں ہوتا ہے...... وہ جب آپ کو ملے گا تب آپ کو پتہ چل جائے گا...... اور جیسا کہ کسی اچھے تعلقات میں ہوتا ہے وہ وقت کے ساتھ ساتھ اور اچھا ہوتا جائے گا...... اس لیے تلاش کرتے رہیے..... ٹھہریے مت......''

'ایسا نہیں ہوگا جابس......' میں چیخنا چاہتا ہوں۔ اور جیسے اس لمحے ممی آکر میرے قریب بیٹھ جاتی ہیں۔

'ہاں۔ اپنے ہاتھ سیدھے کرلو۔ اس لیے کہ تم خواب دیکھ رہے ہو۔ اور ہاں اب ٹھیک ہے......'

'اب ٹھیک نہیں ہے۔' میں پھر چلانا چاہتا ہوں۔

اسٹیو جابس اب بھی پاس کھڑے ہیں۔ انہیں مزہ مل رہا ہے۔ ان کی آنکھیں شرارتی اور روشن ہیں اور وہ آہستہ آہستہ کہہ رہے ہیں۔

جب میں ۱۷ سال کا تھا تو میں نے ایک جگہ پڑھا، جو کچھ اس طرح تھا۔ ''اگر آپ ہر روز ایسے جئیں کہ یہ آپ کی زندگی کا آخری دن ہے......تو آپ کسی نہ کسی دن صحیح ثابت ہو جائیں گے۔'' اس بات نے میرے دماغ پر ایک دباؤ بنا دیا، اور تب سے پچھلے ۳۳ سالوں سے، میں نے ہر صبح اٹھ کر شیشے میں دیکھا ہے اور خود سے ایک سوال کیا ہے۔ ''اگر یہ میری زندگی کا آخری دن ہوتا تو کیا میں آج وہ کرتا جو میں کرنے والا ہوں؟'' اور جب بھی مسلسل کئی دنوں تک جواب ''نہیں'' ہوتا ہے، میں سمجھ جاتا ہوں کہ کچھ بدلنے کی ضرورت ہے۔ اس بات کو یاد رکھنا کہ میں بہت جلد مر جاؤں گا مجھے اپنی زندگی کے بڑے فیصلے لینے میں سب سے زیادہ مددگار ہوتا ہے، کیونکہ جب ایک بار موت کے بارے میں سوچتا ہوں تب ساری امیدیں، سارا غرور، ناکام ہونے کا ڈر سب کچھ غائب ہو جاتا ہے اور صرف وہی بچتا ہے جو واقعی ضروری ہے۔ اس بات کو یاد کرنا کہ ایک دن مرنا ہے...... کسی چیز کو گم ہونے کے ڈر کو دور کرنے کا سب سے اچھا طریقہ ہے۔ آپ پہلے سے ہی ننگے ہیں، ایسی کوئی وجہ نہیں ہے کہ آپ اپنے دل کی نہ سنیں۔'

اسیٹو قریب آگئے ہیں۔ انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا ہے۔ وہ میری طرف دیکھ رہے ہیں۔

'سنو پاشا۔ قریب ایک سال پہلے پتہ چلا کہ مجھے کینسر ہے— صبح ساڑھے سات بجے میرا اسٹ ہوا، جس میں صاف صاف دکھ رہا تھا کہ میرے pancreas میں ٹیومر ہے، مجھے تو پتہ بھی نہیں تھا کہ پینکریاز کیا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر نے تقریباً یقین کے ساتھ بتایا کہ مجھے ایک ایسا کینسر ہے جس کا علاج ممکن نہیں ہے...... اور میں بس تین سے چھ ماہ کا مہمان ہوں۔ ڈاکٹر نے صلاح دی کہ میں گھر جاؤں اور اپنی ساری چیزیں سمیٹ لوں، جس کا indirect مطلب ہوتا ہے کہ ''آپ مرنے کی تیاری کر لیجیے۔'' اس کا مطلب کہ آپ کوشش کیجیے کہ آپ اپنے بچوں سے جو باتیں اگلے دس سال میں کرتے، وہ اگلے کچھ ہی مہینوں میں کر لیجیے۔ اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ آپ سب کچھ سمیٹ لیجیے کہ آپ کے بعد آپ کی فیملی کو کم سے کم پریشانی ہو سکے—'

اسٹیو کے چہرے پر مسکراہٹ ہے۔ جیسے وہ میرا مذاق اڑانا چاہتے ہیں۔ کچھ لمحے خاموش رہ کر اسٹیو نے پھر میری طرف دیکھا۔ سنو پاشا......

'میں نے اس کشمکش کے ساتھ پورا دن گزار دیا— پھر شام کو میری biopsy ہوئی جہاں میرے گلے کے راستے، پیٹ سے ہوتے ہوئے میری intestine میں ایک endoscope ڈالا گیا اور ایک سوئی سے ٹیومر سے کچھ cells نکالے گئے۔ میں بیہوش تھا، مگر میری بیوی، جو وہاں موجود تھی اس نے بتایا کہ جب ڈاکٹر نے microscope سے میرے cells دیکھے تو وہ رو پڑا...... دراصل cells دیکھ کر ڈاکٹر سمجھ گیا کہ مجھے ایک بہت ہی نایاب قسم کا cancer ہے......'

اسٹیو نے قہقہہ لگایا۔ میں مرنے والا تھا پاشا لیکن میں نے اپنے لیے زندگی کا انتخاب کیا۔ موت کے اتنا قریب میں اس سے پہلے کبھی نہیں پہنچا— یہ سب دیکھنے کے بعد میں اور بھی یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ موت ایک کامیاب بلکہ دانشور تصور ہے۔ کوئی مرنا نہیں چاہتا ہے، یہاں تک کہ جو لوگ جنت جانا چاہتے ہیں وہ بھی...... پھر بھی موت وہ منزل ہے جسے ہم سب شیئر کرتے ہیں۔ آج تک اس سے کوئی بچا نہیں ہے.... اور ایسا ہی ہونا چاہیے کیونکہ شاید موت ہی اس زندگی کی سب سے بڑی ایجاد ہے۔ یہ زندگی کو بدلتی ہے، پرانے کو ہٹا کر نئے کا راستہ کھولتی ہے۔ اور اس وقت نئے آپ ہیں، مگر زیادہ نہیں...... کچھ ہی دنوں میں آپ بھی پرانے ہو جائیں گے اور راستے سے صاف ہو جائیں گے۔ آپ کا وقت محدود ہے، اس لیے اسے کسی اور کی زندگی جی کر بیکار مت کیجئے۔ بیکار کی سوچ میں مت پھنسیے، اپنی زندگی کو دوسروں کے حساب سے مت چلائیے۔ اوروں کے خیالات کے شور میں اپنی اندر کی آواز کو، اپنے intuition کو مت ڈوبنے دیجئے۔

وہ روشن آنکھیں اوجھل ہیں اور کبھی کبھی میں ستاروں کے جھرمٹ میں ان کی چمک دیکھ لیتا ہوں۔ میرے لیے حیرانی کی بات تھی کہ ایک دن اسٹیو جابس بھی کھو سکتے ہیں— یا ایک دن مارک زکر برگ یا بل گیٹس جیسے لوگ بھی کھو جائیں گے۔ موت...... میں سوچنے سے قاصر ہوں کہ زندگی کے بعد بھی کوئی دنیا ہو سکتی ہے؟ جبکہ ایک موت کو میں نے قریب سے دیکھا ہے۔ محسوس کیا ہے۔ کیا موت کے بعد بھی کوئی زندگی ممکن ہے۔ سوچتا ہوں اسٹیو جابس کی شکل میں، ایک کینسر کے مریض کی تصویر آنکھوں کے پردے پر تیر جاتی ہے...... موت ایک دھند ہے...... کھیل ختم کہاں ہوتا ہے۔ کھیل تو شروع ہوتا ہے...... کیا پتہ کوئی کھیل اس دھند میں بھی چل رہا ہو...... اور دیکھو تو پاشا، جیسے ممی کہتی ہیں...... وہ ہے...... اور ہم اسے تلاش کر رہے ہیں...... اپنی تنہائی کی دنیا آباد کرتے ہوئے...... پوٹیٹو یا انکل چپس، کنیڈی چاکلٹس، بریٹنیا کیک، کچھ تازہ ڈرائی فروٹس کو میز کی دراز میں بند کرتے ہوئے میں نے ان دونوں ہیروز کو بھی اسی دراز میں چھپا لیا ہے۔ اس دراز میں ان کی تصویریں ہیں جن کے پرنٹ میں نے محفوظ کر لیے ہیں اور میرے لیپ ٹاپ کے اسکرین پر بھی ان دونوں کی ہی تصویریں بنی ہوئی ہے اور جیسا کہ ممی کہتی ہیں، ہم رشتوں کی طرف بھاگنے والے لوگ تھے۔ اور تم لوگ پیسوں کی طرف بھاگنے والے۔ دراصل ہم پریکٹیکل دنیا میں جینے والے لوگ ہیں اور ہماری نسل جذباتی باتوں پر زیادہ توجہ نہیں کرتی۔ آئی میک تھنکس کا نعرہ دینے والا زکر برگ اس وقت صرف انیس سال کا ہوگا، جب فیس بک جیسے سوشل میڈیا کی دریافت پر یا ہوا اور گوگل نے ۷۵ ہزار کروڑ یعنی ۱۵ بلین ڈالر سے اس کی بولی لگائی تھی۔ ہم ینگستان والوں کے لیے یہی لوگ ہمارا آئیڈیل ہیں۔ پچھڑے ہوئے اور کمزور لوگوں میں ہماری دلچسپی نہیں ہوتی ہے۔ وہ بل ڈاگ ہوں، سور، چھبڑے والی بلی یا ہمارے رشتہ دار۔

میں اپنی زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو یاد کرنا چاہوں تو یہاں مایوسی اور اندھیرے کے سوا کچھ نہیں۔ ہاں، میں بھی اڑنا چاہتا

تھا۔مگر میرے پنکھ نہیں تھے۔ کیا کسی کمزور لمحے میں رہ کر آپ اڑنے کا تصور کر سکتے ہیں؟ میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے بھی خواب دیکھے تھے اور اس وقت ڈیڈ کچھ حد تک میرے ساتھ میرے خوابوں کے پیچھے بھی دوڑے۔ مگر وہ زیادہ دیر ساتھ چلنے سے معذور تھے۔ جیسے میں نے کرکٹ کا بلا تھاما، تو یہ کہا گیا کہ ایک دن یہ بڑا کرکٹر بنے گا۔لیکن مجھے بچپن میں ہی اس خواب سے نکلنا پڑا کیونکہ میں ان بچوں میں سے تھا، جنہیں حادثے کم، بڑے زیادہ توڑتے ہیں اور اس لیے میں خوابوں کے پیچھے بھاگنے میں بھی معذور رہا۔

◆◆

وہ ڈائری اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔مگر ابھی میں وہ ڈائری نہیں کھولنا چاہتا۔ مجھے یہ بھی پتہ نہیں کہ اس وقت کتنے بجے ہوں گے۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ رات کی سیاہ چادر تن چکی تھی۔ ہوا تیز تھی۔ کھڑکی کے دروازے شور کر رہے تھے۔ میں نے ایک بار پھر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ یہ ایک خوفناک رات تھی۔ آسمان پر دور تک بادلوں کا سایہ تھا۔ کیا بارش ہوگی؟ ہوسکتا ہے...... موسلا دھار بارش ہو۔لیکن اس وقت ایک بارش میرے اندر بھی ہو رہی تھی۔ اور میں اندر ہی اندر اس بارش سے بھیگتا جا رہا تھا۔آنکھوں کے پردے پر اچانک میرے بیس برسوں کی زندگی روشن تھی۔ ان بیس برسوں کا ہر صفحہ روشن تھا۔مگر میری مجبوری یہ تھی کہ میں ان صفحوں کو کھولتے ہوئے گھبراہٹ محسوس کرتا تھا۔

◆◆

اچانک مجھے ممی کی آواز سنائی دی۔ وہ دیر سے مجھے آواز دے رہی تھیں اور اس لیے اب ان کے لہجے میں ناگواری اتر آئی تھی۔

'اوہ پاشا۔کہاں ہو تم......کھانا لگ گیا ہے۔اور یقیناً تمہیں اس وقت میرے ساتھ ہونا چاہیے۔تم سن رہے ہو پاشا......'

'ہاں۔ میں سن رہا ہوں۔ یا شاید نہیں سن رہا ہوں۔ میں ہوں یا شاید میں نہیں ہوں۔'

میں نے آہستہ سے اٹھنے کی کوشش کی۔ اٹھتے ہوئے میں نے ایک نظر ڈائری پر ڈالی......اور یہ کیا......ڈائری گم تھی۔ ڈائری کی جگہ ڈیڈ کھڑے تھے۔ مسکراتے ہوئے۔ ان کی آنکھوں میں بلا کی شوخی سمائی ہوئی تھی......

'تم بہادر ہو۔ اور میرے پیارے بیٹے بھی۔ اور تمہارے اندر ہمت کی کمی نہیں۔ خود کو تیار کرو پاشا۔ تم سن رہے ہونا......؟ آہ......تم پریشان ہو رہے ہو۔اور میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا۔مگر اب وقت آ گیا ہے۔ جب تمہیں اس زندگی کو، یعنی اپنی زندگی کو......وہ تم لوگ کیا کہتے ہو......میچیور۔ ہاں میچیور ہونے کا موقع دینا ہوگا۔ ہمیں ایک ہی زندگی ملتی ہے پاشا۔اڑان کے پنکھ کھولنے کے لیے۔اور اس اڑان کو ضائع مت کرنا......اب جاؤ بھی۔ممی تمہیں بلا رہی ہیں۔ پھر وہ خوامخواہ تم پر ناراض ہو جائیں گی......'

ڈیڈ غائب تھے اور اپنی جگہ دوبارہ ڈائری واپس آ گئی تھی......

◆◆

یہ کہنا زیادہ بہتر ہے کہ مجھے بھوک نہیں تھی۔ اور مجھے یہ بھی احساس ہے کہ ممی کی آنکھیں خوفناک حد تک میرا جائزہ لے رہی تھیں۔

'تو تم نہیں ہو۔یعنی اس وقت تم ہو کر بھی نہیں ہو پاشا۔'

’ہاں یہ زیادہ صحیح ہے۔‘

’اور تم نے ڈائری بھی نہیں کھولی۔؟‘

’یہ اتنا آسان نہیں ہے مام۔‘

’ہاں۔ میں سمجھ سکتی ہوں۔‘ ممی نے آہستہ سے دوبارا اس جملے کو دہرایا۔ ہاں یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ مگر...... آسان تو کرنا ہوگا پاشا۔ تمہیں اس الجھن سے باہر نکلنا ہوگا۔ اور اس کے لیے بہتر ہے کہ خود کو تیار کرو۔‘

میز پر آملیٹ والی پلیٹ خالی پڑی تھی۔ سارہ جہانگیر نے آگے بڑھ کر پلیٹ کو اٹھالیا۔ چشمہ سے جھانکتی ان کی آنکھوں میں کچھ ایسی چمک تھی کہ میں اس چمک کو دیکھ کر خوف محسوس کر رہا تھا......

’دیکھو تو پاشا۔ کیا اس پلیٹ میں کچھ ہے......؟‘

’نہیں تو......‘

’’لیکن ابھی کچھ دیر پہلے......‘ سارہ جہانگیر مسکرا رہی تھیں۔ اس میں آملیٹ تھا۔ اور وہ تمہاری پلیٹ میں گیا۔ پھر وہاں بھی نہیں ہے۔ لیکن دیکھو تو اس خالی پلیٹ میں آملیٹ کی نشانی باقی رہ گئی ہے...... یعنی کچھ دیر پہلے......‘‘

میں نے پلٹ کر ممی کی آنکھوں میں دیکھا۔ ان کی آنکھیں نم تھیں......

’اچھے لوگ کہیں نہیں جاتے۔ وہ اپنی نشانیوں کے ساتھ رہ جاتے ہیں۔ پلیٹ کا کیا ہے۔ دھل جائے گی اور نشانی بھی غائب۔ مگر اچھے لوگ...... اور دیکھو تو...... ہم مختلف موقعوں پر انہیں تلاش بھی کرتے رہتے ہیں۔‘

◆◆

’اچھے لوگ......‘ کمرے میں واپس آنے تک ممی کی باتیں ذہن و دماغ میں گونج رہی تھیں۔ ممی یہ بات بخوبی جانتی ہیں کہ مجھے ایسے بے جان فلسفوں سے نفرت اور گھٹن ہوتی ہے۔ کیا انسان کی موت کے ساتھ ہی اس کی برائیاں بھی مر جاتی ہیں؟ میں قطعی طور پر یہ ماننے کو تیار نہیں تھا۔ مگر...... مگر یہ چٹھی...... یہ خط۔ بار بار میں ڈائری کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اب میرے لیے گزرے ہوئے ان لمحات کو زندہ کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ یہ پر درد اور خوفناک سہی، مگر مجھے ان تکلیف دہ راستوں سے گزرنا تھا۔ ایک مختصر سی زندگی میں اگر کسی وجود کے ساتھ آپ گہری نفرت رکھتے ہیں تو اس کے پیچھے کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ میں اب بھی کشمکش میں تھا۔ ڈائری کھولوں یا پہلے ڈائری کھولنے سے قبل اپنی زندگی کے ان صفحوں میں جھانک آؤں...... جہاں سے میری نفرت کی ابتدا ہوئی تھی۔ میری آنکھیں بند تھیں۔ اور ایک گھنگھناتی ہوئی، شور کرتی ہوئی ریل اس وقت میری آنکھوں کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا، میں شروعات ڈیڈ کی ڈائری سے کروں گا۔

باب سوم

موت سے سامنا

جب ستارے چاندنی کے منتھن سے نور تیار کر رہے تھے تم ماچس کی تیلیاں لے کر آگ بنا رہے تھے۔ اور یہی وقت تھا جب یونانی اساطیر کا عظیم موسیقار اورفیس کے روحانی نغمے خاموش تھے اور وہ کائنات یہاں تک کہ چٹان، پہاڑ، ندیاں، درخت، قوس قزح، بادل، سمندر، آبشار تک تیزی سے بڑھتی ہوئی آگ کو دیکھ رہا تھا۔ جب دیوتا سمندر منتھن کر رہے تھے، وش کا پیالہ ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا، وہ اسی جگہ گرا جہاں نغموں کی موت ہوئی تھی۔ اوریفس کی خوبصورت بیوی جب زہریلے ناگ کا شکار ہوئی، اس نے اپنی حسین بیوی کو روحوں کی دنیا سے واپس لانے کا فیصلہ کیا۔ راستے میں ایک ندی ملی۔ ندی میں ایک کشتی تھی۔ اوریفس نے نغمہ چھیڑا اور موت کے دیوتا تک پہنچ گیا۔ موت کے دیوتا نے اوریفس کو، بیوی کو ساتھ لے جانے کی اجازت دے دی مگر ایک شرط رکھ دی۔ تم آگے رہو گے اور تمہاری بیوی پیچھے اور تمہارے راستے میں ایک تاریک دنیا ہوگی مگر خبردار پیچھے مڑ کر مت دیکھنا۔ اوریفس نے بیوی کا ہاتھ تھاما اور جیسے ہی تاریک دنیا سے باہر اس نے اُجالا دیکھا، اس کے دل میں اپنی حسین و جمیل رفیقۂ حیات کو دیکھنے کی خواہش ہوئی۔ اس نے رفیقۂ حیات کی آخری آواز سنی۔ الوداع...

اور یہی وقت تھا جب چاندنی کے منتھن سے نکلنے والا نور تاریک دنیا میں تبدیل ہو گیا۔ چاروں طرف وش ہی وش تھا۔ کچھ وش انسانی رشتوں پر بھی گرا اور ملک کے نقشے پر بھی۔

"Monsters exist, but they are too few in number to be truly dangerous. More dangerous are the common men, the functionaries ready to believe and to act without asking questions."

— Primo Levi

"The mystic: a sleepwalker dreaming he's awake."

—Marty Rubin

(۱)

سنو پاشا

ایک زندگی میں ایک انسان کے کئی چہرے ہو سکتے ہیں۔تمہارے بھی ہوں گے۔ سارہ کے بھی ہوں گے۔ دن اور رات مل کر ۲۴ گھنٹے ہوتے ہیں۔ اس حساب سے ایک زندگی میں ہم کتنا لمبا سفر طے کرتے ہیں۔ اس سفر میں ایسے بھی موڑ آتے ہیں، جن کا پتہ گھر والوں کو نہیں ہوتا۔ میرا بیٹا اسکول یا کالج میں اپنے دوستوں سے کیا باتیں کرتا ہے، کیا ہمیں اس کی معلومات ہوتی ہیں۔؟ میرے لیے گھر سب کچھ تھا۔ سارہ اور پاشا میری زندگی کے لیے سب سے خاص تھے۔مگر میری زندگی میں کچھ ایسے بھی موڑ آئے جہاں نہ تم تھے اور نہ سارہ تھی۔ یہ کہنا خود کا دفاع کرنا ہے کہ ایسے موڑ سب کی زندگی میں آتے ہوں گے۔مگر میری زندگی دوسروں سے مختلف تھی۔تمہیں اس ڈائری میں کچھ ایسے صفحات بھی ملیں گے، جو تمہیں پسند نہیں آئیں گے۔ اور پسند آنا بھی نہیں چاہیے۔ ایک زندگی میں ہم سے کچھ حماقتیں، غلطیاں بھی سرزد ہو جاتی ہیں۔ اور کچھ لمحے ایسے ہوتے ہیں، جن پر ہمارا بس نہیں چلتا۔ ایسے کچھ لمحے میری زندگی میں بھی آئے یا کچھ غلطیاں میری زندگی میں بھی سرزد ہوئیں۔لیکن اگر ان غلطیوں سے ایک انسان کا محاسبہ کیا جائے، تو پھر اب تک کی دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا نکلے جسے فرشتہ کہا جا سکے۔

پیارے بیٹے....

تو آخر میری ڈائری پڑھنے کے لیے تم نے خود کو تیار کر لیا...تم سوچ بھی نہیں سکتے، اس وقت مجھے کیسی خوشی ہو رہی ہے...خوشی؟ چونک گئے نا...میں زندہ کب ہوں کہ میرے پاس تمہیں دیکھنے کے لیے ایک زندہ جسم ہوگا...گوشت پوست کا ایک دھڑکتا ہوا جسم...اور اس جسم کے تمام سروں کو جگاتا ہوا میں تم کو دیکھ سکتا یا تم سے باتیں کر سکتا مگر پیارے پاشا...دیکھو تو، اس وقت میں ہوں۔ اور جیتا جاگتا تمہارے سامنے ہوں۔ اور یقین کے ساتھ کہ تمہارے ذہن میں اس وقت مجھے لے کر بہت سی پرچھائیاں اکٹھا ہو گئی ہوں گی۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم مجھے دیکھ رہے ہو.... یادوں میں ہی سہی، ممکن ہے...میری آواز بھی گونج

رہی ہو...اور یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت تمہارے چہرے پر کشمکش اور الجھنوں کی ہزار لکیروں نے بسیرا کرلیا ہوگا...
ہے نا پاشا...جھوٹ مت بولو...اور میں ابھی بھی قسم کھا سکتا ہوں کہ میرا بیٹا برے سے برے لمحات میں بھی جھوٹ نہیں بول سکتا...

تو میں زندہ ہوں پاشا۔اور تمہارے سامنے ہوں...جو اس دنیا سے چلے جاتے ہیں، خدا معلوم وہ کن دنیاؤں میں ہوتے ہیں۔خلا میں؟ جنت میں..؟ دوزخ میں...؟ نا معلوم دنیاؤں میں۔ممکن ہے، میری ہڈیاں بھی سڑ گل گئی ہوں...مگر دیکھو تو...اس لمحے میں، تمہارے سامنے ہوں...موت کے بعد کی زندگی کے بارے میں بہت سی کتابیں پڑھی تھیں۔اور جیسا تم جانتے ہو کہ لکھنا پڑھنا میرا شوق تھا اور اس شوق نے بھی تمہیں مجھ سے دور کیا تھا۔کیونکہ تمہارے لیے وقت نہیں ہوتا تھا میرے پاس...اب لگتا ہے، وقت ہونا چاہیے تھا۔انگلیوں پر شمار کرتا ہوں تو تمہارے ساتھ کے جسمانی لمحے بہت ہی کم ہیں۔ اور روحانی لمحات کا ایک ایک لمحہ میں نے تمہارے ساتھ بسر کیا...جھوٹ...ہے نا؟ تمہارے چہرے پر ناراضگی کو دیکھ رہا ہوں اور مجھے اس بات کا ملال نہیں کہ تمہیں میری باتیں جھوٹی لگ رہی ہیں۔زندہ انسان جھوٹ بول سکتا ہے تو مرنے والا بھی جھوٹ بول سکتا ہے...کیا زندوں اور مردوں میں بہت زیادہ فرق ہے؟ یہ کہنا میرے لیے آسان نہیں۔کاش۔کوئی ایک سائنسی مشین ہوتی کہ مردہ انسان چلتا پھرتا ہوا تمہاری دنیا کو دیکھ سکتا تو یقین جانو، میں صرف تم سے ملتا اور اس لیے کہ تم میرے سب سے پیارے بیٹے ہو...میں تمہارے اندر کی ناراضگی کو دور کرنے کی کوشش نہیں کرتا...صرف تم سے اتنا کہتا کہ ابھی اپنی عمر کو اور جواں ہونے دو۔اس لیے کہ زندگی کے تجربے ہی سچ اور جھوٹ کی اصلیت سے پردہ اٹھاتے ہیں اور اسی لیے میں نے دو سال انتظار کیا۔؟ اس وقت تم اٹھارہ کے تھے اور مجھے میرے وائبریشن نے، تم چھٹی حس بھی کہہ سکتے ہو، نے بتا دیا تھا کہ میں اب تمہاری دنیا میں چند دنوں کا مہمان ہوں... پہلے مجھے خیال آیا تھا کہ تم سے مکالمہ کرنا چاہیے۔مگر تم سے کیا مکالمہ کرتا؟ تم روٹھے رہتے تھے۔ناراض رہتے تھے۔ مجھے اکثر نظر انداز کردیتے تھے...ایسے میں کوئی مکالمہ ہوتا بھی تو کیسے؟ اور یہ سوال بھی تمہارے ذہن میں اٹھ رہا ہوگا کہ آخر اس ڈائری کے لیے میں نے دو سال انتظار کیوں کیا۔؟ دو سال...یہ بحث دلچسپ ہے۔ میں نے اس وقت بھی، ڈائری ختم کرنے کے بعد تمام امور پر غور کیا تھا۔اور اس وقت وہ باتیں تمہارے سامنے رکھ رہا ہوں۔

میرے لیے یہ جاننا مشکل تھا کہ اپنی عمر کو لے کر تم کیا سوچتے ہو؟ درخت سے ٹوٹ کر سیب کو گرتے ہوئے بہت سے لوگوں نے دیکھا ہوگا۔لیکن نیوٹن نے اس عمل کو خاص انداز میں دیکھا اور Gravity کے قانون کو دریافت کرلیا۔تم میرے لیے ایک Complicated child تھے۔ساتھ ہی تم Introvert بھی تھے۔اور اس لیے صرف تم کو دیکھ کر بہت کچھ جان لینا میرے لیے آسان نہیں تھا۔اپنی سوچ کو وسعت دینے کے لیے اکثر میں Brain storming کا راستہ اختیار کیا کرتا۔دراصل یہ طریقہ کسی مسئلے کا زیادہ سے زیادہ حل تلاش کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ میں اپنے ذہن کے مختلف گوشوں کو کھول دیا کرتا تھا۔اور اس طرح مختلف گروپ بن جاتے تھے۔تم اٹھارہ کے ہوگئے تھے اور میرے لیے یہ جاننا ضروری تھا کہ تم سیکس کے بارے میں کیا سوچتے ہو؟ لڑکیوں کو تم کس نظریے سے دیکھتے ہو؟ مجھے خیال ہے کہ ۱۸ برس کی عمر تک میں کئی طوفان سے گزر آیا تھا۔یہاں طوفان سے یہ مطلب قطعی نہیں ہے کہ میں سیکس کو جان چکا تھا یا اس مرحلہ کو پار کر آیا تھا۔ میں ان سونامی لہروں یا ہلچل، یا اس جسمانی طغیانی کا گواہ تھا جو اکثر ساری ساری رات یا سارہ سارہ دن مجھے پریشان کیا کرتے تھے۔مثال کے لیے میں چھوٹی عمر سے کچھ ایسی کتابیں پڑھنے لگا تھا، جن میں جوان ہونے کے نسخے ہوتے تھے۔تصاویر ہوتی تھیں۔ میں نے تمہارے پاس ایسی کوئی کتاب نہیں دیکھی تھی۔ پھر بھی تم اٹھارہ کے ہوگئے تھے۔ اور میں تمہیں سمجھنا چاہتا تھا۔اٹھارہ کو دو برس پیچھے کرلو تو بالغ ہونے کی عمر سے دو برس کم...یعنی دو برس قبل تم اتنے میچیور نہیں تھے جتنے ۱۸ میں ہوئے۔لیکن میرا ماننا ہے کہ ۱۸ کی عمر بھی کسی سنجیدہ مسئلہ کو سمجھنے کے لیے کم ہے۔اور اس لیے میرا خیال تھا کہ اس ڈائری کو پڑھنے کے لیے تمہیں دو برس اور انتظار کرنا چاہیے۔دو برس انتظار کے لیے کچھ باتیں اور بھی ہیں جو ابھی تم کو نہیں بتا سکتا۔اس کے لیے تمہیں میری

ڈائری سے گزرنا ہوگا۔ اب یہ دو برس کا معاملہ بھی کتنا عجیب ہے بیٹے۔ دو برس قبل میں تمہارے درمیان تھا۔ اور دو برس بعد میں اس کرۂ ارض یا تمہاری کائنات کا حصہ نہیں ہوں... ہے نا عجیب بات۔ اور یہ بھی کہ اس لمحے میں دوبارہ تمہارے سامنے جی اٹھا ہوں۔ ایک پہلو اور بھی ہے۔ ممکن ہے، ان دو برسوں میں میرے لیے تمہارے اندر کی نفرت میں کمی آ گئی ہو۔ پتہ نہیں یہ لفظ نفرت یہاں صحیح ہے یا نہیں۔ اسے تم غصّہ کا نام بھی دے سکتے ہو۔ اور اس وقت بھی تمہارے چہرے پر ابھرتی غصے کی لکیروں کو میں صاف دیکھ رہا ہوں..سنو..کچھ دیر کے لیے یہ ڈائری بند کر دو۔ وہاٹس اپ کر لو۔ یا جو تمہاری مرضی...اس لیے کہ آگی کے سطور میں کچھ دھماکے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ ایک میچیور عمر ہر واقعہ کا تجزیہ کرنے، مختلف پہلوؤں کو سمجھنے اور حقیقت تسلیم کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں، یہ حوصلہ تمہارے پاس بھی ہے۔

◆◆

پیارے پاشا مرزا

تو تم واٹس اپ پر نہیں گئے۔ فیس بک پر بھی نہیں۔ کیوں؟ جانے دو۔ جواب دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں تمہیں دیکھ سکتا ہوں۔ اور مجھے یقین ہے۔ اس درمیان تم نے اپنی آنکھیں بند کر لی ہوں گی۔ تمہارے اندر کیسی کشمکش چل رہی ہوگی۔ یہ اندازہ لگانا میرے لیے مشکل ہے۔ مگر یقین ہے، الجھن اور اندرونی کشمکش نے تمہیں اپنے جال میں ضرور جکڑ لیا ہوگا۔ تم نے سر کرسی سے لگا دیا ہوگا اور بس تھوڑی دیر بعد ہی تمہاری نگاہیں ان سطور پر دوڑ رہی ہوں گی۔

یہ کہانی کب سے شروع کروں؟

مجھے تاریخ کی اندھیری گپھاؤں میں جانا کبھی پسند نہیں آیا۔ ماضی سے زیادہ میرا بھروسہ حال پر رہا۔ میں نے کبھی مستقبل کی طرف نہیں دیکھا۔ اور یہی شاید میری بھول تھی۔ مجھے دیکھنا چاہیے تھا۔ میرے چاروں طرف کتابوں کی ایک عمارت تھی۔ عمارت؟ میں اسے دنیا بھی کہہ سکتا تھا۔ کتابوں کی دنیا۔ مگر عمارت کہنا اس وقت مجھے پسند ہے۔ یہ کتابیں تھیں جو کب انجانے میں میری دوست بن گئیں، مجھے پتہ بھی نہ چلا۔ اور یہ کہانی بھی اس ماضی سے وابستہ ہے، جس کی طرف پلٹ کر دیکھنے سے مجھے ہول آتا ہے۔ ایک بے رونق مکان کے بام و در مجھے آواز دیتے ہیں۔ میں یہ سب چھوڑ کر وہاں آ گیا تھا، جہاں آج تم ہو۔ مگر تب تم پیدا کہاں ہوئے تھے...سارہ زندگی میں آ گئی تھی...اور کبھی کبھی اس کے چہرے پر وہی الجھنیں ہوتیں، جو ابھی اس لمحہ تمہارے چہرے پر ہیں۔ سارہ کئی معاملوں میں دنیا کی تمام عورتوں سے مختلف ہے۔ مثال کے لیے، اس نے بتایا کہ آزادی کا احساس کیا ہوتا ہے اس نے بتایا کہ اس کے علاوہ بھی ایک آزادی ہے، جو میرے پاس ہونی چاہیے۔ مثال کے لیے اس نے بتایا کہ بھروسہ ایک ایسی گانٹھ ہے، جس کے کمزور ہونے اور ٹوٹنے کا سوال ہی نہیں۔ مثال کے لیے سارہ میری زندگی میں چور دروازے سے تب داخل ہوئی، جب آوارگی اور بے سرو سامانی نے مجھے اپنی دنیا کا تنہا آدم بنا دیا تھا۔ لفظوں کے سوا میری کسی سے دوستی بھی نہیں تھی۔ اور میں لفظوں کے لیے خود غرضی کی حد تک خود غرض تھا...مگر اب... تمہارے آنے کی پیش قیاسی ہو چکی تھی...

تب ہم ایک چھوٹے سے مکان میں تھے۔

اس مکان میں روزن نہیں تھے۔ کھڑکی نہیں تھی۔

اس مکان میں روشنی نہیں تھی...

ایک دن اچانک رات کے وقت وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔اس نے میری طرف دیکھا...اور یہ تمہارے ہونے کا پہلا اعلان تھا....

' سنو،وہ...آنے والا ہے..'

کب....؟

' بس وہ آنے والا ہے۔اورتم اس کی آہٹ سن سکتے ہو...کوشش کروتو اس کی دھڑکنوں کی صدا بھی محسوس کر سکتے ہو.....'

'سچ...؟

'زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں۔سمجھے...وہ آنے والا ہےاورتمہاری ذمہ داریاں بڑھنے والی ہیں...'

'مگر کیسے؟'

' کیاتم اسے اس گھر میں لاؤ گے؟ یہاں روشنی نہیں ہے۔زندگی نہیں ہے۔'بجھے ہوئے پتھروں کے قید خانے میں وہ نہیں آئے گا...سن رہے ہوتم...'

'ہاں...'

' وہ آنے والا ہے۔اورتمہیں تمہاری کتابوں کی دنیا سے دور بھی لے جائے گا..'وہ ہنس رہی تھی...

' لیکن میں تو ان جاندار اور مردہ الفاظ کے سوا کچھ جانتا بھی نہیں۔'

' تو جانو نا...کس نے کہہ دیا کہ زندگی کی طرف پلٹ کر مت دیکھو...جلد ہی وہ پورے گھر میں رقص کرے گا۔مگر..اس گھر میں نہیں۔اس قید خانے سے کہیں دور....سن رہے ہوتم...'

' ہاں۔'

لیکن پریشان مت ہو،میں ہوں..میں ساتھ دوں گی تمہارا۔

' کیسے؟'

' جیسے میں ہمیشہ ساتھ دیتی ہوں...'وہ کھلا کھلا کر ہنس پڑی۔

'میری آزادی پر قدغن لگانے کی کوشش تو نہیں ہو رہی۔'

' آزادی...'وہ پھر زور سے ہنسی...اور یکا یک سنجیدہ بھی ہو گئی۔ممکن ہے آزادی کا کوئی انفرادی تصور ہو تمہارے پاس..لیکن یہ احساس اجتماعی ہوتا ہے۔یہ صرف تمہارا احساس نہیں ہے۔سمجھ رہے ہونا...ہم الگ الگ آزادی چاہنے والے لوگ ہیں۔لیکن سوچو،تو ہماری آزادی کا تصور ایک ہے۔جو آرہا ہے وہ بھی تمہاری آزادی کا ایک حصہ ہے..ٹھیک اسی طرح جیسے ایک حصہ میں ہوں..جیسے ایک آزادیٔ اظہار تمہارے پاس ہے۔تم کچھ بھی سوچنے اور لکھنے کے لیے آزاد ہو....مگر اس آزادی میں بھی تم تنہا نہیں ہو۔سنو...آزادی کسی ایک کا تصور ہے ہی نہیں...ایک بہاؤ ہے جہاں ہم ایک دوسرے کے جذبوں کا بھی احترام کرتے ہیں...یہ سوئٹر کیسا لگ رہا ہے؟

'سوئٹر...؟

'ہاں تمہارے لیے بُن رہی ہوں..'

'سارہ کیوں بُن رہی ہو..جبکہ تم جانتی ہو کہ......وہ آنے والا ہے...ابھی،تمہیں محنت والا کوئی کام نہیں کرنا چاہیے..'

' ہو..ہو..شکر ہے...اپنی ذمہ داری کا خیال آیا...میرا خیال آیا۔مگر گھبراؤ مت اس کام میں کوئی محنت ومشقت نہیں لگتی..تمہیں اچھا دیکھنا چاہتی ہوں بس... یہ شیو کیوں بڑھی ہوئی ہے؟ جاؤ ابھی داڑھی بناؤ،اور ہاں...کل ڈاکٹر کے یہاں سے لوٹتے ہوئے تھوڑی

شاپنگ بھی کی تھی، تمہارے لیے دو شرٹ لائی تھی۔...'

' اور اپنے لئے..'

' میرے پاس پہلے سے ہی کوئی کمی نہیں۔ پھر اپنے لیے کیوں لاتی؟... مجھے اپنے لیے کوئی شوق نہیں۔ مگر تمہارے لیے ہے... اور سنو... تم جانتے ہو نا، اس بارے میں، میں زیادہ گفتگو کرنا پسند نہیں کرتی.. اب جیسا کہتی ہوں، ویسا کرلو۔ مگر ہاں.. سنو.. وہ آنے والا ہے اور میں بھی اب تبدیل ہو رہی ہوں...

' مطلب....؟'

' مطلب کہ تبدیل ہو رہی ہوں..'

اچھا.. تبدیل ہو کر ونڈر لینڈ کی ایلس بن جاؤ گی...

ہاں تمہیں یقین نہیں۔ ساری زندگی تو پریوں، شہزادیوں کے قصوں کے درمیان رہے ہو تم... اب میں ایک پری بننے والی ہوں.. ہوسکتا ہے۔ ہوسکتا ہے ونڈر لینڈ ایلس... یا کچھ بھی۔ مگر.. تبدیلی... بہر حال ایک تبدیلی آنے والی ہے..'

میں نے ہنسنے کی کوشش کی۔ مگر پہلی بار محسوس ہوا۔ میری ہنسی اندر ہی اندر کہیں کھو گئی ہے۔ میں غور سے سارہ کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ اس نے دوبارہ سوئٹر ہاتھوں میں اٹھا لیا.. نظریں جھکا لیں۔ پھر نظر اٹھا کر مجھے دیکھا...' اس تبدیلی پر تم نے کیا سوچا؟'

' میرے پاس سوچنے کے لیے ہے ہی کیا؟'

' مطلب۔؟'

' تم کہہ سکتی ہو، تمہاری بات سمجھ نہیں پایا...

اس میں سمجھنے کی کون سی بات تھی..'

' تو یہ تبدیلی کیا ہے..'

' یہی تو پوچھ رہی ہوں..'

' کسی سے رومانس....'

' اور آگے سوچو..'

' تم کہیں جانے والی ہو.... مجھے چھوڑ کر..'

' اور آگے..'

اس بار میں لاوڈ تھا..' پاگل مت بناؤ سارہ... یہ کیا ہے.. تبدیلی، تبدیلی کی کیا رٹ لگا رکھی ہے...

' اگر میں رومانس کروں تو ؟'

' کر سکتی ہو..'

' جیسے تم کرتے ہو...؟' سارہ زور سے ہنسی...

میں نے بھی ہنسنے کی کوشش کی.. آزادی پر اکیلے میں نے اپنا نام کب لکھا ہے... یہ تم بھی جانتی ہو... میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں جو آزادی کو صرف اپنے حصے کا گوشت سمجھتے ہیں..'

' گوشت؟' سارہ چونک گئی تھی... اپنے حصے کی سبزی کیوں نہیں؟'

’کیونکہ آزادی کے معاملے میں سب نان ویجیٹیرین ہوتے ہیں...سالے...‘

’گالی مت دو یار...‘ سارہ زور زور سے ہنس رہی تھی۔..سنو، غور سے: خود کو ابھی آئینہ میں دیکھ لو...اس طرف، آئینہ ادھر ہے...ذرا سا گھومو...اچھا مت گھومو...تمہاری ناک پر غصہ رکھا ہوتا ہے۔ اچھا بولو...آزادی کا بس ایک ہی تصور ہے تمہارے پاس...ویج یا نان ویج...؟‘

’نہیں۔‘ اس بار میری آواز سرد تھی۔ اب اندر ایک کشمکش شروع ہو گئی تھی۔ یہ سارہ کو کیا ہو گیا ہے آج...کیا جاننا چاہتی ہے؟ کہیں سارہ کسی اور مرد کے چکر میں تو نہیں پڑ گئی، پڑ گئی تو.....! پہلا سوال تو یہی کہ اسے کیوں نہیں پڑنا چاہیے۔ اور پڑ گئی تو مجھے اتنا پریشان ہونے کی ضرورت کیا ہے۔ اور دوسرا اہم سوال، میں اس کی پرسنل لائف میں....سنسر شپ لگانے والا ہوتا کون ہوں؟ ایک زندگی میرے پاس ہے تو ایک اس کے پاس بھی ہے اور اسے اپنی پرسنل زندگی جینے کا مکمل حق ہونا چاہیے...میرے اندر کا سیوڈو انٹلیکچو ل جیت گیا تھا۔ اب میرے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ سارہ میرے اندر کی کشمکش کو دیکھ رہی تھی...اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پلکیں جھپکائیں...اس بار اس نے زور زور سے ہنستے ہوئے کہا....تو نہیں سمجھ سکے تم...

’نہیں۔‘

’تمہارا شارٹ کٹ اکثر بجلی کے ننگے تاروں سے ٹکرا جاتا ہے۔ سنو، اب میں ایک بیوی سے زیادہ ہو گئی ہوں...

’مطلب۔‘

’مطلب کچھ نہیں۔‘ وہ زور زور سے ہنس دی۔ ہر بار مطلب کیوں پوچھتے ہو۔‘ اس نے دوبارہ پلٹ کر دیکھا۔ مطلب کی طرف جاتی ہوئی سرنگ کے دروازے پر پہلے ایک وزنی پتھر رکھا تھا۔ دروازہ اب کھل گیا ہے۔‘ وہ شرارت سے ہنستے ہوئے دوبارہ سوئٹر بننے میں لگ گئی تھی...

پیارے بیٹے...

مجھے اس طویل مکالمے کے لیے معاف کرنا...میں تمہاری عمر کی پریشانی سمجھ سکتا ہوں۔ تمہارے یہاں جلد بازی ہے...صبر نہیں ہے...تم فاسٹ ہو...اتنے فاسٹ کہ گھر کے ذائقہ کی جگہ تم فاسٹ فوڈ پسند کرتے ہو...آگے ایسا بہت کچھ ہے، جسے بتانے کے لیے شاید میرے الفاظ کمزور ہو جائیں۔

مجھے سارہ کی باتوں سے کوفت محسوس ہوئی تھی۔ کچھ بتاتی نہیں۔ بس پہیلیاں بجھا کر رہ جاتی ہے۔ لیکن مجھے اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے...

◆◆

ہماری پلکوں کے درمیان چاند نما جو ایک چھوٹا سا سفید دائرہ ہے،‘ اس میں کیا ہے؟ آگے کی روشنی اور پیچھے چھپی ہوئی یادیں— سیپ کے اندر بند یہ سفید دائرہ چوبیس گھنٹے جھولا جھولتا رہتا ہے کبھی ہم آگے دیکھتے ہیں اور کبھی یہ دائرے ہزاروں لاکھوں یادوں کے سرمایے کو سامنے لے کر حاضر ہو جاتے ہیں۔ ایک سیکنڈ میں۔ سائنس کے معجزات سے زیادہ اہم مجھے یہ دائرہ لگتا ہے۔ مجھے زندگی سے کوفت ہوتی تھی تو سناٹے میں اکثر اس جھولے کو ماضی کے سفر پر لے جاتا.....وہ میرے اپنے ہوتے تھے پاشا۔ ممی، ڈیڈی....انکل... پوری فوج....سب مجھے گھیر کر بیٹھ جاتے۔

ابھی تم بھی یہی کرو۔سیپ کے اندر سے اس جھولے کو آواز دو...

ہا...یہ.....دیکھو...میں تمہارے سامنے ہوں...جبکہ میں نہیں ہوں...تم آواز بھی دینا چاہو گے تو میں نہیں آؤں گا۔مگر میں ابھی اس وقت ہوں....تمہارے سامنے۔اور دیکھوتو پاشا،تم مجھے ہر زاویہ سے دیکھ رہے ہو۔ممکن ہے،ان میں سے ایک وہ تصویر بھی ہو جہاں آخری بار مجھے دیکھ کر تمہارے اندر رحم کے کسی جذبے نے چپکے سے سر نکالا ہوگا۔ہے نا.... پاشا؟ ابھی میں زندہ ہوں تمہارے سامنے۔ ہزاروں کولاژ،ہزاروں تصویروں میں۔جبکہ حقیقت تم بھی جانتے ہو۔میں نہیں ہوں....کہیں نہیں ہوں۔

(۲)

فنتاسی میں ہم خود سے زیادہ قریب ہوتے ہیں

پیارے پاشا مرزا

ایک دنیا تبدیل ہورہی تھی اور میں زندگی کی جنگ ہار گیا تھا۔میرا جسم دنوں تک کمزور ہوتا جارہا تھا اور مجھے شدت سے اس بات کا احساس تھا کہ میں کبھی بھی مر سکتا ہوں۔ایک ایسی موت جس سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔مگر سارہ مرنے کے بعد بھی مجھے مرنے نہیں دے گی۔اور تمہارے لیے زندگی میں بھی میری موجودگی نہیں کے برابر تھی۔یعنی میں تھا۔مگر نہیں تھا۔

میری زندگی میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے تھے جنہیں تمہیں بتانا ضروری سمجھتا تھا۔

نہیں۔یہاں تم غلط ہو۔میں تمہیں۔پرانی یادوں کے کسی غار یا ملبہ نما حویلی میں نہیں لے جانا چاہتا۔میں اپنا دفاع نہیں کرنا چاہتا۔میں ان واقعات کے پیچھے دوڑنا نہیں چاہتا،جہاں تم میرے لیے نفرت کا ایک مجسمہ تیار کر چکے ہو۔مجھے احساس ہے کہ میں ایک اچھا باپ ثابت نہیں ہوا۔اور ڈائری کے ان چند صفحات میں،میری ایسی کوئی کوشش نہیں کہ میں تمہیں یہ بتاؤں کہ میں ہمیشہ تمہارے بارے میں سوچا کرتا تھا۔یہ فیصلہ تم ہی کرو گے۔اور زندگی تمہیں یہ موقع بہت دے گی کہ تم اس بارے میں مزید گہرائی کے ساتھ غور کر سکو کہ انسان کی کون سی صفات اسے بہتر آدمی میں تبدیل کرتی ہیں۔ان دنوں بہت کچھ تبدیل ہورہا تھا اور میرا جسم آہستہ آہستہ زندگی سے رشتہ ختم کرتا جارہا تھا۔انہی دنوں خیال آیا کہ مجھے یہ ڈائری لکھنی چاہیے اور تم کو یہ ڈائری پڑھنی چاہیے۔ہم وہ نہیں ہوتے،جو نظر آتے ہیں۔ہم پر ایک تاریخ کا سایہ ہوتا ہے۔تاریخ ہماری تربیت میں بڑا کردار انجام دیتی ہے۔ہم تاریخ کے پیچھے کسی سایے کی طرح چلتے ہیں اور ہماری حالت اس کچھوے جیسی ہوتی ہے جو زمین پر آہستہ آہستہ رینگ رہا ہوتا ہے۔بہت تیز چلتے ہوئے بھی دراصل ہم کچھوے کی طرح رینگ رہے ہوتے ہیں۔اور پرانی تاریخ ایک دم سے غائب ہو کر نئی تاریخ بننے کی کوشش کررہی ہوتی ہے۔تم ایک نئی تاریخ کا حصہ بن رہے ہو اور اس تاریخ میں پرانی تاریخ کے جراثیم اور رنگ وروغن بھی شامل ہیں،جیسے میں،زندگی بھر تقسیم،ہجرت اور فسادات کے کرب سے باہر نہیں نکل سکا۔اور یہ خیال مجھے بار بار آتا رہا ہے کہ میرا پاشا ان صعوبتوں کا شکار نہ ہو،جن کا شکار ہم ہو چکے ہیں۔مگر تمہارے بڑے ہونے تک یہ دنیا اسی طرح تبدیل ہو چکی ہے جیسے تمہارے لیے چاکلیٹ اور آئس کریم کا ذائقہ پرانا ہو گیا ہے۔پزا اور برگر کے معاملے میں بھی تم چوزی ہو گئے ہو۔تمہاری نسل نے آسمان اور قدرت کے مناظر میں دلچسپی لینا بند کردیا۔تم ایک بند کیبن میں

سمٹ گئے۔لیکن ایک دنیا بند کیبن سے باہر بھی ہے۔اور باہر ایک فنتاسی ہم سب کا انتظار کر رہی ہے۔اور میں اس بات کا قائل ہوں کہ فنتاسی سے گزرتے ہوئے ہم خود سے زیادہ قریب ہوتے ہیں اور فنتاسی حقیقت کا ہی ایک چہرہ ہوتی ہے، جسے فنتاسی کا نام دے کر ہم زندگی کی حقیقتوں کو خود سے بھی چھپا لے جاتے ہیں۔

◆◆

ایک دلچسپ فنتاسی کا حصہ بی مشن تھا، جس نے آہستہ آہستہ سیاست سے سماج، معاشرے اور ثقافت پر قبضہ کر لیا تھا۔ پورا ہندوستان اچانک ان کے ہاتھوں میں آ گیا تھا۔یہ آن لائن ممبرز بنا رہے تھے۔اور ان کے ممبرز کی تعداد کروڑوں تک پہنچ گئی تھی۔اس کے بعد بی مشن والے اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں میں پھیل گئے۔انہیں روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں تھا۔صبح 8 بجے سے یہ لوگ دو چار میز کرسیاں لگا کر بیٹھ جاتے اور اسکول کے بچوں سے لے کر یونیورسٹی کے طلبا تک کو مشن کا ممبر بنا لیتے۔ان کی مخالفت کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ایک اسکول سے دوسرے اسکول، ایک شاخ سے دوسری شاخ، ایک ریاست سے دوسری ریاست، یہ پورے ملک میں بلکہ چپہ چپہ پر پھیل گئے تھے۔معاملہ یہیں تک نہیں رہا، بی مشن نے شہر، گاؤں کے سڑکوں چوراہوں پر بھی ممبر بنانے کا کام شروع کر دیا تھا۔اس سے ممبر بننے والوں کو کئی فائدے تھے۔جو کام ڈٹرجنٹ جنٹ سوپ یارن صابن نہیں کر پاتے تھے، وہ کام آسانی سے بی مشن کا حصہ بنتے ہی ہو جاتا۔مجرموں کے گناہ دھل جاتے۔دست درازی اور ریپ کے گناہگار ملزمین کو آزادی مل جاتی۔طور طریقے اس حد تک بدل گئے کہ جب ایک مسلم چھوٹی سی بچی کے ساتھ گینگ ریپ ہوا تو گینگ ریپ کرنے والوں کی حمایت میں وکلا اور دانشوروں نے جلوس نکالا، یہ سارے لوگ بی مشن کے لیے کام کرتے تھے۔اخبار سے لے کر میڈیا تک بی مشن کا حصہ بن گئے تھے۔اور ان کے ذریعہ مخصوص نظریات پورے ملک میں فروغ دیے جا رہے تھے۔اسپورٹس، فلم، سول سوسائٹی پر بی مشن اپنا کام ایمانداری سے کر رہا تھا۔بی مشن نے کچھ ہی عرصہ میں ملک کی تمام سیاسی پارٹیوں کو اپنے شکنجے میں لے لیا۔اور آہستہ آہستہ ریاستی سطح کی پارٹیوں کا وجود ہی ختم ہو گیا۔بی مشن کی فنتاسی کا جواب نہیں تھا۔جو لچے شہدے تھے، وہ نیک نام بن گئے۔جن پر بڑے بڑے الزام تھے وہ گناہوں سے پاک قرار دیے گئے اور یہاں تک کہ لوک سبھا اور راجیہ سبھا کے ذریعہ وہ بی مشن کی حکومت کا حصہ بھی بن گئے۔

بی مشن والوں کی اصل طاقت مخالفت کی تھی۔لبھو داس نے ایک غریب مسلمان مزدور کا قتل کیا۔اس کی لاش کو جلایا۔ویڈیو بنایا۔ راتوں رات لبھو داس ہیرو بن گیا۔ایک مخصوص طبقہ کو پاکستان اور قبرستان بھیجنے والوں کی راتوں رات لاٹری نکل آئی۔سینٹرل جیل سے رہا ہونے والے آٹھ قیدیوں کو رہائی منظور نہیں تھی۔ان آٹھ لوگوں نے چادر کی رسیاں تیار کیں اور آرام سے جیل کی اونچی دیوار پر چڑھ گئے۔پھر جینس اور ٹی شرٹ پہن کر ایک چٹان پر چڑھ گئے۔پولیس نے آرام سے ان کا انکاؤنٹر کر دیا۔دہشت گردی ترمیم بل سے یہ فائدہ ہوا تھا کہ سپریم کورٹ سے رہائی مل جانے کے باوجود حکومت کے لیے متعلقہ شخص کو دہشت گرد ٹھہرانے کی پوری آزادی ملی ہوئی تھی۔ 'کیمرہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔'اب کیمرہ ثبوت نہیں تھا۔بی مشن اپنے منصوبوں کے نزدیک پہنچ رہا تھا۔اور دیکھا جائے تو ان میں سے زیادہ تر حادثے یا واقعات میرے لیے فنتاسی کا درجہ رکھتے تھے۔یہ لوگ چپہ چپہ پر پھیل گئے تھے اور زعفرانی طاقتیں اس اجگر کی طرح تھیں، جس کے منہ کھولتے ہی محلے کے محلے سلگ اٹھتے تھے۔

ادیب اور صحافی کا فرض نبھانا آسان نہیں ہوتا۔میرے سامنے کئی رکاوٹیں ہیں۔جن سے گزرنا آسان نہیں۔جنہیں پار کرنا دنیا کے ساتوں سمندر کو پار کرنے سے زیادہ مشکل کام ہے۔مثال کے لیے آپ کو آسمان کی وسعتوں میں جگمگاتے بیشمار تاروں کو گننے کے

لیے کہہ دیا جائے اور آپ جانتے ہیں کہ یہ کام ناممکنات میں سے ایک ہے۔ تاریخ کے زندہ صفحات ظلم و بربریت کی ہولناک داستانوں سے آج بھی تھرتھراتے ہیں۔ ان میں پہلی اور دوسری جنگ عظیم کی تباہیاں بھی شامل ہیں۔ ان جنگوں کا ذائقہ کچھ ایسا تھا کہ ایک زمانے تک اندھی اور بیمار نسلوں کو ان تباہیوں کا بوجھ اٹھانا پڑا۔ لیکن اب جو سیاسی منظر نامہ میرے سامنے ہے، اسے دیکھتے ہوئے خیال آتا ہے کہ نئے واقعات اور حادثات کی روشنی میں ان تباہیوں کا افسانہ کچھ زیادہ اثر انگیز نہیں ہے۔ مثال کے لیے توپوں سے زندہ انسانوں کو اڑا دینا، بھوکے شیر کے پنجروں میں چیختے ہوئے زندہ غلاموں کو ڈال دینا، نازیوں کا گیس چیمبر، جہاں مجرموں کی کراہیں سخت اور پتھریلی دیواروں میں شگاف کر دیتی تھیں۔ آگے بڑھیے تو تاریخ کے نئے باب میں داعش اور طالبان جیسی دہشت گرد تنظیموں کی خوفناک وارداتیں شامل ہیں۔ انسانی کٹے ہوئے سر کو ظالمانہ انداز سے فٹ بال کی طرح اچھالنا یا معصوم ننھے بچوں کی لاشوں پر کھڑے ہو کر قہقہہ لگانا.... انقلاب کی ایسی ہزاروں تاریخ کے صفحے پلٹیے تو ان خوفناک وارداتوں کی کڑیوں کو آپس میں جوڑنا بھی کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ ان کہانیوں میں ہر تانا شاہ ایک بیڈ مین، ایک ظالم حکمراں، ایک ولن ہے۔ مگر معاف کیجیے گا، اچانک تاریخ نے ندی کی طرح اپنا رُخ بدل دیا۔ سب کچھ اُلٹ پلٹ ہو گیا۔ تعریفیں بدل گئیں۔ نظریہ بدل گیا۔ بیڈ مین نے اصلی ہیرو کی جگہ لے لی۔ مجرم، معصوم بن گیا۔ معصوم، مجرم بن گئے۔ انصاف کی عمارتوں پر سیاہ کہرا چھا گیا۔ ایک ادیب ہوتے ہوئے تازہ واردات کی کڑیاں جوڑنا چاہتا ہوں تو سوائے ناکامی کے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ ان کڑیوں کو جوڑتے ہوئے میں جن نتائج پر پہنچنا چاہتا ہوں وہاں گہری دھند ہے یا وقت کی دھول جمی ہے۔ نہ ختم ہونے والا اندھیرا ہے۔ اور جیسا میں نے کہا.... تاریخ اُلٹ پلٹ ہو گئی ہے۔

اس زمانے میں میرے والد اسلم مرزا حیات سے تھے۔ وہ کم بولتے تھے۔ چہرہ روشن اور کتابی۔ سفید داڑھی۔ اجلا شفاف کرتا پائجامہ پہنتے تھے۔ اور پانچوں وقت کے نمازی تھے۔ تہجد اور چاشت کی نماز بھی قضا نہیں ہوتی تھی۔ بی مشن کی کامیابیوں کو دیکھ کر میں نے سوال کیا تھا، کیا اب بھی آپ کو لگتا ہے کہ ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ صحیح تھا؟

' ہاں۔ پاکستان میں کیا نہیں ہو رہا۔ جب سے بنا ہے، خانہ جنگی میں الجھا ہوا ہے۔ یہاں تو پھر بھی غنیمت ہے، وہاں اپنے اپنوں کو ہلاک کر رہے ہیں۔'

' ممکن ہے، ہم وہاں زیادہ محفوظ ہوتے۔'

' بالکل بھی نہیں۔ ہم ایک گھٹن بھری زندگی کا شکار ہو جاتے۔'

' لیکن یہ بی مشن۔؟ اب ہم میں سے کوئی محفوظ نہیں۔'

' ایسے ہی حالات پہلے بھی تھے۔ اس سے بھی برے۔ تقسیم کی کہانیوں کے وہی صفحات ہم تک پہنچے ہیں، جن میں سرخ رنگ زیادہ نہیں ہے۔ اس وقت کے حالات کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ہم سب بنجارے تھے۔ قتل و غارت کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ اتنا بھیانک تھا کہ ہم پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے اثرات کو بھول گئے تھے۔ ابھی ایسے حالات نہیں ہیں، مگر ہو سکتے ہیں۔ خدا بچائے۔ مجھے تم سے زیادہ پاشا مرزا سے ڈر لگتا ہے۔'

ہم دیر تک زار حکومت، ہٹلر اور نازی کیمپ کی بات کرتے رہے۔ اس بات پر دونوں متفق تھے کہ موجودہ معاشرہ پہلے سے کہیں زیادہ ایک مہذب معاشرہ ہے۔ مہذب معاشرہ کہیں زیادہ سنگین اور خطرناک ہوتا ہے۔ اس معاشرے میں پڑھے لکھے لوگ ہوا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر، انجینئر، آئی اے ایس افسران، آئی پی ایس اور ایسے تمام لوگ حکومت کے پابند ہو کر مشن کا حصہ بن جاتے ہیں۔ خفیہ ایجنسیاں، آر بی آئی، این آئی اے، این آر سی، الیکشن کمیشن سب بی مشن کے زیر اثر کام کر رہے تھے۔ ایک دھند تھی، جس نے موجودہ

ہندوستان پر قبضہ کرلیا تھا۔ اوراس دھند میں پاشا مرزا بھی تھے۔

◆◆

ادھر کچھ دنوں سے دادا اور پاشا مرزا میں جنگ چل رہی تھی۔ داد چلاتے رہتے تھے اور پوتا ان کی ہر بات نظرانداز کر جاتا تھا......

'سنو، میرے پاس وقت ہے۔'

' کیوں وقت نہیں ہے؟'

'بس کہہ دیا نا، وقت نہیں ہے۔'

'ایک ہمارا بھی زمانہ تھا......'

دادا کہتے کہتے ٹھہر جاتے۔ بھلا جوان پوتے کے پاس اتنا سب کچھ سننے کے لیے وقت ہی کہاں تھا۔ دادا اسلم مرزا اس وقت پیدا ہوئے جب لوگوں کے پاس وقت ہی وقت تھا اور پوتے پاشا مرزا نے اس وقت آنکھیں کھولی تھیں جب دنیا تیزی سے بدلنے لگی تھی......

دادا کو پوتے پر رشک آتا تھا اور مجھ سے اسی قدر راکتاہٹ محسوس ہوتی تھی......اس کی امید کے برخلاف میں ذرا سا بھی موقع پاتے ہی ابا میاں اسلم مرزا کے آگے پیچھے گھومتا ہوا فرمانبرداری ثابت کرنے میں جٹ جاتا......'ابا، آپ کو چائے ملی؟'

'مل گئی......'

' کھانا ہو گیا'

'ہاں'

' کچھ چاہیے تو نہیں آپ کو؟'

'نہیں'

'طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی؟'

'میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم جاؤ، اپنا کام کرو۔

دادا کو میری بات سے کوفت محسوس ہوتی۔ انہیں لگتا تھا، بیٹا درمیان کی اڑان میں کہیں پھنسا رہ گیا ہے ——اور پوتا، اس کی اڑان کا تو نہ کوئی اُور ہے نہ چھور ——بیٹا ایک محدود زمین میں رہ کر اپنی ذمہ داریاں ادا کررہا ہے۔ پوتے کے سامنے ایک کھلا آسمان ہے...... بیٹا، اپنی، اس کی (یعنی بڑھے کی) نسل اور ان دو نسلوں کی اخلاقیات کے بیچ کہیں الجھ کر رہ گیا ہے......اور پوتا، اس کی نظروں میں ایسا شاطر پرندہ، جو ایسی تمام بندشوں کے پر کترنا جانتا ہو۔ دادا کو مجھ پر رحم آتا تھا اور پوتے کے لیے ان کے اندر ایک خاص طرح کا جذبہ رقابت تھا، جو اب جوش مارنے لگا تھا۔

دادا کو احساس تھا، وہ غلط وقت میں پیدا ہوئے ہیں۔ تب کتنی معمولی معمولی چیزیں ان کے لیے خوشی بن جایا کرتی تھیں۔ وہ ایک مدت تک دھوپ، ہوا، آنگن اور آنگن کے پیڑ کو ہی دنیا سمجھتے آئے تھے۔ باہر کی سب چیزیں ایک لمبی مدت تک، یعنی ان کے کافی بڑا ہو جانے کے بعد تک جادوگر کا بند ڈبہ ہی رہیں۔ یعنی جس کے بارے میں وہ سوچ سکتے تھے۔ خوش ہو سکتے تھے، چونک سکتے تھے اور مچل سکتے تھے

——— اماں، ابا، بھائی بہنوں کی فوج، ان کی کل کائنات بس اتنی تھی...... اور کیا چاہیے...... دادا اسی دنیا میں گم رہے کہ اس وقت کے سارے بچے اسی دنیا میں گم تھے...... وہ اسی کائنات میں غوطہ کھاتے رہے کہ اس وقت کے سارے بچے......
دھوپ، ہوا، آنگن اور پیڑ...... ایک دن گھر کی دیوار اونچی اٹھ گئی——— دھوپ رخصت ہوگئی——— ہوا کا آنا بند ہوگیا۔ آنگن پاٹ دیا گیا اور پیڑ کاٹ ڈالا گیا———
دادا نے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا۔ اب وہاں ایک پختہ کار مرد تھا اور دنیا دھیرے دھیرے بدلنے لگی تھی......
لیکن شاید نہیں۔ یہ دادا کا وہم تھا۔ دنیا اسی طرح اپنے محور پر ٹکی ہوئی تھی، جیسے پہلے تھی...... جیسے دادا کے باپ کے وقت میں تھی۔

تو دادا 'ان' بہت سارے لوگوں میں سے ایک تھے جو بہت چھوٹی چھوٹی چیزوں پر خوش ہو جایا کرتے ہیں۔ پھر دادا نے یہی چھوٹی چھوٹی خوشیاں ورثہ میں میرے حوالے کر دیں۔ میرے زمانے میں وقت صرف اس قدر بدلا تھا کہ زمین زیادہ پتھریلی ہوگئی تھی۔ بوڑھے باپ کی طرح مجھے سب کچھ آسانی سے نہیں مل گیا تھا...... مجھے باپ سے زیادہ مشقت کرنی پڑی۔ کچھ زیادہ جدوجہد کرنی پڑی...... چھوٹے سے شہر میں تھوڑی تھوڑی تبدیلیاں آنے لگی تھیں...... خاندان کے بڑھنے پر بٹوارہ اور گھر کا چھوٹا ہونا لازمی تھا۔ یہی وہ چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں جسے دادا——— دنیا کے ایک دم بدل جانے کے طور پر دیکھ رہے تھے۔
لیکن دراصل دنیا تب بدلی تھی جب......

میں اپنی آدھی زندگی کی ناؤ کھے چکا تھا۔ دادا اب اکیلے تھے۔ اماں گزر چکی تھی۔ مجھے مشقت اور جدوجہد کے بدلے میں ایک چھوٹی سی زندگی ملی تھی——— مگر نیا شہر ملا تھا۔ نئے شہر میں کالونیاں تھیں۔ ان میں کہیں ایک گھر میرا بھی تھا۔
اس گھر میں آنگن نہیں تھا———
اس گھر میں پیڑ نہیں تھے———
اس گھر میں دھوپ کم کم آتی تھی۔ ہوا کا گزرنا بھی کم کم ہوتا تھا———
پاشا مرزا نے اسی گھر میں آنکھ کھولی تھی...... آنگن، پیڑ، ہوا، دھوپ نہ ہوتے ہوئے بھی پاشا نے زبردست ہاتھ پاؤں نکالے تھے۔ پاشا کا ہر دن ایسا تھا جو میری زندگی میں نہیں آیا تھا۔
جو دادا کی زندگی میں نہیں آیا تھا......
پاشا بلا خطر کچھ بھی کرسکتا تھا...... اور شاید اسی لئے، اسے دیکھتا، بڑھتا ہوا، دادا قدم قدم پر اس سے کٹ کر رہتا تھا......

اور حقیقت ہے، پوتے نے جب آنکھیں کھولیں، اس وقت دنیا بے حد تیزی سے بدلنے لگی تھی۔
پوتے نے بے حد چھوٹی نازک عمر میں ہی اپنے پر نکال لئے۔ ایک دن پڑھتے پڑھتے وہ تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکلا۔
'کہاں جا رہے ہو؟ دادا نے پوچھا۔
'کھیلنے جا رہا ہوں'
دادا نے مجھ سے کہا...... 'اسے روکو...... وہ کھیلنے جا رہا ہے......'
میں نے آنکھیں پھیرتے ہوئے کہا——— ''وہ نہیں مانے گا...... وہ اپنی مرضی کا مالک ہے۔ آپ دیکھتے نہیں......''
'ہاں، میں سب دیکھ رہا ہوں'

دادا نے گہرا سانس بھر کر کھلے دروازے کو دیکھا۔ پوتا نظر سے اوجھل ہو چکا تھا۔

بے حد ننھی، کچی سی عمر میں اور اس کالونی میں یہ پاشا مرزا کا پہلا دن تھا۔ جب نرسری میں پڑھتے ہوئے اس نے اپنی آزادی کا اعلان کیا تھا......اس دن دادا دیر تک سوچتے رہے—— بچپن میں ایسی آزادی ان کے حصے میں کیوں نہیں آئی ؟'
وہ پہلا دن تھا، جب دادا نے پوتے سے جلن محسوس کی تھی۔

پاشا تھوڑی دیر بعد کھیل کر واپس آیا، تو دادا دروازے پر اس کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔
ان کی متجسس آنکھوں میں سوالات تھے——
'تمہارے پاس کیا ہے جو میرے پاس نہیں ہے'
'ہٹو، جانے دو'
'نہیں، پہلے بتاؤ......تمہارے پاس کیا ہے جو میرے پاس......'
پوتے نے پھر دہرایا......نہیں جانے دو گے؟'
'نہیں......'
'ٹھینگا'

پاشا مست ہوا کے جھونکوں کی طرح دوبارہ بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ دادا دیکھتے رہ گئے......شاید فرار کے اتنے راستے، بغاوت کا یہ مادہ، جو پاشا میں تھا، دادا میں نہیں آیا تھا......وہ دیر تک دو قدم آگے بڑھ کر پاشا کو سیڑھیوں سے نیچے اتر کر دوڑ کر، سرپٹ بھاگتے ہوئے دیکھتے رہے——
یہ سلسلہ دراز ہوتا رہا......
انحراف، احتجاج اور بغاوت کی کشادہ سڑک پر پاشا کے قدم بھاگتے رہے۔ دادا خود سے دریافت کرنے میں مصروف رہا۔
'اس میں ایسا کیا ہے، جو میرے پاس نہیں ہے'
اور کہنا چاہیے، بار بار اٹھنے والے اسی ایک سوال نے دادا کو پاشا مرزا کے بہت قریب کر دیا تھا......اور پاشا بھی اسی دشمنی، رقابت کے پردے میں دادا کو 'کچھ' بھی بتاتے یا پوچھتے ہوئے گھبراتا یا شرماتا نہیں تھا......مثلاً جیسے وہ پوچھتا......
'تم اپنے وقت میں ایسے نہیں تھے؟'
'نہیں۔'
'پھر تم کرتے کیا تھے؟'
'ہم چپ رہتے تھے۔ بڑوں کے سامنے بولنا منع تھا۔'
اور......؟'
'پیدا ہوتے ہی ہمیں ایک ٹائم واچ دے دی جاتی تھی۔ اس وقت اٹھنا ہے، فلاں وقت میں یہ کام انجام دینا ہے......'
'اور لڑکی......؟'

پاشا ہنستا ہے۔
دادا آنکھیں تریرتا ہے...... ''ہمیں چھت پر بھی جانا منع تھا۔ تمہارا باپ بھی چھت پر نہیں جا سکتا تھا۔ لڑکی کا نام لینا تو بہت دور کی چیز ہے۔''
'تم لوگ گھامڑ تھے ـــــ' اس بار پاشا کو غصہ آتا ہے۔

دادا جوابی کارروائی کے طور پر، گفتگو کے ہر نئے موڑ پر مجھ سے شیئر کرتے ـــــ
'ـــــ وہ اڑ رہا ہے۔'
'یہ عمر اس کے اڑنے کی ہی ہے ـــــ' میں اپنے کام میں مصروف رہا۔
'ـــــ وہ ہنس رہا ہے۔'
'وہ ہنس سکتا ہے...... یہ عمر ہی......'
'ـــــ نہیں، وہ ایسے نہیں ہنس رہا ہے جیسے ہم لوگ......'
دادا کہتے کہتے غصہ جاتے......'وہ اڑ رہا ہے......وہ بڑا ہو رہا ہے......وہ پھسل رہا ہے......'
میں ہر بار اپنی مصروفیت میں آنکھیں جھکائے، ویسے ہی جواب دیتا ـــــ
'وہ ایسا کر سکتا ہے......'
ظاہر ہے، ایسے موقع پر دادا کو اپنے غصے کو چھپانا، ناممکن ہو جاتا......اور جیسے ایسے ہر موقع پر غصہ ور دادا خود سے دریافت کیا کرتے۔
'آخر اس میں ایسا کیا ہے، جو ان کے پاس نہیں ہے۔'

دادا کے دیکھتے ہی دیکھتے پوتے میں جوانی کے پر نکل آئے۔ تیزی سے بدلتی فاسٹ فوڈ (Fast food) کی اس دنیا میں اب وہ ایک نوجوان کی حیثیت سے تھا اور یہ سب، کہ اس میں کیسے کیسے اور کتنے پر نکلے، یا یہ کہ خالی وقت میں وہ کیا کیا کرتا رہا ہے، ان مہملات کے لیے میرے پاس وقت نہیں تھا۔ مگر دادا کی گدھ نگاہیں ہر دم اس کے آگے پیچھے گھومتی رہتی تھیں اور حقیقت یہ ہے کہ صرف گھومتی ہی نہیں رہتی تھیں بلکہ قدم قدم پر چونکتی اور پریشان بھی ہوتی رہتی تھیں......
مثلاً یہ کہ وہ......بہت زیادہ دوڑ رہا ہے، اڑ رہا ہے ـــــ
مثلاً یہ کہ وہ...... 'جنون' میں مبتلا ہو رہا ہے ـــــ
مثلاً یہ......کہ اب اسے دیکھ پانا، ہاں دیکھ پانا روز بروز ایک مشکل امر ہوا جا رہا ہے۔
دادا ہمت جٹا کر میرے پاس آتے ـــ
'ـــــ اس نے اول جلول کپڑے، پہنے ہیں......'
'اس کے دوست بھی پہنتے ہوں گے'......میری نگاہیں اپنے کام میں مصروف ہوتیں۔
'ـــــ اس کے کانوں میں چھلے ہیں......'
'نیا فیشن ہوگا......'

'——وہ راتوں کو دیر سے آتا ہے......'
'کلب اور دوستوں میں دیر ہو جاتی ہوگی'
'——وہ......'

میرے پاس ہر بات کا جواب موجود تھا۔لیکن ویر یور ایٹی ٹیوڈ (Wear your Attitude) والا لہجہ دادا کو ہضم نہیں ہوتا تھا اور پوتے کے We are like this only یعنی ہم تو ایسے ہی ہیں، جیسے ریمارک پر ان کا نک چڑھا پن اور بھی بڑھ جاتا تھا——

پوتا جوشیلا تھا، تیز طرار تھا۔نگاہیں ملا کر بات کرتا تھا۔وہ ہر لمحہ خود کو نئے Attitude میں ڈھال رہا تھا۔رنگ برنگے بال، کانوں میں چھلے، پھٹی ہوئی جینس—— کبھی کبھی تیز تیز آواز میں گانے لگتا۔دادا کی ہر بات کا پوتے کے پاس ایک ہی جواب تھا۔
'ہم اپنی مرضی کے مالک ہیں۔'
'——چاہے تم جتنی بھی تیز آواز میں ناچو، گاؤ۔'
'ہاں'
'—— کسی کی موجودگی کا خیال بھی نہ کرو۔'
'ہاں......'
'—— کسی کے دکھ، پریشانی کا۔'
'ہاں......ہم صرف اپنے بارے میں سوچتے ہیں——اس لیے کہ we are like this only......'
'——ہم اپنے زمانے میں......، دادا کا لہجہ کھوکھلا تھا۔
'تم لوگ آخر اتنے دبو کیوں تھے۔اس لیے کہ تم لوگ ڈر ڈر کر جی رہے تھے......'

یہ ایک بھیانک حقیقت تھی۔یا یہ ایک ایسا کنفیشن تھا جسے کرتے ہوئے دادا نے ہمیشہ ہی خوف محسوس کیا تھا......دادا کو اپنا زمانہ معلوم تھا۔دادا کی غلطی یہ تھی کہ اس کے بیٹے کو بھی یہی زمانہ وارثت میں ملا——دادا اپنے زمانے میں کسی لڑکی سے بات کرتے ہوئے بھی گھبراتے تھے——فرق اتنا تھا کہ میری زندگی میں ایک لڑکی آئی تھی......لیکن ایک خاموش رومانی کہانی، شروع ہونے سے پہلے ہی بھیانک طوفان میں بکھر گئی......دادا کو سب کچھ یاد تھا......وہ پاگلوں کی طرح اپنی خاندانی عزت کو بچانے کے لیے ساری ساری رات کمرے میں ٹہلتے رہتے تھے......ایسا تو ان کی سات پشتوں میں سے کسی نے نہیں کیا......صبح کا دھندلکا ہونے سے پہلے ہی بیٹے کو نیند سے جگا کر انہوں نے اپنا فیصلہ سنا دیا......
'ایسا کرنا میرے لیے ممکن نہیں——تم چاہو تو بغاوت کر سکتے ہو؟'
میرا چہرہ ایک لمحے کو کانپا۔پھر جھک گیا۔
دادا کو یقین تھا، کہ اس موقع پر بغاوت کے خاتمے کے اعلان پر ان کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ ضرور نمودار ہوئی تھی۔پھر میں نے وہی کچھ کیا جو کچھ دادا نے چاہا......یا جیسا کہ اس کے پہلے والی نسل کے لوگ کرتے آئے تھے......

لیکن پاشا، اپنی اس دنیا سے کتنا خوش تھا، یہ وہی بتا سکتا تھا۔ وہ ایک ایسے آدمی کا بیٹا تھا جس کے پاس بیکار کی باتوں کے لیے وقت نہیں تھا۔ وہ الٹی بیس بال ٹوپی پہنتا تھا۔ ڈھیلی ڈھالی باکسر شرٹس اس کی پہلی پسند تھی۔ وہ فاسٹ فوڈ کا شیدائی تھا۔ جس دن پاشا نے پہلی بار اپنے ننگے بدن پر ''گودنے'' گدوائے تھے، اس دن دادا بری طرح اچھلا تھا۔

'ـــــ یہ سب کیا ہے؟'

'آپ دیکھتے نہیں، یہ سانپ ہے...... یہ مچھلی ہے...... یہ سیڑھیاں ہیں......'

''ـــــ لیکن یہ سب کیوں ہے؟'

'کیوں کہ ہمیں یہی اچھا لگتا ہے۔'

'ـــــ لیکن اس کے بعد......'

'سوچا نہیں ہے۔'

دادا ایک بار پھر میرے سامنے کھڑے تھے......

'ـــــ اسے روکو......'

میں خاموش رہا......

'ـــــ اسے سمجھنے کی کوشش کرو'

'میں نے اس بار بھی اپنی نظریں جھکائے رکھیں......'

دادا کے چہرے پر تناؤ تھا......

'میں تمہارا باپ ہوں۔ تم سے ایک نسل بڑا...... پھر مت کہنا کہ مجھے خبر نہ ہوئی...... اس نے آزادی چاہی۔ اسے آزادی ملی...... وہ آزادی جو مجھے اور تمہیں نہیں ملی تھی۔ تم اسے روکتے، وہ تب بھی نہیں رکتا، تم اسے بندشوں میں جکڑنے کی کوشش کرتے، تو وہ یہ زنجیریں توڑ دیتا۔ کیونکہ وہ بہرصورت تمہاری طرح بزدل نہیں ہے۔ ایک معمولی محبت کے لیے بھی بغاوت نہیں کرنے والا...... سن رہے ہو، نا'

میں ویسے ہی سر جھکائے ان کی باتیں سنتا رہا......

دادا نے کہنا جاری رکھا۔ 'اس نے سب سے پہلے اپنی حدیں توڑیں۔ سمجھ رہے ہو نا، حدیں...... وہ گھر سے باہر رہا۔ ساری ساری رات باہر...... لیکن یہ سب وہ باتیں تھیں جو بہت آؤٹ ڈیٹیڈ تھیں...... یعنی جن کے بارے میں زیادہ باتیں کرنا تمہارے جیسے لوگوں کے لیے تضیع اوقات ہے۔ اس نے اپنی اڑان جاری رکھی...... بال منڈوائے، گودنے گدوائے، الٹی ٹوپی پہنی اور زمانے بھر سے الٹا ہو گیا...... تم سمجھ رہے ہو میں کیا کہہ رہا ہوں......'

میں ویسے ہی مصروف رہا، جیسے دادا کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہوں ـــــ

''میں نے سمجھا ہے اسے۔ تم سے زیادہ۔ اس لیے کہ پل پل میں تم سے زیادہ اس کے قریب رہا ہوں۔ سنو...... غور سے سنو...... یہ بہت تیز طرار نسل ہے۔ غضب کی اڑان والے ـــــ انہیں زندگی اور وقت پر بھروسہ نہیں ہے۔ یہ سب کچھ وقت سے پہلے کر لینا چاہتے ہیں ـــــ ہم اور تم تھوڑا تھوڑا کر کے سفر کو آگے بڑھاتے تھے۔ اس لیے عمر کا ایک بڑا حصہ ڈھل جانے کے بعد بھی ہمارے پاس بہت وقت رہ جاتا تھا۔ مگر ان کے پاس۔''

دادا کا لہجہ ڈراونا تھا......'جب یہ سب کچھ کرلیں گے تو؟ یعنی اس چھوٹی سی عمر میں ہی ـــــ تو باقی عمر کا کیا کریں گے یہ......؟ دادا کھانس رہے تھے......غم اسی بات کا ہے کہ یہ باقی عمر کی پروانہیں کریں گے۔مت سنو تم......جہنم میں جاؤ......'

پوتے کے اندر آنے والی یہ وہ تبدیلیاں تھیں، جس کے بعد دادا نے خود سے سوال کرنا چھوڑ دیا......کہ آخر اس میں (پوتے) ایسا کیا ہے جو ان کے پاس نہیں ہے۔دادا کے پاس اپنے پوتے کی ذہنی سطح کے لیے بس ایک ہی جملہ تھا ـــــ یعنی ڈپریشن کی آخری سطح......!
اس کے بعد......؟

دادا کو سوچ سوچ کر خوف آتا تھا......دادا کے اندر پوتے کے لیے اب رقابت نہیں بلکہ ترحم کا جذبہ جاگ اٹھا تھا۔انہیں رہ رہ کر پوتے پر افسوس آتا تھا......

(۳)

دادا اسلم مرزا وطن لوٹ گئے۔ویسے بھی وہ دو تین مہینوں کے لیے ہی آیا کرتے تھے۔وہ دلی کو عمارتوں کا جنگل کہتے تھے۔ اور اس شہر میں ان کا دل بالکل بھی نہیں لگتا تھا۔وہ پوتے پاشا مرزا کو لے کر فکر مند تھے۔میری حیثیت گھر میں ایک بہروپیے کی تھی۔ دادا گھر آتے تو میرا ایک نیا روپ سامنے آتا۔ہم عام زندگی میں بہروپیے ہی ہوتے ہیں۔سارہ میرے تمام روپ سے واقف تھی۔مگر سارہ نے کبھی کسی طرح کی ناراضگی کا مظاہرہ نہیں کیا۔مجھے اب خیال آتا ہے، اسے کرنا چاہیے تھا۔کئی مقام ایسے تھے، جہاں مجھے وہ روک سکتی تھی۔مگر وہ میری خوشیوں پر مرنے والی عورت تھی۔سارہ کو مجھ سے زیادہ کچھ بھی پیارا نہیں تھا۔لیکن سارہ کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ میں نے کبھی بھی پاشا مرزا کے آگے ایک باپ کو سامنے نہیں رکھا۔میری مجبوری تھی کہ ساری زندگی میرے ہاتھ تنگ رہے۔میں پاشا کی ضرورت بھر یا اس سے کم ہی مدد کرتا تھا۔پاشا مرزا نے کبھی مجھ سے کہا نہیں۔شکایتیں وہ ممی سے کرتا تھا۔اس کا بیس بال ٹوپی پہننا یا گودنے گودوانا بھی مجھے پسند تھا۔مگر دادا کی بات مجھے بار بار یاد آتی رہی کہ اسے سمجھو۔وہ کہیں اور جارہا ہے۔

مجھے شدت سے اس بات کا احساس تھا کہ پاشا کو دینے کے لیے کبھی میرے پاس زیادہ کچھ نہیں رہا۔کبھی کبھی تو اسکول یا کالج میں اس کی فیس بھرنے کے پیسے بھی نہیں ہوتے تھے۔اس نے موٹر سائیکل کی ڈیمانڈ کی تھی۔میں اس کی یہ خواہش بھی پوری نہیں کرسکا۔وہ انتہائی خوبصورت نوجوان تھا۔اور اس کی فکر یہ تھی کہ اس کا مستقبل کیا اور کیسا ہوگا۔وہ آگے کیا کرے گا۔؟ ایک ماڈرن نوجوان دیکھتے ہی دیکھتے اپنے کمرے میں بند ہوگیا۔بی مشن آنے کے بعد ملک میں نوکریاں ختم ہوگئی تھیں۔کروڑوں بے روزگار ہوگئے تھے۔کسان خودکشی پر آمادہ تھا۔بے روزگار نوجوان نسل بی مشن سے وابستہ ہوکر اسلحوں سے کھیل رہی تھی۔

سارہ خاموشی سے آکر سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔اس کی آنکھوں میں نمی تھی، جس کو اس نے آسانی چھپا لیا تھا۔سارہ نے میری طرف دیکھا اور کہا، 'تم کو پاشا کی فیس کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'

' کیوں؟' میں اس کے جواب پر حیران تھا۔میں کوشش کررہا ہوں۔تم جانتی ہو میرے پاس کچھ نہیں۔کبھی اچھے دن تھے۔اچھے دن میں لے دے کر یہ فلیٹ مل گیا۔اس وقت لکھنے لکھانے سے اچھی آمدنی ہوجاتی تھی۔اب تمام راستے بند ہیں۔میری کوشش میں کہیں

کوئی کمی نہیں۔ مگر تقدیر کی بات۔'

'تقدیر کو درمیان میں نہ لاؤ۔' سارہ نے مسکرانے کی کوشش کی۔ 'تم نے کبھی سنجیدگی سے پاشا کے مستقبل کے بارے میں نہیں سوچا۔'

یہ حقیقت تھی۔ میں لکھنے کے کاموں میں مصروف رہا۔ اور پتہ بھی نہیں چلا کہ کب پاشا مرزا نوجوانی کی دہلیز پر کھڑے ہو گئے۔

میری آنکھوں میں سوال تھے۔' پھر فیس کا انتظام کیسے ہوگا۔؟'

پاشا کو ایک جگہ جاب مل گئی ہے۔ اس نے کہا کہ دو مہینے میں وہ اپنی فیس جمع کرا دے گا۔ تم جانتے ہو وہ خوبصورت ہے۔ اسمارٹ ہے۔ اس کی انگلش کافی اچھی ہے۔ فرم بڑی ہے۔ رات کی جاب ہے۔ اس لیے اسے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔'

' پاشا جاب کرے گا؟ وہ بھی اپنی فیس کے لیے؟'

ایک برقی لہر جسم سے ہوتی ہوئی دماغ تک دوڑ گئی۔ میں گہرے اندھیرے میں تھا۔ مسلسل شکست کے بعد ایک اور شکست۔ میرا ننھا منا شاہزادہ اتنا بڑا ہو گیا اور میرے پاس اس کی فیس کے لیے پیسے نہیں۔

' سمجھدار بچہ ہے۔ میں نے اجازت دے دی۔ تم کو زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔' سارہ کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری۔ لیکن اس کے باوجود میرا چہرہ ہر طرح کے جذبات سے عاری تھا۔

پاشا مرزا اپنی نئی جاب سے خوش تھے۔ ان میں خود اعتمادی کا اضافہ ہوا تھا۔ سارہ اور میرے لیے رات کا گزرنا مشکل ہو جاتا۔ پاشا آٹھ بجے گھر سے نکلتے تھے اور صبح چھ بجے واپس آتے تھے۔ ماحول بدلا تھا، اس لیے یہ دو مہینے وہ بہت خوش نظر آئے۔ کبھی کبھی مجھ سے باتیں کئے ہوئے مہینوں گزر جاتے تھے۔ اب کبھی کبھی ہنس کر باتیں بھی کر لیتے تھے۔ انسان کی زندگی پر ماحول کا بہت اثر پڑتا ہے۔ لیکن میں پاشا کے جاب سے مطمئن نہیں تھا۔ اس درمیان میں نے مختلف اداروں اور چینلس والوں سے رابطہ کیا۔ بلایا بھی گیا۔ گفتگو بھی ہوئی لیکن ہر جگہ ناکامی ملی۔ یہ ناکامیاں پہلے میرے حصے میں نہیں آتی تھیں۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔، میری سمجھ سے باہر تھا۔ لیکن اس کا جواب مجھے سبحان علی نے دیا۔

' تم سے پہلے تمہارے ریکارڈس وہاں پہنچ جاتے ہیں۔'

' ریکارڈس؟'

' جو لکھتے رہتے ہو۔' سبحان علی ہنسا۔ اخباروں میں، کتابوں میں، فیس بک پر اور ٹوئٹر پر۔ بی مشن کے پاس سارے ڈاٹا ہوتے ہیں۔ یہ ڈاٹا ایسے تمام ادارے اور چینلس کو بھیج دیے جاتے ہیں۔'

' اس کا مطلب؟'

' مطلب اندھیرا ہے۔ کبھی کبھی ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے۔ بی مشن جوائن کر لوں۔ لیکن اب بی مشن والوں کو بھی ہماری ضرورت نہیں۔' سبحان علی زور سے ہنسا۔ بہت آسانی سے ہمارے کپڑے اتار لیے گئے۔ کانگریس نے تو رنگناتھ مشرا کمیشن اور سچر کمیٹی کے ذریعہ صرف ہمیں رسوا کیا تھا۔ اب ہم بے لباس ہیں۔ راستہ نہیں ہے میرے پیارے جہانگیر مرزا۔ میرے گھر کی دیواروں پر چیونٹیاں آ گئی ہیں۔ اکثر میں دیر تک ان چیونٹیوں کو دیکھتا ہوں اور سوچتا ہوں، قطار بنا کر یہ کہاں جاتی ہیں؟ کہاں سے فوج بنا کر آ جاتی ہیں؟ کہاں کہاں رزق تلاش کرتی ہیں۔؟ ہم کیڑے مکوڑے اور چیونٹیوں سے بھی بدتر ہو گئے ہیں۔

سبحان علی کے جانے کے بعد میں تھکا ہوا اپنے ریڈنگ روم میں آ گیا۔ کمرے میں حبس بڑھ گیا تھا۔ میز پر ڈائری پڑی تھی۔ کھڑکی

کے سامنے بلند عمارتوں کی قطار تھی۔ لیکن میری دلچسپی کسی میں نہیں تھی۔ میں نے ڈائری پر یونہی لکھنا شروع کر دیا۔ جناح اور گاندھی کی سرزمین پر جب لہو کے قطرے گرے تو کسی دانشور یا سیکولر فکر رکھنے والوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ بی مشن کی شروعات ہوگئی ہے۔ ہندوستان غائب ہورہا ہے۔ میں کچھ دیر تک خاموشی کے بھنور میں تیرتا رہا۔ پھر میں نے آگے لکھنا شروع کیا۔

''یہ کچھ اور تھا، جس سے ہم واقف نہیں تھے۔ لیکن کوئی تھا جو مجھ سے بار بار پوچھ رہا تھا...... اپنا گھر ایک شعبدہ باز اور قاتل کے حوالے کرنے کے بعد سوچتے ہو کہ کہ وہ تمہارے گھر کی حفاظت کرے گا؟ جواب کے طور پر مجھے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ آپ ایک کام کیجیے۔ ایک سفید کاغذ لیجیے۔ کاغذ پر گودھرا لکھتے ہوئے یقیناً آپ کے ہاتھوں میں لرزش ہوگی، مگر ابھی آپ کو دو منزلوں سے گزرنا اور باقی ہے۔ آڑی ترچھی لکیریں کھینچ کر ایک ریلوے اسٹیشن بنا لیجیے۔ پٹریوں کی لائن بچھا دیجیے۔ پھر ایک پٹری پر ایک ٹرین کو کھڑا کیجیے۔ ٹرین پر سابرمتی آشرم لکھ دیجیے۔ پھر جی چاہے تو ٹرین کی ایک بوگی پر ایس۔6 لکھ دیجیے۔ مگر یاد رہے، اب ایک دھماکہ ہونے والا ہے۔ یہ سادہ سا نظر آنے والا کاغذ سلگنے والا ہے اور اس کی آگ گلبرگہ سوسائٹی سے نرودا پاٹیا اور نرودا پاٹیا سے ہو کر پورے ہندوستان تک پھیلنے والی ہے۔ ایسا ہی ہوا۔ آگ پھیلنے کی رفتار تیز ہوئی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ ٹرین ہندوستان کے ہر شہر سے گزری..... اور آہستہ آہستہ ہم بھی اس سفید کاغذ میں تبدیل ہوگئے، جس میں آگ سلگ چکی تھی۔ اور ملک بارود کے ڈھیر پر کھڑا تھا۔

تاریخ میں ذرا سا پیچھے جایئے تو ایک موڑ 1857 کا آتا ہے۔ غدر ہوا، ناکام رہا۔ پھر ذرا سا آگے بڑھیے تو 1947 آتا ہے۔ کہتے ہیں ملک تقسیم ہوا تو سرحد کے دونوں طرف لاشیں بچھ گئی تھیں۔ جو کچھ ہوا بہت کھل کر اور ہیبت ناک طریقے سے ہوا۔ انگریز شاطر تھے۔ عیّار تھے۔ مکار تھے۔ شعبدہ باز تھے۔ ایسے شعبدہ باز جو ہاتھ میں گیند رکھ لیں اور آپ کو کہیں کہ دیکھو، یہ مٹھائی ہے۔ جب کہ آپ صاف دیکھ رہے ہیں کہ شعبدہ باز کے ہاتھ میں مٹھائی نہیں بلکہ بارود سے کھیلنے والی گیند ہے۔ بی مشن کے پاس یہی شعبدہ بازی تھی۔ اور یہ شعبدہ بازی مٹن کو بیف میں تبدیل کر دیتی تھی۔ پھر اس شعبدہ بازی نے آگے بڑھ کر خفیہ ایجنسی، فوج، عدالت سب کو اپنے شکنجے میں لے لیا۔ تاریخ کے ان تمام بے رحم اوراق کا جائزہ لیں تو وقت وقت پر آنے والے کھیل دکھانے والے شعبدہ بازوں کی کہانیاں کوئی نئی نہیں ہیں۔ بی مشن کے پاس ہندو راشٹر کا خواب ہے اور شعبدہ بازیاں ہیں۔ لیکن یہ شعبدہ بازیاں خوفناک ہیں۔ آپ کے ایک سادہ اور معمولی کاغذ کو بھی سلگنے اور جلنے پر مجبور کر دیں گی۔

معاشی، سماجی، تہذیبی، اقتصادی تمام ناکامیوں کے باوجود بی مشن کے پاس جیت کے لیے صرف ایک ہی بہانہ ہے.. اقلیت ...ایک ہی تماشا ہے.. اقلیت.. ایک ہی کھیل ہے... اقلیت.. ایک مداری ہے.. ایک ڈگڈگی ہے.. اور ڈگڈگی کی آواز پر رقص کرتی ہوئی اقلیت... ہوش کھوتی ہوئی اقلیت..... چکرویوہ میں الجھتے، پھنستے ہوئے اقلیت۔ ہزار برسوں کی تاریخ میں مخصوص اقلیت کو لٹیرا کہنے والے آسانی سے فیصلہ لے آئیں گے کہ اقلیتوں کی زمین کیسی؟ محمد بن قاسم سے غزنوی، غوری، خلجی اور مغل بادشاہ تک سارے لٹیرے تھے۔ لوٹ کی زمین کو اقلیتوں کا حق نہیں کہا جا سکتا۔ اس وقت بی مشن کا ہر نمائندہ، میڈیا مسلسل اقلیتوں کی مخالفت کر رہا ہے.. ہمارے پاس جواب دینے کے لیے کیا ہے؟ ہم تسلیم کر لیں کہ بی مشن میں مسلمانوں کو جلاوطن کیا جا چکا ہے۔ ہم ایک ایسے وائرس کا شکار ہو چکے ہیں، جو ہمارا نام صفحۂ ہندوستان سے مٹا دینا چاہتا ہے۔

وائرس ایک خوف کا نام ہے۔ یہ زہر بھی ہے جو تیزی سے اپنا شکار کرتا ہے۔ آپ کے کمپیوٹر میں آ جائے تو آپ کے ڈاٹا اور میموری

کو بھی نقصان پہنچادے۔ وائرس کی ہماری مہذب دنیا میں ہزاروں قسمیں ہیں۔ کچھ وائرس جانوروں سے ہمارے درمیان آتے ہیں۔ جانور اگر انسان کو کاٹ لے تو یہ وائرس انسانی خون میں شامل ہو جاتا ہے۔.. ان دنوں تیزی سے یہ وائرس ہمارے ملک کی آبادی میں پھیل رہا ہے...... تاریخ نے اکثر یہ سوال پوچھا ہے کہ ہٹلر جیسے حکمرانوں کو کیا خوف محسوس نہیں ہوتا؟ ہٹلر جیسے لوگ ہماری ہنستی مسکراتی دنیا کو اندھیر نگری میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ ایسا ہر اس ملک میں ہوا جہاں بھی ہٹلر جیسوں کی حکومت رہی، لیکن علم نفسیات کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہٹلر جیسے لوگ بچوں سے بھی کہیں زیادہ خوفزدہ ہوتے ہیں..... اور سب سے اہم بات، تمام تانا شاہ سوالوں سے ڈرتے ہیں کیونکہ ظلم و جبر کی ہر انتہا تک پہنچنے کے باوجود ان کے پاس جواب نہیں ہوتا۔

آج ہم دنیا کے سب سے خوفناک تماشے کی زد میں ہیں.. اس تماشا سے الگ وائرس ہر جگہ، ہر گلی، ہر سڑک، یہاں تک کہ آپ کے گھر میں بھی موجود ہے...... اس وائرس کو ختم کرنے کے لیے اینٹی وائرس بننا ہوگا۔ جنگیں زخمی کرتی ہیں.... جنگوں کا خیال زخمی کرتا ہے.... اور اس ماحول میں، اس خوفناک فضا میں محبت کی آہٹ بھی دور تک سنائی نہیں دیتی... جہاں موت ہر گام آپ کے پیچھے ہو، جہاں آپ کو دنیا کی نظر میں دہشت گرد قرار دے دیا گیا ہو، وہاں کتنی عجیب بات کہ اسی دہشت گرد پر مصیبت کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں۔ اس دہشت گرد کو جلا وطنی کی سزا مل رہی ہے.... ہم ہی نشانہ ہیں.... ٹارگٹ صرف ہم — ہم ابھی بھی ظلم و جبر کے ہاتھوں کی کٹھ پتلیاں بنے خود کو محفوظ تصور کر رہے ہیں۔

میں لکھتے لکھتے رُک گیا۔ دیر تک سامنے کی عمارتوں کو دیکھتا رہا۔ احساس ہوا، ہر عمارت میں کوئی نہ کوئی موجود ہے، جو مجھے دیکھ رہا ہے۔ سبحان علی نے بتایا تھا کہ وہ رات گئے آوازیں سنتا ہے۔ کچھ لوگ دوڑتے ہوئے اس کے دروازے تک آتے ہیں۔ پھر واپس لوٹ جاتے ہیں۔

دوسرے کمرے سے پاشا مرزا کی آواز آ رہی تھی۔ وہ سارہ کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ میں اس گہرے سناٹے سے باہر نکل کر کچھ وقت پاشا مرزا اور سارہ کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔

(۴)

دہشت وحشت سے الگ،
پاشا مرزا کے ساتھ کچھ دلچسپ مکالمے

گھر کی مخدوش اور بوسیدہ دیواروں کے درمیان قہقہے ابھی بھی زندہ ہیں۔ یہ احساس مجھے تقویت دیتا ہے۔ سردیاں شروع ہونے والی تھیں۔ سردیوں میں نیلا آسمان اور اطراف میں چھائے بادلوں کو دیکھنا مجھے پسند تھا۔ بی مشن اور حقیقت پسندی کی زمین سے الگ کچھ وقت میں پاشا مرزا اور سارہ کے ساتھ گزارنے کا خواہشمند تھا۔ مجھے دیکھتے ہی پاشا مرزا کا قہقہہ رُک گیا لیکن چہرے کی تازگی برقرار رہی۔

اس نے ٹھہر کر پوچھا۔ پزا کھائیں گے ڈیڈ۔

’ نہیں۔‘ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

’ یہی فرق ہے آپ میں اور مجھ میں۔ آپ پزا نہیں کھاتے مجھے روٹیاں پسند نہیں۔‘

میں نے اس فرم کے بارے میں پوچھا، جہاں ان دنوں وہ نائٹ شفٹ کر رہا تھا۔ پاشا نے بتایا کہ باس خوش ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ میں یہ نوکری چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اعزازی تنخواہ کے طور پر اسے ۸۰ ہزار ملیں گے۔ یعنی دو ماہ کے ایک لاکھ ساٹھ ہزار۔ اس نے یہ بھی کہا کہ امتحان کے بعد وہ کبھی آپ لوگوں کو پیسوں کے لیے پریشان نہیں کرے گا۔

’ تم ابھی بھی پریشان نہیں کرتے۔ اور میں کہہ سکتا ہوں کہ میرے بیٹے نے مجھے کبھی زندگی میں پریشان نہیں کیا۔ تم اس دنیا کے سب سے اچھے بیٹے ہو لیکن میں ایک اچھا باپ نہیں ہوں۔‘

’ سارہ ناراض ہو کر بولی۔ اس وقت اس طرح کی باتیں نہ کرو۔ تمہارا بیٹا جوان ہو گیا ہے۔ اس کی قدر کرو۔ اس سے محبت کرو۔‘

میرا بیٹا جوان ہو گیا ہے؟ مجھے اس سے زیادہ کوئی بات خوش نہیں کر سکتی تھی۔ میز پر پزا کی پلیٹ پڑی تھی۔ مسکراتے ہوئے ایک چھوٹا سا ٹکڑا میں نے منہ کے حوالے کیا اور مجھے اس بات کا شدت سے یقین ہوا کہ پزا کو انجوائے کیا جا سکتا ہے۔

وہ ایک بے حد خاص دن تھا۔ اس دن کو میں نے اپنے حافظے میں محفوظ کر لیا، کچھ باتیں تھیں، جن کا تجزیہ آسان تھا۔

پاشا کی دنیا پزا اور برگر کی دنیا تھی جبکہ مجھے اب تک چاول اور روٹی ہی پسند تھے۔ لیکن میں اب چور دروازے سے پزا اور برگر کی دنیا کو پسند کرنے لگا تھا اور اس کے بعد ہی میری زندگی میں بہت کچھ تبدیل ہوا تھا——

◆◆

اچھا بولو، کیا بدلا ہے——؟ میں ہمیشہ کی طرح مطمئن تھا۔

’بہت کچھ——‘ یہ سارہ تھی——یا شاید کچھ بھی نہیں بدلا——

بدلا ہے۔

جیسے—؟

یہ دنیا...... یہ زمانہ......اور میرا شیونگ کٹس......بچپن میں میرے باپ پتہ نہیں داڑھیاں بناتے ہوئے کتنی دقتوں کا سامنا کرتے تھے—پانی گرم کراؤ—ایک بڑا سا بلیڈ—جس سے داڑھی بناتے ہوئے ہر بار چہرے پر خراش پڑ جاتی تھی یا جلد چھل جاتی تھی۔ پھر شیونگ کریم کی جگہ شیونگ صابن ہوا کرتا تھا۔ گول سے نیلے ڈبّے میں......اور شیو کرنے کے بعد ایک برف کی شکل والی واہیات سی پھٹکری—'

تب دنیا اتنی کھلی نہیں تھی—

تب دنیا نے اتنی تیز رفتاری سے اڑنا نہیں سیکھا تھا—

مگر آہستہ آہستہ دنیا اڑنے لگی تھی—

اور میں شاید دوسروں سے کہیں زیادہ اپنے مشاہدے سے اڑنے کے تماشے دیکھ رہا تھا—

اس لیے میں مطمئن تھا—

کیوں کہ مجھے بھی دنیا کے ساتھ ساتھ ہی اڑنا تھا۔ دوسروں سے یا وقت سے بہت پیچھے رہ جانے کا احساس بھی کہیں نہ کہیں ڈستا ہے—لیکن میں جانتا تھا۔ ہر بار ایک دنیا کو ہم بہت پیچھے چھوڑ کر آتے ہیں—

یا— آگے بڑھتے ہوئے ہر بار ایک دنیا کو بہت پیچھے چھوڑنا ہوتا ہے—

یا—جو وقت کے ساتھ نہیں ہوتے۔ وہ زندگی بھر اپنی دنیاؤں سے چپکے ہوئے روتے رہتے ہیں—

اس لیے پاشا مرزا کی خوشی کے لیے میں بھی اڑنا چاہتا تھا—ٹھیک ویسے ہی جیسے پاشا اڑ سکتا تھا—یا اڑ رہا تھا—

میں بھی الٹی بیس بال ٹوپی پہن کر بیٹے کی نقل کرنا چاہتا تھا۔

یا جیسے میں بھی کندھے، پیٹھ یا بانہوں کی پھڑکتی مچھلیوں میں بیٹے کی طرح گودنے گدوا کر اس تکلیف یا خوشی کا احساس کرنا چاہتا تھا، جس سے نئی عمر کا بیٹا دوچار تھا۔

مجھے اپنے کمپٹیشن میں دیکھ کر پاشا مرزا ہنس دیتا تھا۔

تم میری نقل کر رہے ہو......؟

نہیں—

کر رہے ہو ڈیڈ......

اور تم کس کی نقل کر رہے ہو......؟

پاشا گڑبڑا جاتا—

میں مسکرا دیتا۔ ان لاکھوں کروڑوں نوجوانوں کی، جنہوں نے تم سے پہلے الٹی ٹوپی پہنی یا گودنے گدوائے......؟

ہاں......

'یا مہنگی برانڈیڈ جینس کے ساتھ ایک دو روپے کا بلیڈ بھی خرید کر لائے۔ جینس کے دھاگے ادھیڑنے کے لیے......

ہاں......

میں مسکرا رہا تھا— مجھے اچھا لگتا ہے۔ جانتے ہو کیوں؟ نہیں— تم نہیں جانتے ہوگے۔ بس تم ہزاروں لاکھوں لوگوں کے ذریعہ چلائے گئے فیشن کا ایک حصہ بن جاتے ہو— سنو— جب تم الٹی بیس بال ٹوپی پہنتے ہو تو زمانے کو بھی الٹ دیتے ہو...... جیسے یہ خیال کہ تم کچھ بھی کر سکتے ہو اور بس مجھے تمہاری نسل کی یہی ادا پسند ہے......اور میں اس ادا پر قربان جاتا ہوں......

'اور بلیڈ اور برانڈیڈ جینس والی بات......؟ پاشا مجھے غور سے پڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔

میں مسکرایا— جانتے ہو۔ پرب تہوار کے موقع پر ہمارے نئے کپڑے بنتے تھے۔ تمہاری طرح نہیں کہ ہر مہینے ہی نئی ٹی شرٹ اور جینس لیے چلے آ رہے ہیں۔ پہلے ہم ہفتوں اس نئے کپڑے کو دیکھتے اور خوش ہوتے تھے۔ پہننا تو دور کی چیز تھی۔ ہم بس نئے کپڑے کو دیکھ کر ہی نہال ہو جاتے تھے اور تم......

میں ہنس رہا تھا۔ مائی گاڈ۔ پندرہ ہزار کی جینس اور ایک بلیڈ— تم میں ہمت ہے۔ تمہاری نسل میں— تم ہمیں سکھاتے ہو کہ تم کچھ بھی کر سکتے ہو— اپنے پسندیدہ برانڈیڈ لباس کی دھجیاں بکھیر سکتے ہو۔ بلیڈ سے کاٹ کراس کے دھاگے نکال سکتے ہو۔ تم بتاتے ہو کہ کسی بھی شے میں تمہارے جذبات، تمہارے ایموشنس ایسے ہی ہیں— اور مجھے یہی بات تمہاری پسند ہے۔ ہم جذباتی ہوتے تھے۔ مورکھ— اور ایک دن یہی مورکھتا ہمیں پریشان کرنے لگتی تھی......

پاشا غور سے میری بات سن رہا تھا—

تو اسی لیے آپ ہماری نقل کرنے لگے......؟

نہیں— مجھے زور سے ہنسی آئی تھی— بالکل بھی نہیں بس تمہاری عمر میں داخل ہونے کی کوشش ہے......

لیکن آپ ہماری عمر سے بہت آگے نکل چکے ہیں۔

بالکل بھی نہیں— اس بار میں زور سے ہنسا— سامنے ہی آئینہ تھا۔ میں آئینہ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ بالوں کو کل رات ہی میں نے ڈائی کیا تھا۔ سر پر بیس بال ٹوپی تھی۔ بلیو جینس، ٹی شرٹ اور کنواس کے شو میں میں بیٹے کا بڑا بھائی لگ رہا تھا۔

میں ہنس رہا تھا— کہاں ہے عمر— دیکھو......

وہ.....آپ نے بال ڈائی کیے......

تو—؟ نہیں کرنا چاہیے—؟

پاشا پھر گڑبڑا گیا— نہیں میرا مطلب ہے، آپ میری عمر میں آنے کے لیے کوشش کر رہے ہیں۔

کر رہا ہوں......تو اس میں برا کیا ہے— اور نتیجہ سامنے ہے۔ کوشش کرتے ہوئے میں تقریباً تمہاری عمر میں سمٹ آیا ہوں......

پاشا اس بار مجھے بغور دیکھ رہا تھا۔

ہماری عمر میں سمٹ کر کیا کروگے؟ پاشا نے اس بار میری آنکھوں میں اپنی آنکھیں مرکوز کر دی ہیں۔

'تم اپنی عمر کا کیا کروگے—؟ میں مطمئن ہوں۔ جیسے میں سوالوں کے پل صراط سے گزرتے گزرتے اچھے برے کے تمام نتائج سے گزر چکا ہوں۔

'میں؟' پاشا ہنس رہا تھا۔ ہماری تو ابھی زندگی شروع ہوئی ہے......

'کیسے کہہ سکتے ہو کہ ہماری زندگی ختم ہوگئی......؟ میں نے الٹا سوال داغ دیا۔ میں ۴۵ کا ہوں— ہوسکتا ہے۔ ۴۵ سال اور

زندہ رہوں۔ ۹۰ سال کے کتنے ہی لوگ آسانی سے آس پاس مل جائیں گے۔ ممکن ہے، میں ہنس رہا تھا۔ ۹۰ سال تک میری جوانی اسی طرح قائم رہے— اور میں اسی طرح اس عمر میں بھی اڑتا رہوں......

پاشا مطمئن نہیں تھا۔ وہ وہی بات دہرانے پر مجبور تھا جو اس کی عمر کے بچے دہراتے ہیں— مثلاً— میرے پاس کیریر ہے۔ رومانس ہے...... نیا آسمان ہے......'

'اور میرے پاس بھی—'

مجھے مزہ آرہا تھا۔ میں ہر بار اپنے لیے نیا کیریر، نئی منزل تلاش کرسکتا ہوں۔ میں آج بھی لڑکیوں پر جادو کرسکتا ہوں۔

''آنٹیوں پر......' پاشا نے مجھے روکا......

کہہ سکتے ہو— میں ان کے ساتھ بھی تم سے زیادہ اچھے رومانی مکالمے بول سکتا ہوں اور یہاں پر میرا تجربہ بھی میرے ساتھ ہوگا— جبکہ کہیں بھی ڈیٹنگ کے لیے پارک یا ہوٹل میں یا موبائل پر تمہیں مکالمے سوچنے ہوں گے— میں قہقہہ لگا رہا تھا۔ تم ابھی بہت پیچھے ہو— تمہاری اڑان ابھی شروع ہوئی ہے۔ اور میں...... مجھے دیکھو...... میں تو بس اڑتا جا رہا ہوں......'

اس بار پاشا نے سر جھکا لیا تھا۔

◆◆

مجھے پاشا کا خاموش ہونا اچھا نہیں لگا۔ یہ دلچسپ مکالمے تھے۔ اور مجھے خوشی تھی، برسوں بعد میں نے پاشا مرزا میں زندگی کی کرن دیکھی۔ برسوں بعد اس گھر کی ویرانی اور اداسی کے ماحول میں پاشا کی ہنسی گونجی۔ میں جانتا تھا، میری کوئی اڑان نہیں ہے۔ وقت نے میری اڑان روک دی ہے۔ بی مشن ایک خوفناک آندھی کی طرح آہستہ آہستہ ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔ لیکن میں پاشا کو اس حقیقت پسند دنیا سے دور رکھنا چاہتا تھا۔

(۵)

میری اپنی رومانی دنیا تھی۔ میں اکثر اس رومانی دنیا کے دروازے اپنے لیے کھول لیا کرتا تھا۔ اور میں اپنے ہم عمر دوسرے دوستوں کو بھی اسی رومانی دنیا کے دروازے کھول لینے کی صلاح دیا کرتا تھا—

میرے دوست ہنستے تھے— اب اس عمر میں کیا رومانی ہونا۔

مجھے یہ منطق ناپسند تھی— رومانی ہونے کے لیے بس اندر کے احساس کو جگانا ہوتا ہے۔ یوں...... میں ہنس کر چٹکیاں بجاتا— اور اس کے لیے عمر کوئی چیز نہیں ہے—

'بڑھتی عمر کا احساس پاگل کرتا ہے۔'

'تمہیں کرتا ہوگا—' مجھے اپنے دوستوں پر ہنسی آتی تھی......

'تم بھی اب پہلے کی طرح جوان نہیں رہے—' میرے دوست مجھے بوڑھے ہونے کا احساس دلایا کرتے۔

میں دل کھول کر ہنستا— ’جیسے آج ابھی اس وقت تمہیں میری کنپٹیوں کے بال سفید دکھ رہے ہیں۔؟‘
’ہاں‘
’میرے بیٹے نے بھی یہی کہا تھا...... مجھے ہنسی آتی ہے۔
’پھر......‘
’یہ سفیدی نہیں تجربہ ہے۔اور تجربے میں عمر نہیں آتی......‘
’پاگل ہو......‘
میں مسکراتا ہوں—اسے ڈائی کروں نہ کروں......تمہاری طرح عمر اوڑھ نہیں سکتا......اور جانتے ہو...... مجھے کبھی احساس نہیں ہوا کہ...... میں ایک جوان ہو رہے بچے کا باپ ہوں......‘
’اسکیپ۔‘
’بالکل بھی نہیں—‘ میری آنکھیں کہیں دور دیکھنے لگتی ہیں۔لیکن ٹھہرو۔اس عمر میں جیسا کہ اس وقت میں ہوں......میرا باپ اس عمر میں ایک بوڑھا آدمی تھا—اور جانتے ہو وہ بوڑھا آدمی کیوں تھا......؟‘
دوست ابھی بھی مجھے نہیں سمجھ میں آنے والے انداز میں دیکھ رہے تھے۔
’اس لیے کہ اس کے ماحول نے—اس کے معاشرے نے اسے ایک بوڑھے آدمی میں تبدیل کر دیا تھا۔ایک ذمہ دار شخص۔ایک بزرگ— گھر پر نگاہیں رکھنے والا۔زمانے کے سرد و گرم کا احساس کرنے والا—یہاں تک کہ باپ نے اس عمر میں اپنے پہناوے تک بدل لیے تھے۔اور میں......‘
میں ہنس رہا تھا— میں نے اس بزرگی کو دور کہیں روک دیا ہے۔بالکل پاس مت آنا۔ابھی بیسیوں سال نہیں۔کیونکہ ابھی آگے کے بھی کئی سال میں بزرگی بھرے احساس کے ساتھ نہیں کاٹ سکتا— میں ہنس رہا تھا—
’تم بزرگ ہونے سے ڈرتے ہو۔جبکہ سچائی یہ ہے کہ بڑھاپا تمہاری عمر میں دستک دینے لگا ہے۔‘
دوست مسکراتے تب بھی میں اپنی تمام اداؤں اور جلوہ سامانیوں کے ساتھ اپنی دنیا میں گم رہتا—

.........اور واقعہ یہ ہے کہ وہ دنیا ہمیشہ میرے آس پاس منڈلایا کرتی ہے—وہ دنیا جسے میں دلّی جیسے مہانگر کی بھیڑ میں گم ہو کر کافی پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ایک بڑا سا گھر— گھر کے باہر جھولتا ایک پردہ۔ٹوٹی دیواریں۔اس دروازے اور دیواروں کے درمیان ایک بند بندسی دنیا آباد تھی—مجھے اپنے باپ کی مکمل دنیا اسی چہار دیواری میں نظر آتی تھی۔سر جھکائے آنا اور جانا۔

اور ظاہر ہے میرے باپ کے پاس ان باتوں کا رٹا رٹایا جواب تھا۔
’یہی سب ہمیں سکھایا گیا۔‘
’مطلب مجھے بھی سیکھنا ہے۔‘
’ہاں۔کیونکہ یہی ہماری تہذیبی وراثت ہے۔‘
’جبکہ باہر ایک دنیا بدلنے پر آمادہ ہے—‘
’دنیا کے بدلنے سے ہم نہیں بدل جاتے۔‘

مجھے رنج ہوتا— ’آپ نے بھی سب کچھ بدلتے ہوئے دیکھا ہے۔ پھر بھی آپ وقت کے ساتھ چلنا نہیں چاہتے—‘
میرے باپ ذرا بھی برا نہیں مانتے— ’اب تم ہو— تمہاری باری ہے۔ ہم اپنی زندگی جی چکے— تمہیں اپنی جینی ہے—‘

اور تبھی میں نے فیصلہ کیا تھا— مجھے باپ کی طرح کمزوریوں کی فصیل پر کھڑا نہیں ہونا ہے—
کیونکہ میرے نصیب میں اڑنا لکھا ہے—
اور یہی وہ وقت تھا جب ساری دنیا تیزی سے بدل رہی تھی اور میں بھی اسی دنیا کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا چاہتا تھا—
چھوٹا شہر— ٹوٹی دیواریں...... بے رونق دروازوں کو چھوڑ کر میں نے ایک لمبی اڑان بھری......اور شہر آ گیا—
لیکن شہر میں اڑنے تک کا راستہ بہت آسان نہیں تھا—
ہاں یہ الگ بات تھی کہ میں نے اپنی محنت سے اس راستے کو کسی حد تک آسان بنایا تھا—
لیکن اس آسان راستے میں مجھ سے اچانک چھوٹی چھوٹی غلطیاں ہونے لگی تھیں— اور جیسے مجھے اس بات کا احساس تھا کہ میرا بیٹا میرے بارے میں ایسا بہت کچھ جان گیا ہے، جو اسے نہیں جاننا چاہیے تھا۔

◆◆

کیا میرے بیٹے نے کچھ دکھا ہے؟
خواستہ، نرم مگر کمزور سیوئی اور لچھوں کی بالیوں کی طرح میری شخصیت بھی کئی حصوں میں منقسم تھی۔ میں محسوس کرتا تھا کہ چالیس کی عمر پار کرنے کے بعد ایک پرشور دریا آپ کو آواز دیتا ہے، جہاں بڑی بڑی آئیڈیالوجی کمزور مٹی کی طرح بہہ جاتی ہے۔ عمر کے اس پڑاؤ پر ایک انسان بہروپیا بن جاتا ہے۔ اس میں وفادار شوہر بھی ہوتا ہے اور بے وفا شوہر بھی۔ اس میں ایک اچھا اور برا باپ بھی ہوتا ہے۔ اس میں ایسی آگ ہوتی ہے، جس آگ پر قابو پانا آسان نہیں ہوتا۔ یہ آگ اس حد تک بھڑکتی ہے کہ گھر اور باہر کی زندگی کے بہروپ بدل جاتے ہیں۔ بارش میں بھیگے ہوئے پھولوں کو دیکھیے تو یہ پھول خشک پھولوں سے زیادہ حسین نظر آتے ہیں۔ ایک بہاؤ سے گزرنے کے بعد، آگ کا ایک سمندر پار کرنے کے بعد غسل کرتے ہی میرے اندر کا نیک اور پیارا انسان زندہ ہو جاتا۔ میں اس بات کو قطعی طور پر تسلیم کرنے کے حق میں نہیں ہوں کہ ایکسٹرا میریٹل ریلیشن کے بعد آپ گھر کے لیے وفادار نہیں رہتے۔ خواستہ اور نرم سیویوں کی طرح، کچھ حیرت انگیز لمس کی بالیاں میرے اندر رہ گئی تھیں۔ رما آہوجہ مجھے شیطان کہتی تھی۔ تارا دیش پانڈے کو میرا سیاہ گلاس آنکھوں پر لگانا پسند نہیں تھا۔ وہ کئی بار گلاس آنکھوں سے اتارنے کی کوشش کر چکی تھی۔ دو ایک موقع پر یہ دونوں خاتون میرے گھر بھی آئی تھیں۔ سارہ میری پرائیویٹ زندگی میں دخل نہیں دیتی تھی۔ میں کس سے باتیں کر رہا ہوں اور میرے کمرے میں کون ہے، اس کو ان باتوں سے مطلب نہیں ہوتا تھا۔ ہیمنگوے، دوستووسکی، شیلی، کیٹس، بائرن میں نے سیکڑوں ادیبوں کی کہانیاں پڑھی تھیں، جن کی زندگی میں آئی ہوئی عورتوں کی ایک لمبی تفصیل تھی۔
سبحان علی کا کہنا تھا، ’ بس اپنے آپ کو چھپائے رکھو اور معصوم میمنا بنے رہو۔‘
’ اس سے کیا ہوگا؟‘
’ کسی کو بھی تم پر شک نہیں ہوگا۔‘ اس نے قہقہہ لگایا۔ چالیس پار کا آدمی ایک درندہ ہوتا ہے۔ تم بھیڑیا بھی کہہ سکتے ہو۔ اس

بھیڑیے کو سکون نہیں ملتا۔ اس آدمی کو ایک ایسا پانی سے لبالب بھرا ٹب چاہیے جو اس کے اندر کی ساری حرارت کو نیبو کے رس کی طرح نچوڑ لے۔ اس کے باوجود بھی بھوک قائم رہے گی۔'

پورن سائیٹ، سیکس چیٹ کا راستہ بھی مجھے سبحان علی نے ہی سب سے پہلے دکھایا تھا۔ مجھے یاد ہے۔ وہ زور سے چیخا تھا۔

' اپنی اداسیوں کو ذلیل مت کرو۔ اور خود کو مرنے کے لیے مت چھوڑو۔'

اس بار وہ سنجیدہ تھا۔ سنو جہانگیر مرزا۔ ہیمنگوے نے کہا تھا، زمین کا ایک ٹکڑا بھی سمندر بہا کر لے گیا تو زمین کم ہو جاتی ہے۔ ایک بھی آدمی مرتا ہے تو، انسانی برادری میں کمی آجاتی ہے — یہاں کوئی جذباتیت، آدرش یا رشتے نہیں ہیں —

ٹہلتے ہوئے سبحان علی نے اپنی بات جاری رکھی۔ 'سنو۔ چہرے کو شمشان بنانے سے کام نہیں چلے گا — میں نظام کو قصوروار نہیں کہتا، کیونکہ یہ سسٹم ہم نے ہی تیار کیا ہے۔ جہاں ایک بڑا سا مین ہول ہے۔ گڑھا...... اور ہم آہستہ آہستہ یہاں اپنا کوڑا ڈالتے جا رہے ہیں — اس سسٹم نے صرف ایک چیز سکھائی ہے — اڑنا ہو تو سامنے والے کے پر کاٹ دو — سب اپنی خواہش، اپنی آزادی اور اپنے آسمان کے لیے خودغرض ہو چکے ہیں — اس سسٹم میں مرجانا کوئی حل نہیں ہے — اور نہ ہی ہماری عمر مرجانے کے لیے ہے......

وہ دوبارہ میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔ وہ ہنس رہا تھا — 'پینسٹھ سال کی عمر میں رچرڈ گیئر ہماری شلپا شیٹی کو کس کرسکتا ہے — ان کے جیمس بانڈ، زیرو زیرو سیون پچاس سے زیادہ عمر میں ہزاروں فٹ کی بلندی سے کودنے کا فیصلہ لیتے ہیں اور تم —

وہ مسکرا رہا تھا — سچ کہوں تو یہ دنیا بہت حسین ہے۔ مگر ان کے لیے جو جینا جانتے ہیں۔

اُس نے لیپ ٹاپ اوپن کیا...... چہرے پر مسکراہٹ تھی...... نئی زندگی تلاش کیوں نہیں کرتے۔ ایک نئی زندگی۔ ایک نیا آسمان — جہاں اپنی مرضی سے اپنی نئی خوشیاں تلاش کرلو۔

لیپ ٹاپ پر اس کی انگلیوں کا رقص جاری تھا۔ اسکرین روشن تھی۔ اس نے پورن سائٹ کھول لی تھی...... ہاتھ تیز تیز چل رہے تھے...... کوئی فلوریا، کوئی عینا، کوئی جسمین ......

وہ ہنس رہا تھا — دیکھو میں جانتا ہوں، سب دیکھ رہے ہو تم — یہاں سب اپنی تھکان مٹانا چاہتے ہیں۔ آپ کو ریلیکس ہونا ہے۔ آپ کے آن لائن ہوتے ہی سمجھ جاتی ہیں کہ آپ چاہتے کیا ہیں...... کبھی کبھی کارل مارکس، لینن اور دوستووسکی کا ادب پھینک کر سب کچھ بھول جانے کی خواہش ہوتی ہے۔ کچھ دیر، دنیا بھر کی الجھنوں سے الگ، ان ہاٹ پریوں کے ساتھ...... وہ دیکھو...... اس نے سارے کپڑے اتار دیے ہیں...... ہندوستان سے پاکستان، شری لنکا، نیپال اور ایران تک — یا پھر رومانس چیٹ روم کی یہ بند اس پریاں — جیسے دنیا میں صرف ایک چیز رہ گئی ہے — بھوک — دماغی الجھنوں اور دباؤ سے کچھ لمحہ ہم آزادی چاہتے ہیں — غلط یہ ہے کہ ہم سیکس پر کبھی بات کرنے کو تیار نہیں ہوئے — یہ لڑکیاں بھی ہاٹ چیٹ کے بعد سب کچھ بھول کر ایک عام لڑکی یا عورت میں تبدیل ہو جاتی ہوں گی۔ کچن میں چائے تیار کرتی ہوئی — یا کالج کے نوٹس تیار کرتی ہوئی — بھوک ہے تو بھوک کا اقرار کرتے ہوئے شرمندگی کیسی؟ جسم میں آگ ہے تو اسے ٹھنڈا کر کے کیسے جیا جاسکتا ہے —؟ یہاں تہذیب وروایت کی کوئی تھیوری کام نہیں کرتی۔ اس لیے میں کارل مارکس اور پریم چند کو پڑھتے ہوئے بھی ان کے ساتھ چاہتا ہوں کہ یہ مجھے آسانی سے حاصل ہو جاتی ہیں۔

ایک لمحے کے لیے میری پلکیں ہلی تھیں شاید...... اسکرین پر ننگی 20 سالہ لڑکی اپنے حسین، پرکشش، ننگے جسم کی نمائش کر رہی تھی —

لیکن کیا وہ سب کچھ جو سبحان علی کہہ رہا تھا، کیا ممکن تھا میرے لیے؟ میں ایکیوریم کے باسی پانی میں رکھی بے جان مچھلی کی طرح مردہ تھا۔ سانسیں تو چل رہی تھیں، لیکن دماغ سے جسم تک سب کچھ ایک بے جان روح کی طرح——

'کیا ایسا ممکن ہے؟'

'کیوں نہیں۔'

اداسی سر نکالتی تو میں ایک ایسے شاور کے نیچے بھیگ رہا ہوتا جس کے پانی میں ہزاروں گلابوں کی مہک شامل تھی۔ یہ مہک مجھے تر و تازہ رکھتی تھی۔ انسان کی جون میں پیدا ہونے والے فرشتے نہیں ہوتے، مجھے اس بات کا احساس تھا۔ اس بہروپیے کا دوسرا چہرہ ایک باپ کا تھا، جو اپنے بیٹے پاشا مرزا سے بے پناہ پیار کرتا تھا۔ برسوں بعد پاشا مرزا کی ہنسی اور اس کی پیاری پیاری باتوں نے مجھے اس کرب سے باہر نکالا تھا کہ وہ مجھ سے صرف نفرت کرتا ہے۔ کہیں نہ کہیں مجھے اس بات کا بھی احساس تھا کہ ایک چھوٹی سی جگہ اس کے دل میں میرے لیے محفوظ ہے۔

اس رات ڈنر ٹیبل پر پاشا مرزا نے ایک انکشاف کیا۔ میں اور سارہ دونوں ایک دم چونک گئے۔

پاشا نے بتایا۔ کچھ روز سے اسے لگ رہا ہے کہ اس کا پیچھا کیا جا رہا ہے۔

'پیچھا...؟' سارہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

'ہاں.... پہلے مجھے بھی لگا کہ میرا وہم ہے۔ کئی بار گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے بھی احساس ہوا کہ کوئی میری طرف دیکھ رہا ہے۔'

'کیا تم نے کبھی اس شخص کا چہرہ دیکھا؟'

'نہیں۔'

'پھر تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے؟'

'دو تین بار کالج جاتے ہوئے بھی لگا کہ کوئی موٹر سائیکل سے میرا پیچھا کر رہا ہے۔'

'یہ تو خطرناک معاملہ ہے۔' میرا سر چکرا رہا تھا۔

'کیا ہم پولیس کو خبر کریں؟' سارہ نے پوچھا۔

'نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔' پاشا مرزا کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ 'کچھ ہوا تو میں اکیلا کافی ہوں۔'

'لیکن یہ کوئی چھوٹی موٹی بات تو نہیں۔ کل کوئی واقعہ یا حادثہ ہو سکتا ہے؟' میرا سر گھوم رہا تھا۔ سارہ کے چہرے پر سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔

'تم ابھی کچھ دن تک باہر نہیں نکلو۔'

'ابھی میرے اتنے برے دن نہیں آئے۔' پاشا مرزا سنجیدہ تھا۔ اب کچھ ہی دنوں کی جاب بچی ہے۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

'مگر پیچھا کون کر سکتا ہے، تمہارا کوئی دوست؟'

'میرے دوست پیچھا کیوں کریں گے؟' پاشا ہنسا۔

'کسی سے کوئی جھگڑا۔'

'ہمارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔'

' کبھی کوئی مذہب کی بات....،میں کہتے کہتے ٹھہر گیا۔

' ہمارے دوست مذہب نہیں مانتے۔ میرا بھی بھروسہ نہیں'، پاشا نے پلٹ کر ہم دونوں کی طرف دیکھا۔اس بات پر اتنا فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہاں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ یہ میرا وہم نہیں ہے۔ مگر وہ لوگ کون ہیں۔ میں نہیں جانتا۔ مگر جو بھی ہے، وہ سامنے تو آئے۔'

پاشا مرزا نے خوفزدہ کر دیا تھا۔ جب آپ خوفزدہ ہوتے ہیں تو اس وقت ہزاروں کی تعداد میں جسم پر دیمکوں کا حملہ ہوتا ہے۔ میں خود کو مفلوج و بے بس محسوس کر رہا تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں دیمک جسم سے چپک گئی ہیں۔ مجھے کھوکھلا کر رہے ہیں۔ میرے پاس کوئی ایسی طلسمی طاقت بھی نہیں کہ اپنے بیٹے کو محفوظ رکھ سکوں۔

میں نے ایک سفید کاغذ اٹھایا۔ ماچس کی تیلی جلائی۔ کاغذ سے دھواں اٹھنے لگا۔ میں نے کچھ دیر تک دھویں پر آنکھیں مرکوز رکھیں۔

کیا یہ ہم ہیں؟ ہماری آئیڈیالوجی۔ یا سلگتا ہوا ملک ہے ہمارا؟

جمعہ کے روز نائٹ شفٹ جانے کے لیے پاشا مرزا نے کیب بک کرانی چاہی تو جواب ملا۔ ساری سر۔ ہماری سروس مسلمانوں کے لیے نہیں ہے۔ اس سے ایک دن پہلے پزا آرڈر لینے والے نے بھی یہی جواب دیا تھا۔ موسم بدل رہا تھا۔ اور اس بدلے ہوئے موسم کو پاشا مرزا بھی محسوس کر رہے تھے۔ اچانک اس بات کا احساس ہونے لگا تھا کہ زندگی کے تمام شعبوں سے مسلمان اور اقلیت نام کے جانور کو علیحدہ کیا جا چکا ہے......اور سب کچھ سوچے سمجھے منصوبوں کے ساتھ ہو رہا ہے۔

◆◆

پاشا مرزا کی نائٹ شفٹ ختم ہو چکی تھی۔ انہوں نے اپنے پیسوں سے اپنے کالج کی فیس جمع کرادی۔ مجھے اس بات کا صدمہ تھا کہ میں اپنے بیٹے کے لیے فیس کا انتظام بھی نہیں کر سکا۔ دو مہینے پورے ہونے کے بعد پاشا مرزا اپنی تنہائی اور خاموشی کی دنیا میں واپس لوٹ گئے تھے۔ اس درمیان رمضان کا مہینہ آ گیا۔ اور پھر عید بھی آ گئی۔ میرے ہمسایوں نے افطار پارٹی اور عید دونوں کا بائیکاٹ کیا۔ میرے پڑوسی خفیہ افسر نے صاف صاف کہا کہ آپ کے تہوار میں شامل ہونا ہمارے دھرم کے خلاف ہے۔ ناگارجن نے بھی ہنستے ہوئے کہا، برہمن کو کیوں اچھوت بنانا چاہتے ہیں۔ جبکہ یہی ہمسائے تھے جو افطار، عید، بقرعید کے موقع پر بغیر بلائے بھی ہماری خوشیوں میں شامل ہو جاتے تھے۔

عید کی رات، میں آس پاس کے ماحول سے خاصا بیزار تھا۔ اس شب میں نے اپنی ڈائری میں لکھا۔

کچھ کہانیاں تھیں، ہم جن کو سن کر بچپن میں ٹھہاکے لگاتے تھے۔ اب وہی کہانیاں ہیں، لیکن ہم ٹھہاکے نہیں لگاتے۔ افسوس کرتے ہیں۔ رنجیدہ ہوتے ہیں۔ اور یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اندھوں کے قبرستان میں ملک کی مکمل آبادی کو اتار دیا گیا ہے۔ کچھ یہاں جشن منا رہے ہیں۔ کچھ مر رہے ہیں۔ کچھ کو مارا جا رہا ہے۔ ایک اسٹیج ہے جہاں نہ ختم ہونے والی تاریکی میں کچھ جوکر کھڑے ہیں۔ ایک بڑا جوکر ہے۔ ایک اس سے کم مسخرہ، ایک دانشور جوکر بھی ہے، جو تاریکی میں بھی نوٹ گنتا ہوا جب قہقہے لگاتا ہے تو قبرستان کے مردے بھی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگتے ہیں کہ آیا یہ مسخرے زمین سے آئے ہیں یا مریخ سے، چاند سے آ رہے ہیں یا کسی بلیک ہول سے نکل کر اسٹیج پر جمع ہوئے ہیں. جوکر ہیں؟ معمولی مسخرے ہیں؟ کسی ملک کے نمائندے ہیں؟ یا آسمانی خدا نے شیطانوں کی نئی فوج پیدا

کر دی ہے کہ جاؤ، اور ایک زمانے پر اپنے ہونے کا ایسا انکشاف کرو کہ تاریخ کی کتابیں بھی تمہارے لطائف پر شرمندہ ہوسکیں.. جب انسان مریخ اور نئی دنیا و کائنات کے تعاقب میں ہے، تم اس انسان کی فتوحات پر بریک لگانے کے لیے، اس ترقی یافتہ انسان کو اندھوں کے قبرستان میں لے جاؤ۔ سائنس و ٹیکنالوجی کے دروازے بند کر کے مذہبی عمارات کے سارے پٹ کھول دو۔

سو ہم وحشی دنیا سے نکلے اور اندھوں کے مقبروں میں آ گئے --

ایک بادشاہ کا وفادار ایک بندر تھا۔ ایک دن شکار کھیلتے ہوئے بادشاہ کو نیند آ گئی۔ بندر پاس میں تھا۔ بندر نے دیکھا کہ ایک مکّھی دیر سے بادشاہ کو پریشان کر رہی ہے۔ بندر نے تلوار اٹھائی اور ناک پر بیٹھی ہوئی مکھی کو ہلاک کرنے کے ارادے سے تلوار چلا دی مکھی اڑ گئی...

کبھی کسی ملک کو مکھی اور پتنگوں کی طرح اڑتے دیکھا ہے آپ نے؟

ایک بانسری والا تھا جو بین بجا کر گھروں سے چوہوں کو بلایا کرتا تھا۔ پھر چوہوں کو لے کر آبادی سے دور کسی گھاٹی کی ترائی میں اتار دیتا.. بستی کے لوگوں نے پہلے اس کارنامے کو معجزہ سمجھا۔ ایک دن وہ بانسری والا دوبارہ آیا۔ بین بجا کر بستی کے تمام لوگوں کو اندھوں کے قبرستان لے گیا...

ہیلو.. ہیلو.. ہم پندرھویں صدی کے، اندھوں کے قبرستان سے بول رہے ہیں.. کیا ہماری آواز آپ تک پہنچ رہی ہے..؟

◆◆

دوسرے دن سبحان علی ملنے آیا۔ میری ڈائری پڑھ کر وہ زور سے ہنسا......اندھوں تک ہماری آواز نہیں پہنچے گی۔ کس خواب کی دنیا میں رہتے ہو۔'

میں نے اسے بتایا کہ پاشا مرزا کے ساتھ پچھلے دنوں کیا ہوا۔ میں نے غور کیا، سبحان علی کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ اس کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئی تھیں۔

' کیا بات ہے سبحان علی۔'

' کچھ دنوں سے سمیرا کے ساتھ بھی یہی ہو رہا ہے۔'

سبحان علی خوفزدہ تھا۔ پہلے میں نے اس بات کو سمیرا کا وہم سمجھا تھا۔ سعدیہ بہت ڈر گئی تھی۔ کچھ دنوں تک سعدیہ نے سمیرا کو اسکول بھی نہیں جانے دیا۔ اب وہ سمیرا کو اسکول چھوڑنے اور واپس لانے جاتی ہے۔ مگر ایک دن......'

' ایک دن کیا.....'

سمیرا نے بتایا.....کچھ لوگ اس کا پیچھا کر رہے تھے جب وہ سمیرا کو لے کر اسکول سے لے کر لوٹ رہی تھی۔

' تم نے پولیس میں رپورٹ درج نہیں کرائی؟'

سبحان علی زور سے چلایا۔ پولیس کس کی ہے۔ ملک میں جو تماشہ ہو رہا ہے، وہ تماشہ یاد کیوں نہیں رکھتے۔ ملک کی تقسیم نے بہت دنوں تک اکثریت کے اندر انتقام کے جذبے کو دبائے رکھا تھا۔ یہ مت بھولو کہ بی مشن آزادی سے پہلے بھی تھا اور خاموشی سے اپنا کام

کرر ہا تھا۔ ہمیں اس بات کا احساس بھی نہیں ہوا کہ چھوٹی چھوٹی سطح پر ہمیں کاٹا جا رہا ہے۔ ہم فوج میں نہیں تھے۔ پولیس میں ہماری شمولیت نہیں کے برابر تھی۔ دنگے اور فسادات میں پولیس کا کردار نمایاں تھا۔ اور بی مشن سے پہلے جو بھی سیاسی پارٹیاں وجود میں آئیں، ہر جگہ بی مشن کے لوگ تھے۔ ملک کے ہر گوشے میں، ہر خفیہ تنظیم میں برہمن موجود تھا۔ ہمیں آئین، جمہوریت اور سیکولرزم کے کھلونے دے کر بہلایا گیا۔ اور ہم اس بہلاوے میں اس وقت تک رہے جب تک وہ اقتدار پر غالب نہیں ہو گئے۔

'برہمن؟'

'آزادی کے بعد سے اب تک کی مثال لے لو۔ مٹھی بھر برہمن ہر جگہ ہم پر حاوی رہے۔ اور آہستہ آہستہ.....'

سبحان علی کی آواز کمزور تھی۔ پاشا مرزا بھی خطرے میں ہیں اور سمیرا بھی۔ ہم دونوں بھی۔

اس کے بعد سبحان علی رُکے نہیں۔ انھوں نے چائے بھی نہیں پی اور خاموشی سے اٹھ کر دروازے سے باہر نکل گئے۔

(۶)

اڑیسہ میں غریب دلتوں کو جنہوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا، کچھ غنڈوں نے انھیں زندہ جلا دیا۔ خواتین کی عزت لوٹی۔ جب ایک ڈاکیومینٹری بنانے والے فلم میکر نے جنگلوں کا طویل راستہ طے کر کے اس علاقے کو دیکھنے کی کوشش کی تو اسے پادری کا جلا ہوا گھر نظر آیا۔ بے شمار جلی ہوئی چیزوں کا ملبہ بکھرا پڑا تھا، اس کے پیچھے وہی لوگ تھے جن کا ذکر سبحان علی نے کیا تھا۔ ساڑھے تین سو گرجا گھروں یا عبادات کے مقامات کو تباہ و برباد کیا گیا۔ آدی واسیوں کو ان کے معاشرے سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان کے لیے الگ اسکول بنوائے گئے۔ حیدرآباد یونیورسٹی کے دلت اسکالر کی موت کو خودکشی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ تعلیمی اداروں میں پسماندہ اور دلتوں کے ساتھ انصاف کی آواز بلند کرنے والی آواز کو خاموش کر دیا گیا۔ اس درمیان کچھ ادیبوں اور صحافیوں کے قتل کی وارداتیں بھی سامنے آئیں۔ دلتوں کو تقسیم کرنے کے لیے کچھ نئی سیاسی پارٹیاں سامنے آگئیں۔ یہ سب کچھ بڑے پیمانے پر ہو رہا تھا۔

میں اس گھٹن سے باہر نکلنا چاہتا تھا۔ آزادی کے بعد سے لے کر اب تک کا سیاسی وثقافتی منظر نامہ میرے وجود کے ریزے ریزے کر رہا تھا۔ ان ہزاروں واقعات میں مسلمانوں کی ہلاکت بھی شامل تھی۔ میں اداسی کے بھنور سے باہر نکلنا چاہتا تھا۔ میں نے تارا دیش پانڈے کو فون لگایا۔ اس وقت تارا کا خوبصورت بدن میری آنکھوں کے سامنے تھا۔

'کیسے فون کیا؟' دوسری طرف تارا نے فون اٹھایا۔ اس کی آواز میں 'چہک' اور مہک دونوں شامل تھی۔

'یاد آئی تمہاری۔'

'اچھا، اتنے دنوں بعد؟'

'یاد تو کبھی بھی آسکتی ہے تارا، باہر بارش ہو رہی ہے۔'

'اوہ، تارا کے ہنسنے کی آواز آئی۔'

'زندگی میں رہ کیا گیا ہے تارا۔ مذہب میں الجھو تو مسائل گھیرتے ہیں۔ مسائل میں الجھو تو سیکس پریشان کرتا ہے۔'

'اوہ۔' تارا زور سے ہنسی۔ 'تو اس وقت سیکس پریشان کر رہا ہے تمہیں۔'

' بہت زیادہ۔ بارش اور تم۔ یہ کمبنیشن کیسا ہے۔'
دوسری طرف سے کھلکھلانے کی آواز آئی۔ اس کمبنیشن میں خود کو شامل نہیں کیا؟'
' میں تو پہلے سے ہی شامل ہوں۔'

مجھے احساس ہوا، کوئی میری باتیں سن رہا ہے۔ دبے قدموں کی آہٹ تھی۔ اس وقت میں ہمیشہ کی طرح ریڈنگ روم میں تھا۔ رات کے ۹ بجے تھے۔ باہر مینہ برس رہا تھا۔ میں نے اچانک فون کاٹ دیا۔ کیا یہ میرا وہم تھا کہ کوئی میری بات سن رہا ہے۔ کیا پاشا مرزا؟ یا سارہ؟ میں سارہ سے خوفزدہ نہیں تھا۔ لیکن پاشا مرزا سے ڈرتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرے اس روپ کو بھی دیکھے۔ میں کچھ دیر تک سنّاٹے میں رہا۔ کمرے میں بکھری ہوئی کتابوں کو دیکھتا رہا۔ پھر میں نے خود کو مضبوط کیا۔ مجھے یہ جاننا ضروری تھا کہ کیا پاشا مرزا دروازے پر کھڑے تھے؟ میں سیدھے طور پر ان سے یہ بات نہیں پوچھ سکتا تھا۔

میں نے دروازہ کھولا۔ پاشا مرزا کے کمرے کا دروازہ آدھا بند تھا۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھل گیا۔ سامنے پاشا مرزا اپنے لیپ ٹاپ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔
' جی کیسے۔'
' باہر بارش ہو رہی ہے۔ خیال آیا، تم سے کچھ باتیں کروں۔'
' جی' پاشا مرزا نے آہستہ سے کہا۔
اس کے بعد گفتگو کے دروازے کھل گئے۔ میں نے محسوس کیا، پاشا مرزا کے چہرے پر بہت ساری سلوٹیں جمع تھیں۔

'تو کیا سوچا ہے تم نے؟'
' کس بارے میں'
میں نے پاشا مرزا کی طرف غور سے دیکھا — پاشا بغور میری آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔
'لیکن کچھ تو سوچا ہوگا؟'
'ہاں۔' پاشا نے گہری سانس لی۔
'مجھے بتاؤ گے؟'
'میں بتانا ضروری نہیں سمجھتا......'

پاشا اب بھی میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ مجھ کو اس طرح دیکھنے سے الجھن ہو رہی تھی۔ شاید اسی لیے میں نے نظریں جھکا لیں۔ ایسا کرتے ہوئے پاشا سے مکالمہ کرنا میرے لیے آسان ہو گیا تھا۔
'تو تم مانتے ہو کہ میں ایک اچھا باپ نہیں ہوں۔'
'ہاں۔' پاشا کے اندر کوئی جھجھک نہیں تھی۔ 'ایسے باپ میرے دوستوں کے بھی ہیں۔ اور دوست اپنے باپ کی کہانیاں سناتے ہوئے ذرا بھی پریشان نہیں ہوتے۔'
'تو تم بھی پریشان نہیں ہو۔'

پاشامرزانے ایک لمحے کے لیے میری طرف دیکھا۔اس کا لہجہ سخت تھا— 'لیکن میں پریشان ہوں۔کیونکہ میں اپنے دوستوں کی طرح نہیں ہوں۔اور میں نے کبھی آپ کواس طرح نہیں سوچا،جیسے آپ نظر آتے ہیں۔

'تو یہ تمہاری غلطی تھی نا،کہ تم نے باپ کوفرشتہ سمجھا— جبکہ باپ بھی انسان ہوتے ہیں۔باپ سے بھی غلطیاں ہوتی ہیں۔باپ سے بھی گناہ اور جرم سرزد ہوتے ہیں۔اس کے باوجود باپ اپنے بیٹوں کو پیار کرتے ہیں۔کیونکہ اس کی اپنی ذات اور بیوی بیٹے کے لیے اس کی موجودگی ترازو کے دو پلڑوں کی طرح ہوتی ہے۔تو تمہارے خیال سے......؟'

میں نے اس بارنظر اٹھا کر پاشا کی طرف دیکھا—

پاشااب بھی میرے چہرے کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کررہا تھا—

تو تمہارے خیال سے ایک باپ کوزیادہ ہنسنا نہیں چاہیے......'

'کیوں نہیں چاہیے۔'

'باپ کوفیشن نہیں کرنا چاہیے۔باپ کواڑنا نہیں چاہیے—باپ کوایک بزرگ کی طرح رہنا چاہیے۔باپ کوعشق نہیں کرنا چاہیے۔'

پاشا کی آنکھوں میں اچانک چمک پیدا ہوئی تھی۔اس بار میرا چہرہ ہرطرح کے تاثرات سے عاری تھا۔

'تم کیوں سمجھتے ہو کہ تم میرے بیٹے ہوتو میری اپنی ذات کی چمک ختم ہوگئی؟ایک انسانی جسم تمہارے پاس بھی ہے اور میرے پاس بھی۔اور اس انسانی جسم کا فاصلہ ۲۵ سال سے زیادہ کا نہیں ہے۔تم مجھ سے پچیس سال چھوٹے ہو بس......

'پچیس سال کم نہیں ہوتے۔'

'زیادہ بھی نہیں ہوتے—' میں نے مسکرانے کی کوشش کی—اس عمر میں تمہارے سلمان،عامر اور شاہ رخ فلموں میں کمر مٹکاتے اور رومانس کرتے نظر آتے ہیں۔'

پاشامرزا کے ہونٹوں پرمسکراہٹ آئی— آپ نہ شاہ رخ ہیں نہ سلمان۔'

'جانتا ہوں۔عامر خان بھی نہیں ہوں۔'

'اور آپ ان کی طرح فٹ بھی نہیں ہیں۔'

یہ بھی جانتا ہوں— کیونکہ ان کی زندگی فٹ نیس کے آگے پیچھے ہی گھومتی ہے۔'

'آپ ان سے جلتے ہیں؟'

'یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں،نہیں— کیونکہ میری زندگی میری اپنی ہے۔جیسی تمہاری زندگی تمہاری۔لیکن ابھی جن ہیروز کے نام تم نے لیے،ان کے بھی بیوی بچے ہیں۔گھر ہے۔خاندان ہے اور ذاتی زندگی سے الگ ان کے رومانس کی کہانیاں بھی ہیں۔'

'گاسپس۔'

''ممکن ہے۔لیکن تم بھی ان لڑکوں میں سے ایک ہو جو اس طرح کے گاسپس کے مزے لیتے ہیں۔'

'شاید۔'

'ایسا کوئی قصہ میری زندگی میں پیدا ہوتو؟'

اس بار پاشا کا لہجہ کڑوا تھا۔اس کی زبان لڑکھڑائی۔وہ صرف اتنا ہی بول سکا۔

'میں آپ کو بھی جانتا ہوں۔'

اس بار میرے چونکنے کی باری تھی...... 'کیا؟'

'کیا اتنا کہہ دینا کافی نہیں کہ میں آپ کو بھی جانتا ہوں— ' پاشا مرزا اس بار غصے سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اور یہی وہ لمحہ تھا۔ جب میری آنکھوں میں دھواں سا لہرایا تھا......

'تم کیا جانتے ہو۔ یا تم کیا کہنا چاہتے ہو؟' میرے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔

پاشا اس درمیان سنبھل چکا تھا۔ اس کا چہرہ ہر طرح کے جذبات سے عاری تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کے لہجے میں مجبوری کی تڑپ تھی۔

'آپ باپ ہیں۔ اس لیے آپ کو قبول کرنا ہی ہے۔ آپ کے جرم اور گناہوں کے ساتھ — '

اور اسی کے ساتھ وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

میں سناٹے میں تھا۔ پاشا کے لفظ دھماکے کر گئے تھے...... یادوں کی ریل چھک چھک کرتی ہوئی آنکھوں کے آگے سے گزر رہی تھی۔ مجھے اس رشتے میں محبت اور توازن بحال کرنا تھا۔ میں مطمئن تھا۔ اور طمانیت کے لیے یہ سوچنا کافی تھا کہ میں فرشتہ نہیں انسان ہوں۔ اس لیے مجھ سے بھی غلطیاں ہو سکتی ہیں۔ مگر مشکل یہ تھی کہ پاشا کیا جانتا ہے؟ یا پاشا نے کیا دیکھا ہے؟ وہ ایسا کیا ہے جس نے بیٹے کو باپ کے لیے ایک باغی بیٹے میں تبدیل کر دیا ہے۔

میری آنکھوں کے آگے کتنی ہی پرچھائیاں سمٹ آئی تھیں۔

میرے لیے اس اچانک کے مکالمے سے باہر نکلنا مشکل تھا۔ لیکن میں ان باپوں کی طرح نہیں تھا جو ایسی باتوں پر جذباتی بن کر بیٹھ جاتے ہوں، اور پھر دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیتے ہوں کہ وہ بیٹے کے لیے ایک ایماندار باپ میں خود کو تبدیل کر کے دکھائیں گے۔ میں ایسی ایمانداریوں کو پسند نہیں کرتا تھا اور میرے پاس ان باتوں کے لیے مناسب جواب بھی تھا کہ ہم انسان ہیں اور بار بار غلطی کرنے کے لیے مجبور بھی — بیوی اور بیٹے سے بے پناہ پیار کے باوجود بھی مجھ کو محبت کا نشہ تھا۔ اور میں ایسی کسی بھی محبت کو اپنے لیے جائز بھی سمجھتا تھا۔ میں پاشا کی طرح نہ سہی، لیکن خود کو ایک بھرپور جوان مرد کے طور پر ہی دیکھتا۔ جو جھلمل کرتی آنکھوں میں خواب سجا سکتا ہے — اڑ سکتا ہے — کسی کافی ہاؤس میں اپنی کسی نئی محبوبہ کے ساتھ کافی کی چسکیاں لے سکتا ہے۔ اور مجھے اس میں کوئی برائی بھی نظر نہیں آتی تھی۔

مگر اس وقت میرے لیے مشکل یہ تھی کہ میرے بیٹے نے کچھ نہ کچھ دیکھا ضرور ہے یا سنا ہے۔ مگر...... بیٹے نے کیا دیکھا تھا یا کیا سنا تھا؟۔ الجھنوں سے بھرے چہرے کے ساتھ میں آئینہ کے سامنے تھا۔

'تم پریشان ہو......؟'

'نہیں تو......'

'پریشان ہو......' عکس مسکرا رہا تھا۔

میں نے ہامی بھری — 'ہاں پریشان ہوں۔'

'اس لیے کہ بیٹے نے بغاوت کر دی ہے؟'

'نہیں۔ اس لیے کہ اس نے کچھ دیکھا ہے۔'

'اچھا مان لو اس نے کچھ دیکھا ہے۔ اور اس کا لہجہ بتاتا ہے کہ اس نے جو کچھ دیکھا ہے وہ اسے نہیں دیکھنا چاہیے تھا......'

'ہاں۔'

'اچھا۔ تمہارے بھی باپ تھے۔ مان لو، تم نے ابھی اپنے باپ کو ایسے ویسے کسی رنگ میں دیکھا ہوتا تو......؟'

'نہیں جانتا۔ لیکن باپ کے سامنے میری زبان نہیں کھلتی۔'

'اس لیے کہ باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تم بیٹے کی طرح مکالمہ ادا نہیں کر سکتے تھے—؟'

'ہاں۔'

' تو بیٹے کی تعریف کرتے ہو یا اس کے انداز سے غصہ ہو—؟'

'غصہ نہیں۔ اس عمر کے نوجوانوں کی خود اعتمادی اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولنے کی ادا سے متاثر ہوں۔ وہ خیال ہی نہیں کرتے کہ سامنے کون ہے۔ دوست یا ڈیڈ۔ وہ بیباک ہیں۔ جیسا سوچتے ہیں، منہ پر کہہ دیتے ہیں۔'

'لیکن تم...... یہ بیباکی تمہارے اندر نہیں ہے؟'

'ہاں۔'

مان لو۔ بیٹے نے اگر ایسا کچھ دیکھا ہے تو......؟ کیا تمہیں شرمندگی ہوگی؟'

'نہیں—' میرے پاس اس کا جواب تیار تھا— 'جسم ہے تو مانگ بھی ہوگی۔ بیٹا نئے زمانے میں جیتا ہوا ابھی ماڈرن نہیں ہے۔ ماڈرن ہونے کا مطلب صرف آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا نہیں ہے۔ یہ سمجھنا بھی ہے کہ جیسا جسم بیٹے کے پاس ہے، ویسا ہی جسم اس کے ماں باپ کے پاس بھی ہے۔ اور اس کے ماں باپ اتنے بوڑھے نہیں ہوئے کہ ان کے جسم کے پاس مانگیں نہ ہوں......'

باپ نے عکس کو اس بار لرزتے ہوئے محسوس کیا۔

'تمہاری مانگ تمہاری بیوی سے الگ بھی ہے؟'

'ممکن ہے۔'

'تو ایک مانگ تمہاری بیوی کے اندر بھی ہوسکتی ہے؟'

'ہونی چاہیے۔'

'اگر وہ اپنی مانگ کو لے کر باہر جاتی ہے تو......؟'

'یہ اس کی اپنی اخلاقیات ہوگی۔'

عکس ٹھہاکا مار کر ہنسا— 'اور تمہاری اخلاقیات......؟'

' میں خوبصورت تسلیوں سے اس اخلاقیات کو مطمئن کر دیتا ہوں۔ مثال کے لیے صرف مذہب ہے جو جسم کے تقاضوں کو آگے بڑھنے سے روک سکتا ہے۔'

'تو مذہب کو مانتے ہو نا......'

میری آواز میں لڑکھڑاہٹ تھی— 'ہاں بھی اور نہیں بھی۔'

'ایسا کیوں؟' عکس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

'مذہب مانتا ہوں۔ پیروی نہیں کرتا۔ جسم کی مانگوں کو مذہب سے الگ مانتا ہوں۔'

’مذہب میں جسم نہیں آتا......؟‘
’مذہب جسم میں کچھ زیادہ ہی دخل دیتا ہے—اور جسم کی اڑان ساری حدوں کو توڑتی ہوئی ہوتی ہے۔‘
’اسی لیے یہ اڑان تمہیں کمزور کر دیتی ہے۔‘
’ہاں۔‘
اور اسی لیے مانتے ہو کہ بیٹے نے کچھ دیکھا ہے......‘
’ہاں......‘
اور...... مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ تم کچھ باتیں چھپانے کی کوشش کر رہے ہو......‘
’شاید......‘ میرا لہجہ اس بار سہما ہوا تھا— ’بہت کچھ بدل چکا ہے۔ اس عمر میں میرے باپ ایک بوڑھے آدمی تھے۔ سماج سے خوفزدہ ،جیسا کہ اس وقت کے سارے باپ ہوتے تھے۔ جن کے پاس غلط اور ناجائز کی کوئی تعریف ہوتی ہی نہیں تھی۔ یا دوسرے لفظوں میں کہیں تو اس عمر میں وہ ایک بے حد شریف اور بزرگ مرد میں تبدیل ہو چکے ہوتے تھے، جن سے کسی کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا تھا— لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ اور کم از کم میں ایسا نہیں ہوں۔ میں ابھی آگے کے دس پندرہ برسوں تک خود کو بزرگ سمجھنے کی بھول نہیں کر سکتا......‘ میں نے کندھے اچکائے— ’ایک ماڈرن ماں اس عمر میں جینس اور ٹی شرٹ پہن کر اپنی بیٹی کے ساتھ چلتی ہے تو وہ اس کی بڑی بہن لگتی ہے۔ کل اس عمر میں ماؤں کے چہروں پر بزرگ جھریوں کے نقش و نگار پیدا ہو چکے ہوتے تھے......‘
’ہاں۔‘ عکس غور سے سن رہا تھا— آج مرد عورتیں دونوں ہی ہیلتھ کانشس ہیں۔ پھر جم ہے، یوگا ہے اور باہر کی دنیا ہے......‘
’اور اسی لیے اڑان ہے— میں اب مطمئن تھا— ’لیکن اس اڑان کو میں سمجھتا ہوں۔ بیٹا نہیں۔ بیٹا ماڈرن ہوتے ہوئے بھی اپنی ماں اور باپ کے لیے ماڈرن نہیں ہے......‘
’مثال کے لیے......‘
’مثال کے لیے......‘ باپ کہتے کہتے ہنسا...... زمانہ الٹا ہو گیا ہے۔ کل تک ہم بیٹے پر نگاہیں رکھتے تھے کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ کہاں جا رہا ہے۔ لیکن آج بیٹا باپ پر نگاہیں رکھتا ہے۔ مثال کے لیے کہ اس کا باپ کس سے باتیں کر رہا ہے۔ کہاں جا رہا ہے...... کس سے چیٹ کر رہا ہے۔ فیس بک پر کس سے باتیں ہو رہی ہیں۔ جبکہ ایک باپ مطمئن ہے کہ اس کا بیٹا اگر جوان ہے تو وہ کسی سے بھی اپنی رومانٹک باتیں شیر کر سکتا ہے۔ یہاں تک کہ پورن سائٹ بھی دیکھ سکتا ہے۔ آپ اس پر بندش لگائیں گے تو یہ کام وہ باہر جا کر یا چھپ کر کرے گا......‘
’ہونہہ۔‘ عکس نے گہرا سانس لیا— ’تو تم بیٹے سے ڈر رہے ہو۔......‘
’ہاں۔‘
کیونکہ بیٹا تم پر نظر رکھتا ہے۔‘
’شاید......‘
’اور اس کے باوجود تم چاہتے ہو کہ وہ تم سے پیار کرے۔‘
’ہاں۔ کیونکہ یہ زندگی میری ہے۔ اور میرے لیے یہ فلسفہ بہت ہے کہ خاندان کے علاوہ میری اپنی ایک نجی زندگی بھی ہے۔ اور اس زندگی میں مجھے ہنسنے مسکرانے اور رومانس کرنے کا اتنا ہی حق حاصل ہے جتنا بیٹے یا دوسروں کو حاصل ہے۔‘

میں مطمئن تھا۔ وہ اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ یہاں دیوار پر دو تین خوبصورت پینٹنگس کے درمیان ایک اس کی بھی تصویر تھی۔ بلیک اینڈ وہائٹ۔ کوئی پچیس سال پرانی۔ اس تصویر میں میرے چہرے پر پورے پورے بال ہیں۔ سفید شیشے کے فریم سے جھانکتی آنکھیں ہیں۔ مسکراتی ہوئی — اب ان آنکھوں کی مسکراہٹ کہیں کھوگئی لگتی ہے۔ مسکراتے ہوئے اس کے سفید موتی جیسے دانت بھی جھانک رہے ہیں۔ مجھے احساس ہے، میرے آگے کے دانت بہت جلد ٹوٹ گئے۔ اب نقلی دانتوں کے سہارے باتیں کرتے ہوئے مجھے بہت محتاط رہنا پڑتا ہے — پچیس برسوں میں زندگی کی موسیقی کہیں کھوگئی۔ اب یہ فیوزن کا وقت ہے۔ پچیس برس پہلے کا باپ ایک خوبصورت جوان مرد تھا۔ آج میرا بیٹا جوان ہو چکا ہے......

میں غور سے تصویر کو دیکھتا ہوں۔ مسکرانے، چہکنے کی کوشش میں بیٹے کے مکالمے راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

میں ہنسنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن اس بار مجھے میری ہنسی کہیں کھوگئی لگتی ہے۔

(۷)

شمشان گھاٹ سے لے کر کارنیوال تک جانے والی سڑک کا رنگ زعفرانی ہوگیا تھا۔ یہ سب راتوں رات ہوا تھا۔ سڑک پر سادھو سنتوں کی قطار بڑھ گئی تھی۔ کچھ دن قبل ایک 'مہا سبھا' میں لاکھوں عقیدت مند ٹرک میں بھر بھر کر لائے گئے تھے۔ سڑک چوراہوں سے گزرتے ہوئے یہ نعرے بھی لگائے گئے کہ ایک دھکا اور دو، جامع مسجد توڑ دو۔ پہلے ان لوگوں کو دیکھ کر خوف کا احساس نہیں ہوتا تھا مگر یہ بھیڑ اب خوف کا احساس دلانے لگی تھی۔ کالونی سے چار قدم آگے جانے والی سڑک کا نام شیر شاہ سوری روڈ تھا۔ اب راتوں رات اس کا نام بدل کر ودیا شنکر روڈ کر دیا گیا۔ کئی شہروں کے نام تبدیل کیے گئے تھے۔ بلکہ مخصوص اقلیت سے تعلق رکھنے والی نشانیوں کو آہستہ آہستہ مٹانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ پہلے یہ سب آہستہ آہستہ ہو رہا تھا۔ اب ان کاموں میں بہت تیزی آنے لگی تھی۔ سب سے خوفناک تھارات میں آسمان کا نظارہ کرنا۔ یہ وہم بھی ہوسکتا ہے۔ کیونکہ اداسیوں اور گھٹن سے گزرتے ہوئے آپ کی نظریں وہی دیکھنا چاہتی ہیں جو آپ کے اندر ہوتا ہے۔ آنکھوں پر بھی اختیار نہیں۔ کبھی کبھی یہ بھی محسوس ہوتا کہ ہم نے اپنی آنکھیں بی مشن کو دان کر دی ہیں اور بی مشن جو کچھ ہمیں دکھانا چاہتا ہے، وہی ہم دیکھ رہے ہیں۔ اشتعال انگیز بیانات میں شدت آگئی تھی۔ ایک حقیقت اور بھی ہے، ہر حال میں زندگی کے تمام رنگ اور کیفیات ہمارے شانہ بہ شانہ ہوتے ہیں۔ محبت، نفرت، سیکس، تشدد، خوف۔

بارش کے بعد کی صبح اداسی میں ڈوبی تھی۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ خفیہ افسر اپنی گاڑی کی صفائی کر رہا تھا۔ ناگارجن اخبار پڑھ رہے تھے۔ ان کے اطراف دو چار لوگ جمع تھے۔ میں دوبارہ ڈرائنگ روم میں واپس آیا تو پاشا مرزا کہیں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔

' کیا اب بھی تمہارا پیچھا کیا جا رہا ہے؟'

' ہاں۔' پاشا نے سرد مہری سے جواب دیا۔ کیا آپ مجھے بچالیں گے؟'

’ میں.....‘

’ آپ خود کو نہیں بچاسکتے، مجھے کیا بچائیں گے۔‘ پاشا مرزا کا لہجہ سرد تھا۔’یہ سب اسی طرح چلتا رہے گا۔آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔‘

موسم بدل گیا تھا۔بادلوں کے بڑے بڑے ٹکڑے جنگی طیارے کی طرح آسمان پر پھیل گئے تھے۔پاشا کے جانے کے بعد سبحان علی آیا۔سارہ چائے لے کر آئی۔کچھ دیر تک بیٹھی بھی رہی۔ماحول میں پسری ہوئی خاموشی کو دیکھ کر واپس لوٹ گئی۔

’ اب لگتا ہے، تقسیم ایک گناہ تھا۔‘ یہ سوال اب بار بار میرے ذہن میں پیدا ہونے لگا تھا۔

’یہ تمہارا اسامہ بن لادن برانڈ ہے، جو اسلام کو بازار میں لے آیا۔اب اسی برانڈ کو ہندو طالبانی رنگ دے کر تمہاری مارکیٹ میں لایا جارہا ہے تو فرار کے لیے تقسیم کو گنہگار مانتے ہو۔‘

’ ٹھیک کہتے ہو، تقسیم کو ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے۔بار بار تقسیم کی باتیں کرتے ہوئے ایسا لگتا ہے جیسے ہم جرموں پر پردہ ڈال رہے ہوں۔کچھ لوگوں نے مل کر پاکستان بنالیا۔کچھ لوگ یہاں رہ گئے۔پاکستان نے پوراز ور اسلامی پرچم پر دیا۔یہ پاکستان کا راشٹر واد تھا جس سے پاکستان نکل نہیں سکا۔ضیاء الحق کے وقت میں یہ اسلامی راشٹر واد واد کچھ زیادہ ہی خطرناک بن کر سامنے آیا۔لیکن جو بھی حکومتیں رہیں، اسلامی راشٹر واد کے سایہ میں رہیں۔آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد ہندوتو کا پورا نظریہ اسی راشٹر واد پر قائم رہا۔بی مشن راشٹر واد کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔اس لیے ان مذاہب کے ماننے والوں پر کوئی اثر نہیں پڑا جو ہندوتو راشٹر واد کے سایہ میں آگے بڑھے یا جنھوں نے ہندو مذہب کو اپنے جینے کا برانڈ سمجھ لیا۔سکھ، جین، بودھ اور کچھ عیسائیوں نے بھی ان کے طور طریقوں کو اپنایا۔اس لیے یہ لوگ بہت حد تک شدت پسندی اور رسہ کشی کے ماحول سے دور رہے۔اس کے باوجود ۱۹۸۴ ہوا، جب اندرا گاندھی کا قتل ہوا اور بڑی تعداد میں ہندوؤں نے سکھوں کا قتل عام کیا۔جبکہ سکھوں کا بڑا طبقہ ہندوؤں کے پرب تہوار اور ان کے ہر رنگ میں شامل تھا۔‘

’ مگر ان کے دیوی دیوتاؤں کو نہیں مانتا۔‘ سبحان علی بولے۔جین اور بدھ مذہب کے ماننے والوں کا اپنا عقیدہ ہے۔بی مشن صاف طور پر کہہ چکا ہے کہ مسلمان کنورٹیڈ ہیں اور ایک دن ان کی وطن واپسی ہو کر رہے گی۔ان کو مسلمانوں سے خطرہ نہیں ہے۔خطرہ اسلام سے ہے۔بی مشن کی شاخیں ایک لاکھ سے زیادہ ہیں اور اب ان کا دائرہ کینیا، تنزانیہ، یوگانڈا، ماریشش، جنوبی افریقہ اور دوسرے ممالک تک پھیل چکا ہے۔ان کی تنظیموں میں مسلمان بھی شامل ہیں۔یہ ہر شکل میں ہمارے سامنے ہیں۔کیا انہیں روکا جاسکتا ہے۔‘ سبحان علی غصے میں تھا۔آزادی کے بعد ہم ایک بیمار سیکولرزم کو معیار زندگی تسلیم کرتے رہے۔یہ سیکولرزم جوتے میں سے نکلی ہوئی کیل سے زیادہ نہیں ہے، جو اکثر ہمارے پاؤں کو زخمی کر دیتا ہے۔ہم اس بات کو سمجھ نہیں سکے کہ ہمارے سیکولرزم کے مساوی ایک اور بڑی لکیر اپنا کام کر رہی ہے اور زیادہ تیزی سے کام کر رہی ہے۔ہم جس قدر سیکولرزم کے نام پر چیختے ہیں، فاشسٹ طاقتیں اسی شدت کے ساتھ ایک ہو جاتی ہیں۔بالمیکی اور تلسی کے رام سے الگ انہوں نے ایک نئے رام کو مارکیٹ میں اتار دیا۔رام جنم بھومی کی کہانی آگے بڑھی تو رام ترشول اور تشدد کا حصہ بن گئے۔دنیا کی سب سے بڑی خفیہ تنظیم نے پاور، بازار، سیاست، میڈیا پر قبضہ کرلیا۔بزنس مین، انڈسٹریلسٹ اور کاروباریوں کو اپنے ساتھ کرلیا۔کوئی گوشہ ایسا نہیں بچا، جہاں ان کا قبضہ یا دبدبہ نہ ہو۔اب اصل جنگ راشٹر واد سے ہے۔اور اس راشٹر واد میں مسلمانوں کے قصے تاریخ اور نصاب کی کتابوں سے نکال دیے گئے۔۔شہروں کے نام تبدیل کر دیے گئے۔گلی کوچوں کے نام تبدیل کر دیے گئے۔پہلے یہ اکبر دی گریٹ پر بھروسہ کرتے تھے۔پھر یہ اکبر کے سیکولر کردار کے بھی خلاف ہو گئے۔نئے بھارت میں انہیں کوئی مسلمان نام نہیں چاہیے۔ایک

وقت آئے گا جب ہمارے بچوں کے لیے ہندوستان اجنبی ہو جائے گا۔؟'

میرا لہجہ کمزور تھا۔' مجھے خوف اس بات کا ہے۔ مستقبل کا بھارت نیا بھارت ہوگا۔اس میں ہماری نشانیاں نہیں ہوں گی۔خطرہ سمیرا اور پاشا مرزا کو ہے۔' میں ایک لمحہ کے لیے رُکا۔آج پاشا نے کہا، میں اس کی حفاظت نہیں کرسکتا۔صحیح کہا اس نے۔ایک باپ اپنے بیٹے کی فیس جمع نہیں کرسکتا تو حفاظت کیسے کرسکتا ہے۔'

' یہ جو فری لانسر ہوتے ہیں نا، سبحان علی نے ایک گندی سی گالی بکی۔سڑک کے کتے ہوتے ہیں۔ساری طاقت، سارہ روزگار، ہمارے ملک کی معاشیات سب بی مشن کے پاس ہے اور اسی لیے ہم جیسے فری لانسر رات کو آوارہ سڑکوں پر چلانے والے کتے بن گئے ہیں اور ان کتوں کے نصیب میں چوسی ہوئی ہڈی بھی نہیں ہے۔

◆◆

اس رات ایک غیر معمولی بات ہوئی۔نیم شب اچانک سارہ گھبرا کر اٹھی اور اس نے کمرے میں روشنی کردی۔بیڈ کے قریب ہی سنگھاردان تھا۔میں سارہ کو دیکھ رہا تھا۔وہ ادھر ادھر دیکھ رہی تھی اور خاصی پریشان نظر آ رہی تھی۔

' کیا تم نے کچھ سنا؟ '

' نہیں۔بالکل بھی نہیں۔ '

' کمرے میں کوئی ہے۔ '

' کہاں کوئی ہے۔' میں نے سارہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔تمہارا وہم ہے سارہ۔کہیں کوئی نہیں ہے۔

' کیا ابھی زلزلہ آیا تھا؟'

' نہیں تو۔'

' اگر زلزلہ کا جھٹکا نہیں تھا تو....' سارہ سنگار میز کی طرف دیکھ رہی تھی۔

' ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟'

' سنگھار میز ہل رہی تھی۔اور بار بار مجھے لگ رہا تھا، کمرے میں کوئی چور ہے جو سنگھار میز کے پیچھے چھپنے کی کوشش کر رہا ہے۔'

' سنگھار میز کے پیچھے جگہ ہی کتنی ہے کہ کوئی چھپنے کی کوشش کرے گا۔'

' میں نہیں جانتی.... لیکن میرا وہم نہیں ہے۔کوئی ضرور ہے..... آج کل عجیب عجیب حادثے ہو رہے ہیں۔گھر کے سامنے مندر بن گیا۔جامن کے درخت کے قریب پیپل کا درخت کھڑا ہو گیا۔تم تو اپنی میز اور لکھنے کی دنیا سے چپکے رہتے ہو۔کیا راتوں رات پیپل کا پیڑ پیدا ہو سکتا ہے۔؟ آج کچھ عورتیں پیپل کے پیڑ پر دھاگہ بھی باندھ رہی تھیں۔

' پیپل کا پیڑ؟'

' ہاں۔ وہ سامنے دیکھو۔جامن کی شاخیں جھک گئی ہیں اور پیپل کا درخت شان سے کھڑا ہے۔کچھ بھیانک ہو رہا ہے۔'

مجھے خود حیرت تھی کہ پیپل کا پیڑ کہاں سے آیا۔کیا کالونی کے لوگوں کو بھی اس درخت کے بارے میں معلوم ہے۔سامنے مندر بن گیا تھا اور وہاں دیواریں بھی اٹھنے لگی تھیں۔مندر سے بھجن کیرتن کی آواز بھی سنائی دینے لگی تھی۔یہ سب کیا تھا۔سیاست اچانک فنتاسی کی طرف مڑ گئی تھی۔واقعات اور حادثات کی رفتار اتنی تیز تھی کہ اب کوئی یہ کہتا کہ ایلین نے ہمارے ملک پر قبضہ کرلیا ہے تو مجھے کوئی حیرت نہیں ہوتی۔جو حادثے ہو رہے تھے وہ خلائی مخلوق کو دیکھنے سے زیادہ پراسرار تھے۔

سارہ کچھ پریشان تھی۔ کچھ دیر تک وہ خاموش رہی۔ پھر میری طرف دیکھا۔

' گھر کیسے چلے گا؟ کچھ نہ کچھ تو تمہیں کرنا پڑے گا نا۔ سنو، پاشا بہت پریشان ہے۔ اسے ہماری مالی حالات کا پتہ ہے۔ اسے پتہ ہے کہ تم بیکار ہو۔ میرے پاس جو زیورات تھے۔ تین برس قبل میں نے گھر چلانے کے لیے انہیں ایک جگہ گروی رکھا تھا۔ پیسے ادا نہیں کر پائی۔ زیورات ختم ہو گئے۔ چلے گئے۔'

اس کی آنکھوں میں کہیں بھی نمی نہیں تھی۔ اس وقت مجھے وہ دنیا کی پہلی خاتون نظر آ رہی تھی، جس کے پاس کوئی بھی قیمتی زیور نہیں تھا۔ اور اس نے گھر چلانے کے لیے اپنے تمام زیورات گروی رکھ دیے تھے۔ میرے سامنے اندھیرا تھا۔ میں نے سارہ کو غور سے دیکھا۔

' اب تمہارے پاس.....؟'

' وہ مسکرائی۔ کوئی بھی زیور نہیں۔ مگر مجھے زیورات کی ضرورت بھی نہیں۔'

' دنیا کی معمولی سے معمولی عورتیں بھی زیورات پر جان دیتی ہیں۔ تم فرشتہ ہو؟'

' تمہاری بیوی ہوں۔' سارہ مسکرائی۔ زیادہ مت سوچو۔ مگر کچھ کرنا ہوگا۔ میں بھی کسی جاب کی تلاش میں ہوں۔'

میری آنکھوں کے آگے اب بھی اندھیرا اترا ہوا تھا۔ میں آہستہ سے بولا....

'اپنی آئیڈیالوجی کو ختم کر دوں تو کچھ کام مل سکتا ہے۔'

' آئیڈیالوجی کے ساتھ ساری عمر گزار دی تم نے۔ کچھ اور سوچو۔ سارہ کا لہجہ اداسی سے پُر تھا۔ اس عمر میں پاشا کے چہرے پر گہری اداسی دیکھی نہیں جاتی۔ اس کا ڈپریشن وقت گزرنے کے ساتھ بڑھتا جا رہا ہے۔'

' وہ اپنی جگہ صحیح ہے۔' میری آواز کمزور تھی۔ اب احساس ہوتا ہے کہ لکھنا پڑھنا زندگی کے لیے ایک نقصان کا سودا تھا۔ میں نے کبھی پاشا مرزا کے مستقبل کے بارے میں سنجیدگی سے غور نہیں کیا۔ لوگ اپنے بچوں کے لیے کیا کیا نہیں کرتے۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ وہ ایک صابر بچہ ہے۔ اور تم ایک صابر بیوی....

' وہ دیکھو۔' سارہ نے کھڑکی سے اشارہ کیا تھا۔ چاندنی روشن تھی۔ باہر کے مناظر صاف صاف نظر آ رہے تھے۔ اس نے درختوں کی طرف دیکھنے کے لیے کہا۔ پھر زور سے ہنسی۔ پیپل کے پیڑ کی شاخوں میں جامن....کبھی ایسا نظارہ دیکھا ہے....؟'

' نہیں۔ مثال کے لیے رات کے سناٹے میں ہلتا ہوا سنگھاردان..'

سارہ اس بات پر زور سے ہنسی....لیکن اس کے چہرے پر ابھی بھی ہلتے ہوئے سنگھاردان کو لے کر خوف موجود تھا۔

(۸)

سنگھل کیفیٹریا۔ کناٹ پلیس سے کچھ ہی دوری پر یہ کیفیٹریا تھا۔ میں یہاں اکثر تارادیش پانڈے سے ملتا تھا۔ نقلی دانتوں کی وجہ سے مجھے بہت محتاط رہنا پڑتا تھا۔ اس کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ تارہ بعض اوقات بہت غور سے میرے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کرتی تھی۔ بڑھتی عمر کے باوجود اس میں ایک خاص طرح کی جنسی کشش موجود تھی۔ مجھے خیال ہے کہ وہ اکثر میرے سیاہ چشمے کے اندر بھی جھانکنے کی کوشش کرتی تھی۔ کیفیٹریا میں کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ ملک کے حالات کو لے کر تارادیش پانڈے بھی فکرمند تھی۔ اس نے امرتیہ سین، اروندھتی رائے جیسے دانشوروں کا بھی حوالہ دیا جو اب اس ملک میں رہنے کے خواہشمند نہیں تھے۔ اس نے بتایا کہ سو فیصد

میڈیا بی مشن والوں کے پاس ہے۔ اور ایک فیصد سے بھی کم ہیں جو آزادانہ طور پر اب مضبوطی کے ساتھ اپنی دلیل نہیں رکھ سکتے۔ ایس تمام لوگ اب خطرے میں ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ ہماری زندگی کے تمام شعبوں سے ۹۵ فیصد حصہ بی مشن والوں کے پاس ہے۔ فلم، سیاست اور اسپورٹس تک پر ان کا قبضہ ہے۔ اس لیے پُرسکون زندگی چاہیے تو ان کی آئیڈیالوجی کے ساتھ ہی چلنا مناسب ہے۔ ورنہ کوئی بھی پریشانی یا موت کے راستے آپ کے لیے کھل سکتے ہیں۔ آپ کی کوئی پرانی فائل کھولی جاسکتی ہے۔ کوئی مقدمہ آپ کو الجھن میں ڈال سکتا ہے۔ آپ زیادہ جوش میں آتے ہیں تو آپ کا قتل بھی کرایا جاسکتا ہے۔

' مجھے نوکری چاہیے۔' میں نے آگے بڑھ کر تارادیش پانڈے کی گرم ہتھیلیوں کو چھوا۔ اس نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ کچھ دیر تک سوچتی رہی۔ پھر بولی۔

' نوکری تو ہے۔ مگر تم کرو گے نہیں۔'

' کروں گا کیسے نہیں۔ مجھے ضرورت ہے۔ پیسے ڈھنگ کے ملیں تو کچھ بھی کرسکتا ہوں۔'

' کسی کا خون؟' تارادیش پانڈے زور سے ہنسی

' خون بھی کرسکتا ہوں۔ اس قدر ضرورت مند ہوں۔'

' اوہ۔'

' لیکن خون کرنے کے پیسے زیادہ لگیں گے' میں بھی ہنسا۔ مجھے پیسوں کی ضرورت ہے۔'

' ڈاکہ ڈالو گے؟'

' تمہارے ساتھ یہ بھی کرلوں گا۔'

' اس کا مطلب تم واقعی ضرورت مند ہو۔ خون کرو گے تو میں رہائی دلوادوں گی۔ میرے پاس کنٹیکٹ ہیں۔ وہ بھی بڑے سیاسی کنٹیکٹ۔ لیکن تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ کچھ دیر کے لیے تمہیں اپنی آئیڈیالوجی کو بھولنا ہوگا۔ بھول سکو گے؟'

' میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں۔ سارے راستے بند ہیں۔'

' یہ بات تمہیں پہلے سوچنی چاہیے تھی۔' تارا ہنسی۔ نوٹ بندی ہوئی، نقصان کس کا ہوا؟ سب سے زیادہ تمہارا۔ جی ایس ٹی لگی۔ تمہارے لوگ جی ایس ٹی جانتے ہی نہیں تھے۔ اب یہ غریب بنکر، رنگ ریز، گوشت بیچنے والے جی ایس ٹی کے جال میں کیوں پھنستے۔ تم روزگار سے الگ کردیے گئے۔ دیواریں زعفرانی ہوگئیں۔ دیگر سیاسی پارٹیوں کے پرچم کہیں نظر نہیں آتے۔' وہ ایک لمحہ کے لیے چپ ہوئی، پھر بولی۔

' وہ تم نے جارج آرویل کا ناول پڑھا ہے نا....۱۹۸۴۔ بی مشن از واچنگ یو۔ بی مشن کی نظر آپ پر ہے۔ وہ ہر جگہ ہیں۔ یہاں تک کہ آپ کے کمرے میں بھی....'

' ٹھہرو۔' مجھے اچانک پچھلی رات کا منظر یاد آیا۔ جب سارہ خوفزدہ ہوگئی تھی کہ اس کے کمرے میں کوئی ہے اور کوئی سنگھار میز کو زور زور سے ہلانے کی کوشش کررہا ہے۔۔'

' روکا کیوں؟'

' کچھ یاد آگیا۔ ہاں اب بولو تارہ۔'

' پورے ہندوستان کو غور سے دیکھو۔ کیا تم غور کررہے ہو کہ تم آہستہ آہستہ غائب کیے جارہے ہو۔ یہ سلسلہ بڑھتا جائے گا۔ بی

مشن کی شاخیں بڑھ رہی ہیں۔ وہ فوجی تربیت کے لیے اسکول کھول رہے ہیں۔ان کی دیش بھگتی کا سرٹی فکیٹ آپ کے لیے نہیں ہے۔

پھر آپ کو کیا کرنا ہوگا؟'

'مجھے نہیں معلوم۔'

'ان کے ہجوم میں شامل ہو جاؤ۔ جو زندگی ملی ہے۔سکون سے گزارو۔'

'کیا ان کے ہجوم میں شامل ہونے کے بعد؟'

'میرا ذاتی خیال ہے، تم کچھ دنوں کے لیے تو خطرے سے بچ جاؤ گے۔لیکن آگے نہیں کہا جا سکتا۔'

میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

'تم اس سے زیادہ کچھ کر بھی نہیں سکتے۔تمہارے پاس یہی ایک راستہ ہے۔اس لیے ضمیر نام کے پرندے کو مار ڈالو۔ یہ پرندہ صرف تمہیں پریشان کرے گا۔ تمہیں روزگار نہیں دے گا۔'

مجھے تارا کی باتوں میں سچائی کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد اپنا فیصلہ سنا دیا۔ مجھے منظور ہے۔

'ٹھیک ہے، میں فون کرتی ہوں۔'

تارا نے کسی راکیش وید نام کے آدمی کو فون کیا۔اس نے دو بجے کا وقت دیا۔ مجھے اس کے کناٹ پلیس والے آفس میں ملنا تھا۔ یہ آفس رنگ بلڈنگ کے دسویں فلور پر تھا۔

'چلتے ہوئے تارا نے کہا۔' آج تمہیں چھوڑ دیا۔اگلی بار نہیں چھوڑوں گی'۔اس کی آنکھوں میں جنسی ڈورے تیر رہے تھے۔

◆◆

رات فون پر یہ بات میں نے سبحان علی کو بتائی تو فون پر ہی زور سے چیخا۔

'پاگل ہو گئے ہو۔'

'راستہ کیا ہے سبحان علی۔'

'راستہ نہیں ہے، اس کا مطلب جان دو گے؟'

'جان دینا نہیں جان بچانا چاہتا ہوں۔'

'سنو جہانگیر مرزا۔تم دلدل میں پھنس جاؤ گے۔ جاب میرے پاس بھی نہیں ہے۔ مجھے یہ آفر ملا ہوتا تو میں کبھی قبول نہیں کرتا۔'

'میں تمہاری طرح بہادر نہیں سبحان علی۔اب لگتا ہے، ہم جس آئیڈیالوجی کے سہارے زندگی جیتے آئے ہیں، وہ پانی کے بلبلے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ایک دن زندگی جیت جاتی ہے اور آئیڈیالوجی کی موت ہو جاتی ہے۔'

'تم بزدل ہو۔' دوسری طرف سبحان علی نے فون پٹخ دیا۔ وہ خاصا ناراض نظر آ رہا تھا۔

سارہ میرے فیصلے سے خوش نہیں تھی۔ میں نے سارہ کو بتایا کہ پاشا مرزا کو یہ سب بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔اور ابھی تو میں ملنے جا رہا ہوں۔ کیا پتہ انہیں میرا کام پسند آئے یا نہیں۔

'انہیں ضرور پسند آئے گا' سارہ کا لہجہ کمزور تھا۔اس نے ایک نیا انکشاف کیا۔ کچھ گؤ شالوں کی گائیں پاگل ہو گئیں۔انہوں نے

زمین پر سر پٹخنا شروع کر دیا۔ پھر طاقت کے زور پر گئو شالوں سے بھاگ کھڑی ہوئیں۔'
' لیکن گائیں گئی کہاں۔'
' یہ بھی دلچسپ ہے۔ ایسی گایوں کو بڑی تعداد میں لکھنؤ سی ایم کی کوٹھی کے قریب دیکھا گیا۔ ان میں اکثر گائیں پاگل ہو چکی ہیں۔ مگر سی ایم کا فیصلہ ہے کہ گایوں کا محکمہ ان گایوں کی دیکھ بھال کرے گا۔ ملک میں کئی جگہوں سے گائیں بھاگ کر لکھنؤ میں اکٹھا ہو گئی ہیں۔ پیپل کے درخت پر جامن لگ سکتا ہے تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔'
اس رات دیر تک مجھے نیند نہیں آئی۔ نظریہ کی موت آسان نہیں ہوتی۔ مگر ایک وقت آتا ہے جب آپ کا برسوں سے پالا پوسا گیا نظریہ خود اپنی موت مر جاتا ہے۔ کھڑکی کے باہر اندھیری رات کا سایہ تھا۔ آج چاندنی کی روشنی نہیں تھی۔ باہر انگنت بدروحیں جمع تھیں، جو مجھے ہلتی ڈولتی شکل میں نظر آ رہی تھیں۔

(۹)

جس وقت سارہ باتھ روم سے کاکروچ کا نام لے کر چیخ رہی تھی، ٹھیک اسی وقت بجتی ہوئی کال بیل نے منہ کا ذائقہ خراب کر دیا۔ سارہ کو پریشانی تھی کہ باتھ روم میں کاکروچ کافی جمع ہو گئے ہیں۔ دروازے پر بھی ایک کاکروچ کھڑا تھا۔ مجھے اس آدمی کے حلیہ اور چہرے سے شدید نفرت تھی۔ یہ وہی خفیہ افسر تھا، جو اکثر آگ بھڑکانے اور مجھے جلی کٹی سنانے میں لگا رہتا تھا۔ وہ آرام سے اندر آ گیا اور ڈرائنگ روم کے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے بتایا کہ وہ جلدی میں ہے۔ اس لیے زیادہ وقت نہیں لے گا۔ اور اسے چائے بھی نہیں پینی اور کسی طرح کے تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ صوفے پر بیہودہ انداز میں اس نے اپنے پاؤں پھیلا دئے۔
' کچھ باتیں تم سے پوچھنی ہیں بس...؟ اس نے مجھے بھی سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
' پوچھیے۔'
' تمہارا بیٹا باغی تو نہیں۔'
' وہ ایک اسٹوڈنٹ ہے۔'
' اکثر مسلم نوجوان باغی ہوتے ہیں۔ پاکستان میں اس کا کوئی دوست تو نہیں؟'
' نہیں۔'
' چلو تم کہتے ہو تو مان لیتا ہوں۔ وہ کسی غلط ایکٹوٹی کا شکار تو نہیں۔'
' بالکل بھی نہیں'
خفیہ افسر نے منہ کو پھلایا۔' تمہارے یہاں سے اکثر دودھ جلنے کی مہک آتی ہے۔ بارود تو نہیں بناتے؟'
' مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ دودھ سے بارود بنایا جاتا ہے۔'
خفیہ افسر ہنسا۔' تمہیں سب معلوم ہے۔ اور تم لوگ کچھ بھی کر سکتے ہو۔ اچھا سنو۔' اس نے میری طرف چہرہ کیا۔' غور سے میری بات سنو۔ 1951 سے پہلے تم کہاں تھے؟'

میں نے مذاق میں اوپر کی طرف اشارہ کیا۔

وہ زور سے چونکا۔ 'یعنی پاکستان؟'

' کس نے کہہ دیا کہ اوپر پاکستان ہے؟'

خفیہ افسر ہنسا۔ اوپر اللہ میاں تو ہیں۔ اور اللہ میاں کا تعلق پاکستان سے ہے۔'

' میں 1951 میں پیدا نہیں ہوا تھا۔'

' 1971 میں کہاں تھے۔'

' اپنے وطن۔ اس وقت میری عمر زیادہ نہیں تھی۔'

' 1951 یا 1971، کیا تمہارے پاس شہری ہونے کے ثبوت ہیں۔'

' 1971 سے پہلے کے تو بالکل نہیں۔ یہ فلیٹ میں نے 2000 میں لیا۔'

خفیہ افسر زور سے ہنسا۔ 'اس کا مطلب 1951 یا 1971 میں سرحد پار سے گھس پیٹھ کر کے آئے تھے۔'

' گھس پیٹھ کیوں۔ ہمارے آباواجداد یہیں کے تھے۔'

' سب کہنے کی بات ہے۔ کاغذ دکھاؤ۔'

' میرے پاس اس فلیٹ کے کاغذات ہیں۔ یعنی 2000 کے۔'

' اور 1951 ....' وہ زور سے ہنسا۔ تمہیں بتانا پڑے گا کہ اس برس تم کہاں تھے۔'

' میں پیدا نہیں ہوا۔'

' پھر بھی ثابت کرنا پڑے گا۔ اور ثبوت لانا ہوگا۔'

' جب میں پیدا ہوا، اس وقت برتھ سرٹیفکیٹ بھی نہیں ملتے تھے۔'

' تمہارے باپ نے مانگا کیوں نہیں۔'

' ملتے ہی نہیں تھے۔ اس کی ضرورت نہیں تھی۔'

خفیہ افسر نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ اب یہ بات صاف ہو رہی ہے کہ دراصل تم لوگ سرحد پار سے آئے ہوئے گھس پیٹھیے ہو۔ کچھ آسام چلے گئے اور کچھ ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں پھیل گئے۔'

وہ ہنسا۔ بہتر ہے کہ تم لوگ ہندوستان خالی کر دو۔ نہیں کرو گے تو ہم تمہارے مکان جبراً خالی کرا دیں گے۔

بی مشن کے ذریعہ پہلے بھی بیان آ چکا تھا کہ این آر سی کو پورے ہندوستان میں نافذ کیا جائے گا۔ جب یہ معاملہ پارلیمنٹ میں آیا تو ایک بڑی سیاسی پارٹی نے مخالفت کی۔ پھر بی مشن کی طرف سے یہ بیان بھی آیا کہ جو اس ملک کا شہری ہے وہ اس ملک میں رہے گا اور جو شہری نہیں ہے، اسے یہ ملک چھوڑنا ہوگا۔ خفیہ افسر نے 1951 اور 1971 کا حوالہ دیا تھا۔ تقسیم کے بعد بہت سے مسلمان پاکستان چلے گئے۔ 1971 کی جنگ کے بعد بڑی تعداد میں سرحد پار سے آنے والوں کا سلسلہ شروع ہوا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ 1951 یا 1971 کے درمیان آنے والوں کے پاس شہریت کے نام پر کوئی کاغذ نہیں ہے۔ پہلا نشانہ آسام بنا۔ خفیہ افسر کی بات سے ظاہر تھا کہ اب اس کا نشانہ ہندوستان کے عام مسلمان بھی ہوں گے۔ خفیہ افسر کے جانے کے بعد میں بہت دیر تک صدمے میں ڈوبا رہا۔ ایک ایسے ہندوستان کی تصویر سامنے تھی، جہاں

اقلیتوں کی نئی نسل محفوظ نہیں تھی۔اوراس بات کا بھی احساس تھا کہ سب سے زیادہ شکار مسلمان ہوں گے۔

میں ایک بجے تیار ہوگیا۔باہر دھوپ کی شدت بڑھ گئی تھی۔موسم صاف تھا۔تارادیش پانڈے کا فون بھی آیا کہ جانے میں تاخیر نہ کرنا۔وہ لوگ وقت کے پابند ہیں۔ایک بجے میں گھر سے نکل گیا۔ہمیشہ کی طرح سڑک پر ٹریفک تھا۔کناٹ پلیس پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔میں نے گھڑی دیکھی۔ابھی زیادہ وقت نہیں ہوا تھا۔میرے پاس پورا آدھا گھنٹہ تھا۔اس آدھے گھنٹے میں، میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے ان لوگوں سے کیا کیا باتیں کرنی ہیں۔ایک بات اور بھی تھی کہ روزگار کے نام پر میرے پاس کوئی اور آپشن نہیں تھا۔اور دوسری بات یہ تھی کہ اگر یہ لوگ کام دیتے ہیں تو یہاں پیسے بھی ٹھیک ٹھاک ملیں گے۔میرا خیال ہے، میں محفوظ ہوں اور میں نے کوئی غلط فیصلہ نہیں کیا۔لیکن صبح اٹھتے ہوئے، میرا وہم بھی ہوسکتا ہے، میں نے محسوس کیا کہ میرا دایاں پاؤں، بائیں پاؤں سے کچھ بڑا ہوگیا ہے۔اور مجھے چلنے میں تکلیف ہورہی ہے۔

میں کچھ دیر تک کمرے میں یوں ہی خود کو گھسیٹ کر چلنے کی کوشش کرتا رہا اور اپنی کوشش میں کامیاب رہا۔مندر کے پاس ایک موچی کی دکان تھی۔اس دن اس کی دکان پر ضرورت سے زیادہ لوگ تھے۔جبکہ عام طور پر ایسا کم ہوتا ہے۔وہ ہمیشہ خالی ہی نظر آتا تھا اور اس کے پاس زیادہ کام بھی نہیں آتا تھا۔کناٹ پلیس جانے سے قبل مجھے اس بات کی تیاری کرنی تھی کہ میں ان لوگوں کو اپنے جواب سے مطمئن کرسکوں۔اور میں نے اس کی تیاری میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔پہلے مجھے احساس تھا کہ ضمیر ایک دیوہیکل پرندہ کی مانند ہے۔ ایسا ایک پرندہ ہزار سال قبل مڈغاسکر کے طول وعرض میں پایا جاتا تھا۔جس کے پر بھی تھے مگر وزن اس قدر زیادہ تھا کہ اس کے اڑنے میں پریشانی ہوتی تھی۔مجھے یقین تھا کہ ضمیر کا وزن بھی مڈغاسکر کے طول وعرض میں پائے جانے والے پرندے سے کم نہیں ہوگا۔میں نے ایسے ڈائناسورس کے قصے بھی سنے تھے جو معقول ہوا پانی نہ ملنے کی وجہ سے، ہماری دنیا سے غائب ہوتے چلے گئے۔اس وقت ضمیر غائب تھا۔اور ضمیر کی جگہ میرے دل کے آس پاس ہزاروں کی تعداد میں چلتی ہوئی سرخ چیونٹیوں کا گمان ہورہا تھا۔یہ چیونٹیاں دل کے نشیب وفراز میں چکر لگارہی تھیں اور یقینی طور پر اس وقت میں زور سے دھڑکتے ہوئے دل کی صدا سن سکتا تھا۔

کناٹ پلیس کے شور ہنگامے اور ٹریفک سے گزرتا ہوا اب میں بی مشن کمپنی کے دسویں فلور پر تھا۔میں نے گھڑی دیکھی۔ابھی بھی میرے پاس دس منٹ تھے۔اور اس دس منٹ میں مجھے یہ فیصلہ لینا تھا کہ وہ پرندہ میرے اندر زندہ ہے یا مرگیا ہے۔؟ مجھے اچانک احساس ہوا، میرے دل کی دھڑکن بہت حد تک رُک چکی ہے۔اس حد تک کہ زندہ سانسیں زندگی سے منہ موڑ کر مردہ جسم میں تبدیل ہوجاتی ہیں۔سانسوں کا سنگیت تھم گیا تھا۔دل کا دھڑکنا بند تھا۔اور ذہن نے کام کرنا بند کردیا تھا۔میں کم وبیش دس منٹ تک گہرے سناٹے کا حصہ رہا۔پھر میں نے آنکھیں کھولیں۔سامنے کے آہنی گیٹ کو دیکھا اور اندر داخل ہوگیا۔

ایک کافی کشادہ ہال تھا، جس میں الگ الگ کیبن بنے ہوئے تھے۔میرا قیاس تھا کہ دوسو سے زیادہ کارکن ہوں گے، جو اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔بی مشن کے تعلق سے دوایک تصویریں دیوار پر آویزاں تھیں۔زیادہ تر افراد کمپیوٹر یا لیپ ٹاپ پر کام کررہے تھے۔ہال میں داخل ہونے کے بعد ہی بائیں طرف ریسپشن پر ایک بوڑھا آدمی بیٹھا ہوا تھا جو چہرے سے انتہائی نیک اور شریف معلوم ہوتا تھا۔میں نے اسے اپنے بارے میں بتایا تو اس نے ایک لڑکے کو بلا کر مجھے ساتھ میں لے جانے کا اشارہ کیا۔لڑکا مجھے ساتھ لے کر ایک دروازے کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔کچھ دیر کے لیے اندر گیا پھر واپس آکر مجھے جانے کا اشارہ کیا۔راکیش ویدکو میں اس سے قبل بھی

ٹیلی ویژن کے مختلف چینلوں پر دیکھ چکا تھا۔ان کے ساتھ دولوگ اور بھی تھے۔خندہ پیشانی سے ملے۔مسکرائے۔ان کے سامنے ان کا لیپ ٹاپ کھلا ہوا تھا۔یہ تینوں انتہائی مہذب نظر آ رہے تھے۔

' تارا سے فون پر بات ہوگئی تھی'۔راکیش وید نے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔'ہمیں آپ کے بارے میں پوری معلومات ہے۔یہ دیکھیے۔'

اس نے لیپ ٹاپ کا اسکرین میرے سامنے کیا۔اسکرین پر میری، سارہ کی اور میرے بیٹے پاشا مرزا کی تصویریں تھیں۔

میرے اندر مڈغاسکر کے طول وعرض میں پائے جانے والے پرندے نے دوبارہ سر نکالا۔میں کہہ سکتا ہوں کہ اس لمحے میں بری طرح خوفزدہ ہوگیا تھا۔مجھے پاشا مرزا کی بات یاد آ رہی تھی۔کوئی میرا پیچھا کرتا ہے۔پھر اس رات سارہ نے کہا تھا، کوئی کمرے میں موجود ہے۔یہی بات سبحان علی نے کہی تھی۔میں نے محسوس کیا، راکیش وید غور سے میرا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ان کے ساتھ جو لوگ تھے ان سے تعارف نہیں ہوا تھا۔راکیش وید نے بس اتنا بتایا کہ یہ دونوں بھی بی مشن کے لیے کام کرتے ہیں۔میں نے اپنا بایوڈاٹا آگے کرنا چاہا تو راکیش نے روک دیا۔

' نہیں۔اس کی ضرورت نہیں۔آپ اور آپ کی فیملی کے بارے میں ہمارے پاس ہر طرح کی انفارمیشن ہے۔'وہ مسکرایا۔آپ کا بینک بیلنس بھی۔آپ کہاں کہاں ڈیفالٹر ہوئے۔آپ جو کچھ لکھتے رہے ہیں، وہ سب ہمارے سامنے ہے۔دیکھیے اس کیبن میں اردو کا بھی ایک محکمہ ہے۔اور ہماری بیس ہزار سے زیادہ شاخوں میں اردو میں کام کرنے والے لوگ ہیں۔آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہم اردو جاننے والوں کو بھی روزگار دے رہے ہیں۔لیکن آپ لوگ ہمیں نہیں سمجھتے۔ابھی کچھ دن قبل میں چین گیا تھا۔میں چین کے طلبا سے ملا۔ان سے سیاست کے بارے میں گفتگو کرنا چاہی۔مگر طلبا سیاست پر گفتگو کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔میں نے یہ بات شدت سے محسوس کی کہ چین کا نوجوان کیریر اور مستقبل پر باتیں کر سکتا ہے مگر سیاست کو نظر انداز کرتا ہے۔آپ کیوں نہیں کرتے؟ آسان زندگی کی جگہ مشکل زندگی کا انتخاب کیوں کرتے ہیں۔'

' یہ ہماری بدقسمتی ہے۔'میرا لہجہ کمزور تھا۔راکیش وید کے ساتھ جو دولوگ تھے، وہ بھی غور سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔میں اس سے زیادہ کچھ بولنے کے حق میں نہیں تھا۔

راکیش وید مسکرائے۔ ' دراصل نقصان ہمارا نہیں ہوا۔نقصان میں آپ رہے۔جو آپ لوگ لکھ رہے تھے، ہمیں اس سے فائدہ ہو رہا تھا، ہم یہی چاہتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ ہمیں برا کہا جائے۔زیادہ سے زیادہ ہماری مخالفت کی جائے۔مخالفت سے ہی تنظیم کو مدد ملے گی۔مخالفت سے ہی ہم بکھرے ہوئے، ایک ہوں گے۔یہ اتنا آسان تھا جیسے آگے بڑھ کر کھڑکی کھولنا۔لیکن آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد بھی بہت دنوں تک ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ اکثریت کو ایک سانچے میں کیسے ڈھالا جا سکتا ہے؟ آپ کی نفرت، آپ کی مخالفت نے ہمارے راستے کو آسان کیا اور آپ کے کچھ لیڈروں نے، جن کے اشتعال انگیز بیانات نے بہت حد تک ہمیں ایک مضبوط کڑی میں جوڑ دیا۔پاور اور سیاست کا یہ نیا راستہ تھا، جو بہت دنوں بعد بلکہ برسوں کی ریاضت اور مشقت کے بعد ہم نے تیار کیا تھا۔اور ہمیں کامیابی ملتی چلی گئی۔

' درست کہا آپ نے۔' میں نے مختصراً اپنی بات رکھی۔آزادی کے بعد سیاسی پارٹیاں مسلمان مسلمان چلاتی رہیں اور بھول گئیں کہ یہ لفظ خاموشی سے اپنا کام کر رہا ہے۔ایک دن یہ مسلمان نام دھماکہ کر سکتا ہے۔'

راکیش وید مسکرائے۔ہمیں تاریخ سے بہت کچھ ہٹانا تھا۔سیکولر وادیوں کے نام۔ساجھا تہذیب کی تاریخ۔بڑے سرمایہ کی

ضرورت تھی۔ وقت کے ساتھ ایک نیا نظام سامنے تھا۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی سے لے کر مارکیٹ اسٹریٹجی تک، ہم اسی راستے پر چلے، جس راستے پر نازی چلے تھے۔' وہ مسکرایا۔ 'ہٹلر کے زمانے میں انفارمیشن ٹکنالوجی کا استعمال یہودیوں کے لیے کیا گیا۔ ایک طرفہ نسلی جنگ میں نازی پارٹی اکیلی رہی اور فتح یاب ہوتی رہی۔ سب اتنی خاموشی سے ہوا کہ ایک دنیا حیران رہ گئی۔'

' جی۔' میں ایکدم سے گھبرا گیا۔

راکیش کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ آپ کو جو چاہیے ملے گا، لیکن آپ کو ہمارے لیے کام کرنا پڑے گا۔ اور آپ ہمیں چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔'

میں کشمکش میں تھا۔ راکیش وید جس راستے کو آسان کہہ رہے تھے، وہ راستہ کسی بھی قیمت پر اپنانے کے لیے میں تیار نہیں تھا۔ میں زندگی بھر ایک آئیڈیالوجی کے لیے دھکے کھاتا رہا۔ یہ حقیقت ہے کہ اس آئیڈیالوجی سے مجھے حاصل کچھ نہیں ہوا۔ اور زندگی بھر جس آئیڈیالوجی کی مخالفت کرتا رہا، اس کا حصہ کیسے بن سکتا ہوں۔ ڈائناسور کے چنگھاڑنے کی آواز سنی۔ قلب کے ارد گرد ان گنت چیونٹیوں کے چلنے، رینگنے کا احساس ہوا۔ دماغ سرد اور بے جان۔ میں ایک چھوٹی سی نفرت کے دائرے میں تھا۔ ماضی اور مستقبل ایک فریب ہے۔ حال کی پتھریلی سڑکوں پر چلنا سیکھنا ہی زندگی ہے۔ کوئی مجھ سے کہہ رہا تھا، تمہارے گھر کی دیواروں پر اداسیوں کے چمگادڑ الٹا لٹکے ہوئے ہیں۔ جا بجا وحشتوں کے جالے ہیں، مکڑیوں کی طرح۔

تمہارے پاس پاشا مرزا کو دینے کے لیے بھی کچھ نہیں۔ سارہ کے پاس گہنے نہیں۔ آئیڈیالوجی بھی چھلاوہ ہے۔ ایسا نہیں ہوتا تو سیاست بھیس بدل کر ایک پارٹی سے دوسری پارٹی میں منتقل نہیں ہوتی۔ ایسے بہت سے لیڈر آنکھوں کے آگے گھوم گئے اور ایسے ادیب بھی جو وقت کے ساتھ حال کی پتھریلی سڑکوں پر چلنا سیکھ گئے تھے۔ میں بھی ان میں سے ایک ہوں۔ میں نے راکیش وید کی بات مان لی تو جیسا کہ وہ کہہ رہے ہیں، مجھے وہ سب کچھ مل جائے گا، جو مجھے چاہیے۔ اس وقت داستان امیر حمزہ کا مشہور کردار عمرو عیار میرے سامنے تھا۔ وہ کاغذ کے تیر کمان سنبھالے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ میرے جسم میں ہزاروں سوراخ ہو چکے ہیں۔ میرا جسم چھلنی ہے۔

' کیا سوچنے لگے؟' راکیش وید میری طرف دیکھ رہے تھے۔ مجھے آپ جیسوں کی ضرورت ہے۔ آپ بلندی پر ہوں گے۔ آپ کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ہوگی۔ سوچ لیجیے۔'

حقیقت میں، میں کیا سوچ رہا تھا؟ میں اس وقت مشہور ناول نگار سروانٹس کا Don Quixote تھا۔ جو پاگل ہے۔ مطالعہ نے اس کو دماغی مریض بنا دیا ہے۔ وہ خواب دیکھتا ہے۔ اپنی حدود سے جنگ لڑتا ہے۔ اور کئی مقام پر ڈان کوئزوٹ، سروانٹس کے کردار میں نظر آتا ہے۔ ایک ہسپانوی فوجی جسے جیل بھی بھیجا جاتا ہے۔ جب اس کے قریبی دوست ان کی لائبریری میں موجود کتابوں کی تفتیش کرتے ہیں تو وہاں زیادہ تر شیطانی کتابیں نظر آتی ہیں۔ میں کردار بھی تھا اور مصنف بھی۔ میں اس وقت نیم وحشی تھا اور مجھ پر رقت طاری تھی۔ زندگی کا ایک طویل عرصہ جدوجہد میں گزرا تھا۔ میں اس کیفیت کا مارا تھا جہاں مجھ سے کوئی بھی خوش نہیں تھا۔ میرے لیے ایک موقع تھا جب میں ممبر شپ لے کر اپنی زندگی سنوار سکتا تھا۔ میں ایسے بہت سے مشہور لوگوں سے واقف تھا جنہوں نے بی مشن کی ممبر شپ لی اور راتوں رات زندگی کے انداز بدل گئے۔

راکیش وید ہنسے۔ 'بہت آسان کام کبھی کبھی مشکل لگتا ہے۔ آدرش وادیوں کے ساتھ یہی مجبوری ہے۔ وہ دوناؤ پر سوار رہتے ہیں،

چاہتے سب کچھ ہیں اور اپنا دائرہ توڑنا بھی نہیں چاہتے۔'

راکیش کا کہنا بہت حد تک صحیح تھا۔ اب مجھے ایسے بہت سے لوگ یاد آرہے تھے جن کے قلم کی دھارا چانک تبدیل ہوگئی تھی۔

' ایک دوسرا آفر بھی ہے۔' راکیش وید نے میری طرف دیکھا۔ اپنا قلم مجھے دے دیجیے۔'

' مطلب۔'

' آپ ہمارے لیے لکھیے۔ مگر اپنے نام سے۔'

مجھے سرونٹس یاد آئے جن کے گھر سے شیطانی کتابیں ملی تھیں اور ان کتابوں کو جلا دیا گیا تھا۔ ڈان کوئکزوٹ کا کردار ایک بار پھر سامنے تھا۔ میں اس وقت ایک مسخرہ تھا۔ ایک جوکر۔ جسے زندگی کی خوشیاں بھی چاہیے تھیں اور جو خوشیوں سے دور بھی بھاگ رہا تھا۔ جو کرنا تھا، وہ بہت زیادہ مشکل نہیں تھا۔ مجھے مدغاسکر والے پرندے کو اندر مار ڈالنا تھا۔ لیکن کیا یہ آسان تھا۔ اب مجھے پاشا مرزا کے ساتھ کیے گئے مکالمے یاد آرہے تھے۔ کیا سچ مچ میری کوئی اڑان ہے۔؟ میں اڑنا چاہتا ہوں تو مجھے آفر منظور کر لینا چاہیے۔ کیا میں اسی اڑان کے لیے زندہ تھا۔؟

میرے اندر سے ایک چھوٹا سا پرندہ نکلا اور اڑتا ہوا راکیش وید کی پشت پر رکھی المیرا پر بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا، پرندہ ہنس بھی رہا تھا اور پھڑ پھڑا بھی رہا تھا۔ راکیش وید کے ساتھ کرسیوں پر بیٹھے دونوں افراد بھی بغور میرے چہرے کا مطالعہ کر رہے تھے۔ اس بار ان میں سے ایک نے آہستہ سے کہا۔' نئے بھارت کے ساتھ چلیے۔ آپ کو آسانی ہوگی۔'

دوسرے کا لہجہ سخت تھا۔ آنے والے وقت میں آپ کے پاس یہ آسانیاں بھی نہیں ہوں گی۔ اچھا آفر ہے۔ آپ کو منظور کر لینا چاہیے۔'

میں ابھی تک اندھیرے سے باہر نہیں نکلا تھا۔ اسی درمیان راکیش وید کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے موبائل اٹھایا۔ آہستہ سے کچھ بولا۔ مجھے صرف او کے سنائی دیا۔ فون رکھنے کے بعد اس نے کہا۔ تارا کا فون تھا۔ ایک تیسرا آفر بھی ہمارے پاس۔ اور یہ آخری آفر ہے۔'

اس بار اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب تھی۔ اس نے غور سے میری طرف دیکھا اور کہا۔ یہاں آٹھ مدرسوں کے بچے کام کرتے ہیں۔ آپ ان کی قیادت کیجیے۔ یہ زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ کل سے آجائیے۔'

' جی بہتر۔'

میں کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے پاؤں ابھی بھی کانپ رہے تھے۔ اور مجھے یقین تھا کہ اس وقت مجھ پر وہی حملہ ہوا تھا جو صبح اٹھنے کے وقت ہوا تھا۔ میرا دایاں پاؤں اچانک بڑا ہو گیا تھا۔ اور مجھے چلنے میں تکلیف ہو رہی تھی۔ میں باہر نکلتے ہوئے لڑکھڑا رہا تھا۔ یہاں تک کہ گیٹ تک پہنچنے میں بھی مجھے خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ گیٹ تک پہنچتے ہوئے میں ایک نام سن کر زور سے چونکا تھا۔ پاس والے کیبن سے کچھ لوگ کسی جادوگر کا تذکرہ کر رہے تھے۔ جادوگر۔ لفٹ سے نیچے آنے تک میں جادوگر کے نام میں الجھا رہا۔ نیچے آکر میں نے دوبارہ عمارت کی طرف دیکھا۔ کل سے مجھے اس عمارت میں آنا ہے۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ چلتے ہوئے میں نے تارہ کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے مجھے کیفیٹریا آنے کو کہا۔

آٹو والے کی طرف بڑھتے ہوئے میں تین بار رکا۔ کچھ لوگ زور زور سے جادوگر کا نام لے رہے تھے۔ آٹو میں بیٹھنے کے بعد آٹو والے نے بھی میری طرف مڑ کر دیکھا۔ 'جادوگر سے ملے ہیں آپ؟'

میں اس کی بات سن کر حیران ہوا۔

' نہیں۔'

' پھر تو آپ کو ملنا چاہیے۔ عام زندگی میں بھی کمال ہو رہے ہیں۔ اس نے ہنس کر آٹو چلانا شروع کیا۔ ہوا تیز تھی۔ اس لیے اس کے مکالمے کبھی کبھی تیز ہوا میں کھو جاتے تھے۔ سگنل پر آٹو رکا تو اس نے ہنستے ہوئے بتایا۔ کل اچانک کچھ دیر کے لیے میرا آٹو غائب ہو گیا۔'

' غائب ہو گیا مطلب۔'

وہ زور سے ہنسا۔ 'سچی۔ بالکل بھی جھوٹ نہیں۔ آٹو کی جگہ ایک گدھا کھڑا تھا۔ ڈھینچوں ڈھینچوں کی آواز نکال رہا تھا۔ میں نے چھو کر بھی دیکھا۔ گدھے کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ مگر گدھا تو گدھا ہی ہوتا ہے۔ میں ابھی پریشان ہو ہی رہا تھا کہ گدھا غائب ہو گیا۔ اور گدھے کی جگہ دوبارہ آٹو آ گیا۔ سب اس جادوگر کا کمال ہے۔'

' ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔؟'

' ایسا ہو رہا ہے بابو۔ کسی سے پوچھیے۔' اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ 'دیس بدل رہا ہے۔'

کیفیٹریا آ گیا تھا۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بھی میں نے محسوس کیا، کچھ لوگ جادوگر کی بات کر رہے تھے۔ میں کچھ دیر کے لیے رُک گیا۔ سگریٹ سلگا کر ان کی باتیں سننے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ ایک بزرگ آدمی تھا۔۔ اس وقت پانچ چھ لوگوں سے گھرا ہوا تھا۔ اس نے زعفرانی کرتا پائجامہ پہن رکھا تھا۔ پیشانی پر سرخ ٹیکہ بھی تھا۔ وہ پہلے زور زور سے ہنسا پھر کہنے لگا۔ 'کل تو کمال ہو گیا۔'

' کسی نے پوچھا، کیسا کمال؟'

' رات کے وقت جب میری بوڑھی بیوی کمرے میں داخل ہوئی تو اچانک اس کا چہرہ اور رنگ بدل گیا۔ قسم سے۔ وہ تیس سال پہلے والی عمر میں پہنچ گئی تھی۔ اس کی جھرّیاں غائب تھیں۔ چہرہ شاداب۔ اور اس کے لباس کے انداز بھی بدل گئے تھے۔ وہ اکثر ساڑی پہنتی ہے۔ میں یہ دیکھ کر چونک گیا کہ وہ جینس اور ٹی شرٹ میں تھی۔ اس نے میری طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کچھ شرارتی اداؤں کے ساتھ پوچھا، ایسے کیا دیکھ رہے ہو.....'

' یہ تم....'

' وہ مسکرائی۔ قسم سے اس مسکراہٹ کو دیکھتے ہوئے تیس سال گزر گئے تھے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ دیس بدل رہا ہے۔ سب جادوگر کا کمال ہے۔ مگر وہ ہے....' بزرگ کی ہنسی غائب تھی۔ 'صبح اٹھا تو پرانی بیوی واپس آ چکی تھی۔'

مجھے بزرگ کی بات سن کر ہنسی آ رہی تھی۔ لیکن یقین نہ کرنے جیسی کوئی بات نہیں تھی۔ کچھ بہت تیزی سے بدل رہا ہے۔، یہ بات میری طرح بہت سے لوگ محسوس کر رہے تھے۔

کیفیٹریا میں تارا دیش پانڈے مجھ سے پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے موبائل کی طرف دیکھا۔ وقت کا اندازہ کررہی ہوگی، یہ میرا قیاس ہے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ غصے میں چلائی۔

'راکیش کا فون آیا تھا۔تمہارا دماغ خراب ہے۔'

'میں مجبور تھا۔'میں سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

'مجبور؟تم کہاں سے کہاں پہنچ جاتے۔ یہ اب تک کی شہرت کو کیش کرنے کا وقت تھا اور تم نے ایک معمولی سی نوکری قبول کرلی۔'

تارا دیش پانڈے نے کافی اور سینڈوچ کا آرڈر دیا۔اس کا موڈ خراب تھا۔ وہ آسمانی سوٹ میں تھی۔ چہرہ چمک رہا تھا۔ ہونٹ سرخ تھے اور ناراضی کے باوجود مجھے اس کے وجود میں ایک خاص طرح کی کشش کا احساس ہورہا تھا۔میز پر کافی اور سینڈوچ کی پلیٹ رکھنے کے بعد ویٹر چلا گیا۔تارا دیش پانڈے بہت غصے میں تھی۔

'ارے جانتے ہو۔ میں نے تمہاری کتنی سفارش کی تھی۔ راتوں رات تمہاری دنیا بدل جاتی ۔تم کسی بڑے ادارے کے ڈائرکٹر ہوجاتے۔سب کچھ تمہاری مرضی سے ہوتا۔کتنا جانتے ہو۔آج کے انڈیا کو کس صدی میں جی رہے ہو۔کیا تمہیں لگتا ہے بی مشن سے نجات حاصل کرسکو گے؟ یہ لوگ ہر جگہ ہیں۔ جہاں خالی جگہ ہے وہاں بھی۔ جہاں خلا ہے وہاں بھی۔ یہ نظر بھی آرہے ہیں اور ان وزیبل بھی ہیں۔ یہ تم پر نظر رکھتے ہیں۔تمہاری ہر حرکت پر۔کب تک بھاگو گے۔کب تک اپنی مرضی سے جیو گے۔اب اپنی مرضی سے جینے کا تمہارا وقت چلا گیا۔اس بات کو نہیں سمجھا ہے تو سمجھنے کی کوشش کرو۔ابھی برسوں تک تمہیں ان کے نظریے کے ساتھ ہی چلنا ہے۔وہ تمہیں زندگی دے رہے تھے اور تم نے.....'تارا دیش پانڈے کو غصہ تھا۔کتنے دن تک یہ آئیڈیالوجی چاٹو گے...'

میں نے آہستہ سے کہا۔'تارا، وہ ہماری شناخت خرید رہے ہیں۔ پھر ہم بے شناخت ہوجائیں گے۔اس کا مطلب سمجھتی ہو۔یعنی جسم تو میرا ہے مگر جسم کے اندر جو روح ہے وہ میری نہیں۔ پاؤں میرے ہیں مگر چلنا مجھے اپنی مرضی سے نہیں ہے۔ ہاتھ میرے ہیں مگر مجھے وہی کرنا ہے جو وہ چاہتے ہیں۔زبان اور ذائقہ پر بھی ان کی مہر ہے۔'

'تو...؟'، تارا دیش پانڈے کے ہونٹوں پر غصہ تھا۔روح کا کیا کروگے؟ جسم کے بارے میں سوچو۔جسم کو زندہ اور تروتازہ رکھو میرے لئے۔کشمیری سیب دیکھا ہے؟ مجھے اسی طرح کی تازگی چاہیے۔'

اس نے غور سے میری طرف دیکھا۔ میں نقلی دانتوں کو لے کر اب بھی محتاط تھا۔تارا کی گہری آنکھیں سیاہ گلاس کے پار اترنے کی کوشش کررہی تھیں۔

'تم نے ایک بڑا موقع کھودیا۔تم ایک بیوقوف نکلے۔'وہ زور سے ہنسی۔ایک دن جادوگر تمہیں کھا جائے گا۔'

'جادوگر'،اس بار میں زور سے چونکا۔آج یہ نام کئی بار سننے میں آیا اور اب تارا دیش پانڈے بھی جادوگر کا ذکر کررہی تھی۔

''سب جادو ہے۔ مایانگری۔اور تم وہی ہو بھلے مانس۔ پرانی دنیا سے چپکے ہوئے۔ راتوں رات نوٹ بدل گئے۔حوالہ کی گاڑیاں گھومنے لگیں۔قیدی جیل سے باہر آکر اچھے انسان بن گئے۔اچھے انسان جیلوں میں بھیج دیے گئے۔ناسا مریخ پر خلائی طیارہ بھیج رہا ہے اور اوناؤ نگر میں دلتوں کو زندہ جلایا جارہا ہے۔جادو۔سب جادو۔خود کو دیکھو۔سیکس کی باتیں کرنے والا کیریر کی باتیں کررہا ہے۔میرے چہرے اور جسم کی خوبصورتی کی باتیں کرنے والا مجھے بھول کر ایک معمولی سی نوکری میں الجھا ہوا ہے۔جادو....سب جادو۔نیا بھارت ایک جادو ہے۔راکیش وید، یہ سب میرے بھی دوست ہیں۔میں ان سے مذاق کرتی ہوں کہ ایک دن کب انڈیا کو اٹھا کر مریخ پر لے جاؤ گے۔لے جاؤ گے تب بھی حیرت نہیں ہوگی۔'

تارا کے چہرے پر رونق بحال ہو چکی تھی۔ کیفیٹر یا میں آنے جانے والوں کا سلسلہ جاری تھا۔ کچھ دیر بعد ہم دونوں بھی اپنی اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ سیڑھیوں سے نیچے آ کر تارا نے میرے ہاتھ کو تھام لیا۔ اس کے چہرے پر شرارت تھی۔

' جاب جوائن کر لو۔ پھر ملتے ہیں، مگر۔'

' مگر کیا؟'

سیاست کی کوئی بات نہیں ہوگی۔ بہت دنوں سے سمندر میں ڈبکیاں نہیں لگائیں۔' وہ ہنس رہی تھی۔' اب ملو گے تو سمندر کا دیدار کریں گے۔'

وہ ہنس رہی تھی۔

تارا کے جانے کے بعد میں اکیلا تھا۔ کچھ دیر تک سڑک کنارے یوں ہی خاموشی سے کھڑا رہا۔ آس پاس دور تک دکانیں سجی ہوئی تھیں۔ سڑک پر ٹریفک کے شور تھے۔ اس وقت میں ایک نیا آدمی تھا۔ ایک ایسا نیا آدمی جس سے میں خود بھی واقف نہیں تھا۔ میں نے اپنا جائزہ لیا۔ پانچ فٹ آٹھ انچ۔ میں کھڑا تھا مگر یوں لگ رہا تھا جیسے میرے گھٹنے مڑ گئے ہوں اور میرا سر میرے گھٹنے کے درمیان ہو۔ ٹنڈ ٹنڈ ہاتھ ایک دوسرے سے جڑ گئے تھے۔ میں اس کرہ ارض پر ایک ایسا نایاب پرندہ تھا، جسے دیکھنے والوں کا ہجوم تالیاں مار کر ہنس رہا تھا۔ مجھے دھوپ سرخ نظر آ رہی تھی جیسے ابھی اس کی شعاعیں انسانی خون پی کر شہر پر سایہ کر رہی ہوں۔ جادوگر....... یہ نام خاموشی سے میرے ہونٹوں پر آیا اور اس لمحہ کیفیت یہ تھی کہ میں کانپ رہا تھا۔ اب مجھے گھر جانا تھا۔ دو ایک آٹو والوں کو میں نے آواز دی۔ ہاتھ کا اشارہ کیا۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ میرے ٹنڈ ٹنڈ ہاتھ ابھی بھی میرے گھٹنوں میں سمائے ہوئے ہیں۔ اور میرے منہ سے آواز کی جگہ گھڑ گھڑانے کا شور پیدا ہو رہا ہے۔ کچھ دیر بعد ایک آٹو والا رک گیا۔ جسم کو سنبھالتے ہوئے میں آٹو میں بیٹھ ضرور گیا مگر اس وقت ساری دنیا مجھے گھومتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

(۱۱)

سبحان علی کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی، تم جیت کر نہیں، ہار کر آ رہے ہو۔ اپنے کمرے میں داخل ہونے تک میں ایسے نایاب پرندے میں منتقل تھا، جس کے دونوں گھٹنے آپس میں مڑ گئے تھے اور سر گھٹنوں کے درمیان تھا۔ ٹھنڈ ٹھنڈ دونوں ہاتھ بے جان تھے اور میرا چہرہ جالا بنتی ہوئی مکڑی کی طرح تھا جو اچانک دیوار سے گر کر زمین کے اندر کسی نئی سوراخ میں داخل ہو گئی تھی۔ سارہ نے دروازہ کھولا تھا۔ سارہ میرے ساتھ ہی کمرے میں آئی۔ وہ مجھے بغور دیکھ رہی تھی۔، جیسے میرے چہرے سے اندر چل رہی کشمکش کا جائزہ لے رہی ہو۔

' بات نہیں بنی؟'

' بن گئی۔' میرا لہجہ کمزور تھا۔

' بن گئی؟' وہ سہمی ہوئی میرے قریب بیٹھ گئی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس وقت اس کے چہرے پر وہی آثار تھے، جو میرے چہرے پر تھے۔ اسے خوش ہونا چاہیے تھا کہ مجھے نوکری مل گئی۔ مجھے بھی اس بات مسرت ہونی چاہیے تھی کہ دھکے کھانے کے دن

ختم ہوئے اور میں کسی حد تک ایک بہتر زندگی میں داخل ہونے کی کوشش کرسکتا ہوں۔ کمرے میں اچانک دھند بڑھ گئی تھی۔ جیسے بادلوں کے بڑے بڑے ٹکروں نے کمرے کو اپنے حصار میں لے لیا ہو۔ کافی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر سارہ نے میری طرف دیکھا۔

'زندگی آسان ہو کر پہلے سے زیادہ مشکل ہو جاتی ہے۔'

'زندگی ایک فریب ہے۔' میں آہستہ سے بولا۔

'پھر تو تم صحیح ہو۔'

مجھے سارہ کی بات پر حیرت نہیں ہوئی۔ میں نے پھر دہرایا۔ زندگی ایک فریب ہے۔'

'ماضی، تاریخ، مستقبل، حال سب فریب۔ پھر کیوں خوفزدہ ہو؟'

کیا آئیڈیالوجی بھی ایک فریب ہے؟۔ میں نے سہمے انداز میں سارہ کو دیکھا، زندگی بھر جو کچھ سوچتا رہا، لکھتا رہا، اب لگتا ہے، وہ میرے نظریے کا حصہ تھا ہی نہیں۔ کیا ہم ایک بازار کا حصہ تھے؟ جہاں ایک نام نہاد سیکولرزم کو خریدا اور بیچا جا رہا تھا۔ یا ہم اس سیکولرزم کو سمجھ ہی نہیں سکے جس میں فاشزم کے عناصر بھی شامل تھے۔ آج کی تاریخ میں مجھے کس نام سے پکارا جائے گا سارہ؟ موقع پرست، ابن الوقت یا مجبور انسان؟

'نہیں۔' سارہ کے لہجے میں سختی تھی۔ اس وقت مجھے تم دنیا کے سب سے کمزور انسان لگ رہے ہو۔ کیا تم ہمیشہ سے مفرور تھے؟ یہ تم کو سوچنا ہے۔ میں کوئی تبصرہ نہیں کرسکتی۔ خود کو بے بس کر دینا بھی فرار ہے۔ کیا سچ مچ تمہارے پاس کوئی راستہ نہیں تھا؟'

میں نے سر جھکا لیا۔ اس وقت میں دوبارہ اس نایاب پرندے کی طرح خود کو محسوس کر رہا تھا جو آکٹوپس کی طرح سکڑ گیا ہو۔

'کیا سب تمہاری طرح ہوتے ہیں؟' سارہ میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

'پاشا مرزا اور تم.....' میں کہتے کہتے رُک گیا۔

'اب تک کیا کیا تم نے؟ کیا میں نے کوئی شکایت کی؟ پاشا نے بھی کھل کر تم سے کوئی شکوہ نہیں کیا۔ اب مجھے اور پاشا کو درمیان میں کیوں لاتے ہو....'

'تمام علاقے میں شورش پھیلی ہے۔ معلوم نہیں کیسے حالات ہوں گے۔ آئندہ ہمارا طرز عمل کیا ہوگا، میں یہ بھی نہیں جانتا۔'

'کیا ایسے حالات پہلی بار ہیں؟' سارہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ 'تمہاری زندگی کے کچھ واقعات میں کبھی نہیں بھولی۔ وہ سیاہ رات یاد ہے، جب رات کے گیارہ بجے دو پولیس والے تمہیں لینے آئے تھے؟ اس وقت یہ بی مشن نہیں تھا۔ تمہارے چہرے پر سکون تھا اور تم آرام سے اس شخص سے ملے جو کئی انکاؤنٹر کر چکا تھا۔ میں نے اس کے سامنے بھی تم کو دیکھا، تم مطمئن اور پرسکون انداز میں بات کر رہے تھے۔ اس وقت مجھے تم پر فخر ہوا تھا۔ کیا یہ سارہ کچھ اتنی جلد گزر گیا۔ یا تم وقت سے شکست کھا گئے۔'

مجھے زندگی کے وہ بیشتر لمحے یاد آئے جب میں کسی اسپائڈر مین یا سپر مین سے خود کو کم نہیں سمجھتا تھا۔ ابھی کچھ دن پہلے اپنے بیٹے سے مکالمہ کرتے ہوئے بھی میں نے کہا تھا، میں اڑنا چاہتا ہوں، میں اس وقت نازیوں کے بنائے گئے گیس چیمبر میں تھا لیکن یہاں تک لانے میں کسی نازی کا ہاتھ نہیں تھا۔ یہاں تک میں خود چل کر آیا تھا۔ 1939 کے آخر میں نازیوں نے بڑے پیمانے پر گیس چیمبر کا استعمال کیا۔ تجربات کے آغاز میں سب سے پہلے ذہنی مریضوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا.... کیا میں بھی ذہنی مریض ہوں؟ نازیوں نے کچھ معذور لوگوں کو زندگی کے قابل نہیں سمجھا۔ اس کے بعد وسیع پیمانے پر گیس سے لیس گاڑیوں کا استعمال کیا گیا۔ ان میں بیشتر

یہودی اور خانہ بدوش تھے۔ مرگ انبوہ جسے ہولوکاسٹ بھی کہا جاتا ہے، سیاسی حریفوں کو بے دریغ قتل کرنے کے لیے یہ حربہ استعمال کیا گیا۔ مقتل گاہوں میں جانوروں کی طرح انسان بھر دیے گئے اور انہیں زہریلی گیس کے حوالے کر دیا گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ کمرے میں گھٹن بڑھ گئی ہے۔ میرے اندر مڈغاسکر کے طول وعرض میں پائے جانے والے نایاب قوی ہیکل پرندے کو ہلاک ہوئے مدت ہو چکی ہے۔ سارہ غور سے میرے چہرے کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

'خود پر رحم کرو۔' اس کے لہجے میں سختی تھی۔

'خود پر.....؟'

'ہم پر رحم کرنے کی ضرورت نہیں۔' اس کا لہجہ اس بار بھی سخت تھا۔ میں اس تبدیلی پر حیران تھا۔

'میں کہاں کسی پر رحم کر رہا ہوں.....'

'کر رہے ہو۔'

'میں ہوا کے مخالف چل سکتا ہوں؟'

'اب تک چلتے رہے۔'

'اور اب تک بیمار بھی رہا۔ تہی دامن۔'

'اور اب؟ علی بابا کا خزانہ مل جائے گا؟' سارہ کے لہجے میں طنز پوشیدہ تھا۔

'مجھے خود سے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔'

'یہ تمہارا مسئلہ ہے۔ اور اس مسئلے پر میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔'

'کیا یہ مسئلہ صرف میرا ہے۔؟'

'صرف تمہارا۔'

سارہ ناراض تھی اور اسے ناراض ہونے کا حق حاصل تھا۔

'میں گہری دھند میں ہوں اور اس وقت میرا دماغ سن پڑ چکا ہے۔'

سارہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ الٹا اس نے سوال پوچھا۔ تمہیں کیا لگتا ہے، پاشا کو کیسا لگے گا؟'

'پاشا کو خوش ہونا چاہیے۔ وہ مجھے خالی دیکھ کر پریشان ہو چکا تھا۔'

'اب وہ زیادہ پریشان ہوگا، تمہاری اصلیت جان کر۔ ممکن ہے، وہ تمہاری ذات سے سمجھوتہ کر چکا ہو مگر تمہاری اس اصلیت سے سمجھوتہ اسے منظور نہیں ہوگا۔ میں جانتا ہوں، وہ کچھ نہیں کہے گا۔ میرا بیٹا ہے۔ مگر وہ تمہاری صرف ایک چیز سے خوش تھا۔ اور وہ تھی تمہاری آئیڈیالوجی۔ جس کی قیمت اب جلے ہوئے کاغذات سے بھی کم ہے۔ یقین رکھو، میں اسے اس بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔ لیکن وہ جان گیا تو تمہیں معاف نہیں کرے گا۔'

'سنو سارہ۔' مجھے راکیش وید کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ اور اس وقت میں دوبارہ اپنے جسم میں واپس آ گیا تھا۔

'بولو۔'

'وہ کہتے ہیں، جتنا ہم ان کے خلاف لکھتے ہیں، وہ اسی قدر مضبوط ہوتے ہیں۔'

'وہ غلط کہتے ہیں۔ یہ ان کی بے بسی اور لاچاری ہے۔ یہ ان کا پروپیگنڈہ ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ تم سب خاموش لاش میں تبدیل

ہو جاؤ۔ پھر صرف ان کی حمایت رہ جائے گی۔ دراصل وہ خوفزدہ لوگ ہیں۔ اقتدار پر بیٹھا ہوا آدمی سب سے کمزور ہوتا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ تم مضبوط تھے۔'

' انہوں نے ہمارے سیاسی لیڈروں کی بات کہی اور عام آدمی بھی یہی سوچتا ہے کہ ہمارے علما، ہمارے لیڈر دراصل ان کے راستے کو آسان کر رہے ہیں۔'

' لیڈروں کی بات میں نہیں جانتی۔ ہر لیڈر اپنا سیاسی مفاد دیکھتا ہے۔ برسوں سے قوم کو فروخت کیا جا رہا ہے لیکن کیا آج سچ بولنے والے خاموش ہو گئے؟ یا مردہ ہو گئے تمہاری طرح۔' سارہ کی آواز کانپ رہی تھی، ' ہمارے پاس ایک بے چین روح کے سوا کیا تھا۔ یہ روح ہر اس موقع پر بے چین ہوتی تھی جب جب ظلم دیکھتی تھی۔ یہ روح تمہارے اندر بھی تھی۔ اب بھی ہے۔ آگے نہیں جانتی۔ بے چین روح سچ بولنے کے لیے آواز دیتی ہے۔ روح مردہ ہو جاتی ہے تو ہمارے پاس کچھ بھی کہاں رہ جاتا ہے۔ بولو..... رہ جاتا ہے کیا....؟' ۔ ایک ملکہ شان سے اٹھی اور چلی گئی۔ اس وقت سارہ کا خیال کسی ملکہ سے کم نہیں تھا۔ ایک ایسی ملکہ جس کے پاس فی الوقت زندگی کا کوئی سہارا نہیں تھا۔ مگر اسے کوئی افسوس نہیں تھا۔ ایک خوفزدہ چھپکلی دیوار پر نظر آئی جو سامنے آنے سے گھبراتی تھی.... اور اس وقت وہ تیز تیز رینگتی ہوئی نگاہوں کے تعاقب سے دور چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد چھپکلی دیوار سے غائب تھی۔

(۱۲)

سورج سر پر آ گیا تھا۔ مکانات کی ایک لمبی قطار دور تک چلی گئی تھی۔ موچی کی دکان پر آج بھی ضرورت سے زیادہ لوگ تھے۔ اس کے پاس جو مندر تعمیر تھا، وہاں سے بھجن کی آوازیں آ رہی تھیں۔ خفیہ افسر اپنی گاڑی کی صفائی کر رہا تھا۔ یہ اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ ناگارجن کچھ دیر کے لیے نظر آئے، پھر نظر سے اوجھل ہو گئے۔ صفائی کرتے ہوئے خفیہ افسر نے میری طرف دیکھا۔ اس بار اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ اس نے اشارے سے بلایا اور کہا۔

' نیا قانون آیا ہے۔ اب آپ کو اپنے کھانے پینے کی تفصیلات بھی ہمیں فراہم کرنی ہیں۔ ویسے اس وقت جا کہاں رہے ہیں۔'

میں نے اسے جگہ کا نام بتایا تو وہ چونک گیا۔ 'بی مشن....' اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ اب یہی ایک راستہ ہے۔'

اتنا کہہ کر وہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ میں نے آٹو کیا۔ ایک عالیشان ٹاور کے دسویں مالے پر بی مشن کا آفس تھا۔ پہلے ہی دن لفٹ پانچویں فلور پر خراب ہو گئی۔ کم و بیش دس منٹ کا عرصہ گھٹن میں گزرا۔ یہ لمحہ ایسا تھا جیسے میں اسٹیل کے تابوت میں بند ہوں۔ میرے ساتھ اگر سات آٹھ لوگ نہ ہوتے تو شاید دس منٹ میرے لیے دس سال کے برابر ہوتے.... اور اس گھٹن کو قبول کرنا میرے بس میں نہیں ہوتا۔ دس منٹ بعد لفٹ چل پڑی۔ کوئی تکنیکی خرابی آ گئی تھی۔ اب مجھے مسلسل اسی لفٹ کا سامنا کرنا ہے۔ یہ بات بھی مجھے پریشان کر رہی تھی۔ لفٹ میں ہونے والے بہت سے حادثوں کی تفصیلات میں پڑھ چکا تھا مگر اب بڑے شہروں کی عالیشان عمارتیں لفٹ کی اسی طرح محتاج ہیں، جیسے اس وقت میں بی مشن کا محتاج تھا۔

ریسپشن پر مجھ سے میرا موبائل لے لیا گیا۔ ہال کے اندر موبائل لے جانے پر پابندی تھی۔ ریسپشن پر وہی بزرگ آدمی بیٹھے تھے، جن سے میری پہلے بھی ملاقات ہو چکی تھی۔ انہوں نے ایک لڑکے کو بلایا اور مجھے ساتھ میں لے جانے کے لیے کہا۔ کچھ ہی دیر بعد میں ایک کیبن میں بیٹھا ہوا تھا۔ میری میز اور کرسی الگ تھی۔ وہاں پہلے سے ہی آٹھ افراد موجود تھے۔ سلام دعا کے بعد کمرے میں

خاموشی چھا گئی۔ مجھے بتایا گیا کہ نماز پڑھنے کے لیے بھی ایک چھوٹی سی جگہ دی گئی ہے اور یہاں کام کرتے ہوئے کسی کو کوئی پریشانی نہیں۔

ان میں ایک لڑکی بھی تھی۔لڑکی کا نام زرین حیدر تھا۔عمر کوئی پچیس برس ہوگی۔شادی نہیں ہوئی تھی۔دلی کے سلیم پور علاقے میں اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتی تھی۔اس کی دو بڑی بہنیں بھی تھیں۔باپ اتنے بڑے خاندان کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں تھا۔تین لڑکیاں اور کسی کی بھی شادی نہیں ہوئی تھی۔زرین کا باپ ایک فیکٹری میں کام کرتا تھا۔زرین اردو، ہندی ٹائپنگ میں مہارت رکھتی تھی۔ چونکہ موبائل پر پابندی تھی، اس لیے یہاں کام کرنے والے تمام لوگ اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔گفتگو کی ممانعت تھی۔میرے لیے پہلا دن تھا اور مجھے اس محکمہ کو سنبھالنا تھا، اس لیے ان تمام افراد سے تعارف بھی ضروری تھا۔

مولوی فرقان کی عمر پچاس برس تھی۔وہ مدرسہ سے فارغ تھے۔اردو پر عبور حاصل تھا۔وہ ہندی اخبارات سے، مشن کے تعلق سے جو خبریں اہم ہوتی تھیں، ان کا اردو میں ترجمہ کرتے تھے۔ان تمام لوگوں کو اردو، ہندی، انگریزی کے اخبارات دیے جاتے تھے اور اخبارات پڑھتے ہوئے سرخیوں کو غور سے پڑھنا ہوتا تھا۔بی مشن کی حمایت یا اختلاف میں جو خبریں ہوتی تھیں، ان کے تراشے جمع کرنے ہوتے تھے۔پھر ایسی تمام خبروں کی الگ الگ فائل بنانی پڑتی تھی۔

زرین کے علاوہ دولڑکے اور تھے جو کمپوزنگ کا کام سنبھالتے تھے۔ان میں ایک دیوبند کا فارغ تھا۔عاصم نورانی نام تھا۔گوراچٹا مگر جسم سے کمزور۔دوسرے کا نام الیاس معروفی تھا۔الیاس مئو کا رہنے والا تھا اور اب دلی کے لکشمی نگر میں عاصم نورانی کے ساتھ ہی ایک کمرے میں گزارہ کرتا تھا۔لکشمی نگر میں آسانی سے ایسے نوجوانوں کو رہنے کے لیے کرایے کے کمرے مل جایا کرتے تھے۔

ناظر قاسمی اہل حدیث تھے۔اوکھلا میں رہتے تھے۔عمر تیس سے کچھ زیادہ ہوگی۔شادی ہو چکی تھی۔شاہنواز قادری بریلی سے آئے تھے۔انگریزی اچھی تھی۔یہ اردو خبروں کا انگریزی میں ترجمہ کرتے تھے۔ناظر اردو خبروں کو انگریزی کا لباس پہنایا کرتے تھے۔ایک انیس جامعی تھے۔یہ بھی نوجوان تھے اور مطالعہ کے شوقین تھے۔سلیم عباسی اور مونس رضا حیدری میگزین کے شعبے سے وابستہ تھے۔یہاں سے اردو اخباروں کی خبروں پر مشتمل ۳۲ صفحات کا رسالہ جن چیتنا اردو اور ہندی میں شائع ہوتا تھا۔ان کا کام اہم خبروں کی نشاندہی کرنا ہوتا تھا۔سلیم اور مونس دونوں کی عمر ۳۵ کے آس پاس ہوگی۔ایک خاص بات یہ تھی کہ ان نو افراد میں تین حافظ بھی تھے۔مولوی فرقان، انیس جامعی، ناظر اور شاہنواز قادری نماز کے پابند تھے۔اب ان کے درمیان کا ایک رکن میں بھی تھا۔اب یہ تمام افراد میرے ماتحت تھے۔مجھے خبروں کی نگرانی کا شعبہ دیا گیا تھا۔اور مجھے اردو ہندی رسالہ کے نظام کو بھی دیکھنا تھا۔مجھ سے کہا گیا تھا کہ جب تک آپ ہمارے مشن سے وابستہ ہیں، آپ فضول کی باتیں لکھنے کا کام ترک کر دیں گے اور کسی بھی اخبار سے آپ کا تعلق نہیں ہوگا۔

میں پہلے ہی دن اپنا کام بہت حد تک سیکھ چکا تھا۔میں ایک نئے جزیرے کا سیاح تھا، جو اب تک گزاری ہوئی عمر میں، کبھی ہوا کی سمت نہیں چلا بلکہ ہوا کے مخالف چلا۔سسٹم کو سامنے لانے کے لیے آپ کو ہمیشہ ہوا کے مخالف چلنا ہوتا ہے۔مگر اب میری نظریں ان خبروں پر دوڑ رہی تھیں جو اپنی جگہ صحیح تھیں مگر حکومت مخالف کا درجہ رکھتی تھیں اور مجھے ان خبروں کو جمع کرنے، دیکھنے اور شائع کرنے کا کام سونپا گیا تھا۔تین چار دنوں میں یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کی بی مشن کی ہزاروں شاخوں میں اسی طرح کا کام چل رہا ہوگا اور اب میں بھی اس مشن کا حصہ تھا۔اردو، ہندی اخبارات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد کچھ حقیقتیں کھل کر سامنے آئی تھیں۔

ایک زمانہ تھا جب فرنگیوں نے ہندو اور مسلمانوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔یہ فرنگی سیاست تھی جس کی بنیاد ہی تقسیم کرو اور حکومت کرو کی بنیاد پر رکھی گئی تھی.....اور آخر کار وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوئے۔آزادی اپنے ساتھ لہولہان تقسیم کے المیہ کو ساتھ

لے کر آئی تھی۔ آزادی کی جنگ میں ہندستان سے نکلنے والے تمام اخبارات ایک سر میں انگریزوں کی مخالفت کر رہے تھے۔ اردو، ہندی کے علاوہ علاقائی زبانوں سے نکلنے والے اخبارات کا لہجہ اور مقصد ایک ہی تھا۔ سب آزادی کی جنگ میں یکساں طور پر شریک تھے اور مخالفت کے گیت گا رہے تھے۔ مگر آج ایسا نہیں ہے۔ اردو اور غیر اردو اخبارات کی دنیا نہ صرف بدل چکی ہے— بلکہ یہ الگ الگ دنیائیں تقسیم سے زیادہ خوفناک ماحول کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ سبحان علی نے ایک بار کہا تھا۔ اردو اخبارات کا مطالعہ کیجیے تو ایسا لگتا ہے مسلمانوں سے زیادہ مظلوم قوم اس دنیا میں کوئی نہیں۔ ہندی اخبارات کو پڑھیے اور ٹی وی نیوز سنیے تو اصل فساد کی جڑ مسلمان نظر آتا ہے— ہندی ہی نہیں، زیادہ تر غیر اردو اخبارات کا مزاج آج بدلا بدلا نظر آتا ہے۔ کیا ہم ایک بار پھر لاشعوری طور پر تقسیم کی طرف بڑھ رہے ہیں— یہ سچ نہیں ہو تب بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو اور غیر اردو اخبارات کی الگ الگ فضا نے تقسیم جیسا ماحول تو پیدا کر ہی دیا ہے— ایک عام سا سوال ہے کہ کیا ہندی اخبارات کو مسلمانوں کے مسائل سے کوئی لینا دینا نہیں ہے؟ کیا مسلمانوں کی خبریں ان اخباروں میں سرخیاں تب ہی بنتی ہیں، جب کوئی مسلمان انہیں شک کے گھیرے میں نظر آتا ہے— جسٹس باجو بھی میڈیا سے بار بار یہ درخواست کر چکے ہیں کہ جب تک سچائی سامنے نہ آئے آپ فرضی تحریکوں اور نام کا سہارا نہ لیں لیکن ایسا لگتا ہے غیر اردو اخبارات اور میڈیا ایماندارنہ صحافت کا راستہ بھول کر اقلیت دشمنی کا ثبوت دے رہے ہوں۔

ہم اس بات سے واقف ہیں کہ فسادات اور دہشت گردی کے پس پردہ ہندستانی میڈیا کہیں نہ کہیں عام اقلیتوں کے جذبات کو مجروح کر رہا ہے۔ فرضی انکاؤنٹرس کے واقعات پر غیر اردو اخبارات اور میڈیا کی خاموشی ہمیں پاگل کرتی ہے۔ ابھی حال میں ایک سروے میں بتایا گیا کہ ہندستانی مسلمان گھروں میں کم اور جیلوں میں زیادہ ہیں۔ مسلسل فسادات میں مسلمانوں کا خون ہوتا رہا۔ کبھی ہجومی تشدد کے نام پر، کبھی مخصوص لباس کی وجہ سے مسلمانوں کو مسلسل نشانہ بنایا گیا۔ لیکن غیر اردو اخبارات خاموش رہے۔ حکومت بے قصور مسلمان نوجوانوں کو حراست میں لیے جانے کے باوجود اپنی گھناؤنی سیاست میں مصروف رہی— صرف اردو اخبارات تھے جو ان خبروں کو نمایاں طور پر شائع کر رہے تھے۔ لیکن ان آوازوں کی گونج ایوان سیاست میں نہیں ہوئی۔

غیر اردو اخبارات اور میڈیا کا رول شروع سے مسلم مخالفت کا رہا ہے۔ فرضی انکاؤنٹر پر یہ میڈیا چیختا ہے مگر جب مسلمان بے قصور ثابت ہوتا ہے تو یہ میڈیا خاموش ہو جاتا ہے۔ دراصل میڈیا مسلمانوں کی ایسی خبریں دکھانا نہیں چاہتا جہاں مسلمانوں کی بے گناہی ثابت ہو۔ ہندی اخبارات کے ساتھ سوشل ویب سائٹس اور میڈیا تک مسلمان کو دہشت گرد اور غدار ثابت کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ صرف اردو اخبارات ہیں جو مسلمانوں کے تعلق سے خبریں شائع کر رہے ہیں۔ اردو اخبارات سے ہی خبر ملتی ہے کہ فرضی انکاؤنٹر میں جن مسلمانوں کو جیل میں ڈالا گیا، ان میں سے کچھ کو رہائی مل گئی اور وہ بے قصور ثابت ہوئے۔

لیکن اب میرے چہرے پر ایک ماسک آ گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ پہلے دن سے ہی میری آمد سے یہاں کوئی خوش نہیں ہے۔ ایک بات مجھے اور پریشان کر رہی تھی کہ ایمانداری سے بہت دنوں تک میں یہ کام انجام نہیں دے پاؤں گا۔

ایک دن شاہنواز نے حقارت سے پوچھا۔ 'آپ نماز نہیں پڑھتے؟'

'کبھی کبھی۔' میں نے سوال کو آگے بڑھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

یہ میرا قیاس ہے کہ یہ لوگ مجھ پر نظر رکھ رہے ہیں۔ یہ تمام لوگ پہلے سے مجھ سے واقف تھے ورنہ انہیں بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ میں یہاں اپنی خدمات بھی انجام دے سکتا ہوں۔ مجھے صرف ایک بات تقویت دیتی تھی کہ رسالہ میں کسی بھی حیثیت سے میرا نام شامل نہیں تھا۔ ایک بڑی دنیا کو اپنی مجبوری سمجھانے میں، میں ناکام رہا۔ لیکن مجھے یہ بھی اندازہ تھا کہ بہت دنوں تک یہ بات ڈھکی چھپی نہیں

رہے گی۔ میں سارہ کے منع کرنے کے باوجود اس مشن کا حصہ بنا تھا اور اس لیے بنا تھا کہ زندگی کے تمام راستے میں بند دیکھ رہا تھا۔

پانچویں دن راکیش وید اچانک دو بجے کے قریب کیبن میں داخل ہوئے۔ ان کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ انہوں نے ہم سب کی طرف دیکھا۔ پھر پوچھا۔

' آپ میں سے کسی کو ٹی وی چینل پر جانے کا شوق ہے۔'

مولوی فرقان، شاہنواز قادری اور ناظر قاسمی نے اپنے ہاتھ بلند کیے۔

مولوی فرقان نے کہا۔ میں جاؤں گا سر

ناظر قاسمی نے کہا، آپ جو کہیں گے، میں بولنے کیلئے تیار ہوں۔

شاہنواز قادری نے کہا، مجھے تو سیاست سے دلچسپی ہے سر۔

' راکیش وید کا لہجہ نرم تھا۔ انہوں نے تینوں کی طرف دیکھا اور کہا۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ سب مدرسے کے پروڈکٹ ہیں۔ اور مدرسے میں تقریر کرنے کا فن بھی سکھایا جاتا ہے۔ چینل پر جانے سے آپ کی مقبولیت میں اضافہ ہوگا۔ ان دنوں ایک مہم چل رہی ہے کہ مسلمان عالم ٹی وی چینل کا حصہ نہ بنیں۔ مگر ایک بات یاد رکھیے، آپ وہی بولیں گے جو آپ کو کہا جائے گا۔'

' راکیش وید کی آنکھیں اب میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ مگر انہوں نے کچھ کہا نہیں۔ شاہنواز قادری اور مولوی فرقان کی طرف دیکھا۔ آج پرائم ٹائم کے لیے آپ دونوں جائیں گے۔ ناظر کل کے پروگرام میں شریک ہوں گے۔'

راکیش وید نے زیادہ باتیں نہیں کیں اور کمرے سے رخصت ہوگئے۔ مولوی فرقان، شاہنواز اور ناظر کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ تھی جیسے ان تینوں نے دنیا کو فتح کر لیا ہو۔ راکیش وید کے جانے کے بعد میں کچھ دیر تک سوچ وفکر میں ڈوبا رہا۔ ایک شارک مچھلی تھی جو منہ کھولے تیزی سے میری طرف بڑھ رہی تھی۔

اس رات چینل پر میں نے مولوی فرقان اور شاہنواز قادری کو ڈبیٹ میں حصہ لیتے ہوئے دیکھا۔ یہ دونوں کھلے عام بی مشن کی تعریف کر رہے تھے اور اس بات پر زور دے رہے تھے کہ بی مشن اب مسلمانوں کی توجہ کا مرکز ہے۔ گفتگو کے درمیان جادوگر کا ذکر آیا تو مولوی فرقان نے قرآن شریف کی ایک آیت سنائی، پھر کچھ جادو اور سحر کے بارے میں ایک چھوٹی سی تقریر کی۔ میں غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔

اس کے بعد مولوی کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ بولنا شروع کیا۔' دراصل زیادہ تر لوگ افواہوں کے درمیان جی رہے ہیں۔ جادوگر نہیں ہے، مگر سب نے تسلیم کر لیا ہے کہ جادوگر ہے اور کھیل دکھا رہا ہے۔ جادوگر ہے جو نوٹوں کو تبدیل کر رہا ہے۔ چٹانوں کو کاٹ کر سمندر اور سمندر کے پانی میں چٹانیں کھڑی کر رہا ہے۔ یہ سب بے کار کی باتیں ہیں اور ایسے بھدّے مذاق کے لیے اپوزیشن کو معاف نہیں کیا جاسکتا۔'

' اس کا مطلب' مسلمان افواہوں کا شکار ہیں؟'

' مسلمان ہی کیوں؟ تمام اقلیتیں' مولوی فرقان نے اپنی بات جاری رکھی۔ کہا جا رہا ہے۔ وہ آ رہے ہیں۔ وہ چاروں طرف سے آ رہے ہیں۔ پورا ملک انتشار کا شکار ہے۔ کہاں ہے؟ کون شکار ہے؟'

دوسرے دن معلوم ہوا کہ راکیش وید نے مولوی فرقان کی کلاس لگائی کہ آپ کو اقلیتوں کا ذکر نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آپ کو صرف

مسلمان کے دائرے میں اپنی بات رکھنی چاہیے تھی۔

اس دن کے بعد سارہ نے کبھی مجھ سے میری نوکری کے بارے میں دریافت نہیں کیا۔لیکن اس نے یہ ضرور بتایا کہ پاشا مرزا کو یہ معلوم نہیں ہے کہ میں ان دنوں کہاں جاتا ہوں۔ مجھے پاشا کی ذہانت کا اعتراف تھا۔ وہ کچھ کہتا نہیں لیکن تمام باتوں کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔میرے گھٹنے دوبارہ مڑ گئے تھے اور بے جان سر گھٹنوں کے درمیان تھا۔ جارج بائرن نے کہا تھا کہ جو لوگ سوال نہیں اٹھاتے، منافق ہیں۔ جو سوال نہیں کر سکتے، احمق ہیں اور جن کے اندر سوال پیدا نہیں ہوتے، غلام ہیں۔ یہ ہم کو طے کرنا ہے کہ موجودہ دور میں ہماری شناخت کس حیثیت سے کی جائے گی۔لیکن میں کیا تھا؟ بہروپیا، مسخرہ یا غلام۔ میں تاریخ کی الٹی سمت بہہ رہا تھا۔ میں سچ کو غلط، ناجائز کو جائز کہہ رہا تھا۔ میں سچ اور حقیقت کی دنیا پر پردہ ڈال رہا تھا اور یہ میرے حصے کا کام تھا، جو مجھے پوری ایمانداری سے کرنا تھا۔ہم کچھ لوگوں کو قبرستان بھیج رہے تھے۔ کچھ کو پاکستان۔ کچھ کو غدار ٹھہرا رہے تھے۔

ہم شمبھو ناتھ اور سادھویاں پیدا کر رہے تھے۔ شکاری پرندے آزاد ہو گئے تھے اور رہائی کا جشن منا رہے تھے۔ میڈیا اپنا فرض نبھا رہا تھا اور اقلیت کارڈ کھیل رہا تھا۔ ایک اسٹوڈنٹ یونیورسٹی سے غائب ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگ اس کی ماں کو سڑکوں پر گھسیٹتے ہیں۔ میڈیا کسی چیخ، کسی نعرے کسی تقریر کو حب الوطنی کے نام پر اپڈیٹ کرتا ہے اور ایک گمنام جادوگر ہمارے درمیان آ جاتا ہے۔

اس دن مولوی فرقان سے بس اسٹینڈ پر ملاقات ہو گئی۔ بات کرتے ہوئے ہم ایک کیفے میں آ گئے۔ مولوی فرقان مجھ سے بڑے تھے مگر اب دو چار دن میں ہی اپنی تقریروں سے میڈیا میں خاص جگہ بنالی تھی۔

مولوی فرقان نے پوچھا۔' آپ کیسے پھنس گئے؟'

میرے لہجے میں خاموشی تھی۔

' آپ کا بڑا نام ہے۔ آپ آ گئے تو کوئی بھی آ سکتا ہے۔'

' ض.....م.....یر....' میں نے بمشکل اس لفظ کو دہرایا۔

' ضمیر کی فکر کیوں کرتے ہیں۔ مجھے کوئی کام مرضی کے موافق نہیں لگتا تو استغفار پڑھ لیتا ہوں۔ یہ کفرستان ہے۔ زندگی تو گزارنی ہے۔ استغفار پڑھیے اور جو کام مل رہا ہے، کرتے چلیے۔ ان کاموں میں ضمیر کو نہ لا دیئے...'

' لیکن کیا یہ آسان ہے۔'

مولوی فرقان ہنسے.... چیونٹی مارنے سے زیادہ آسان۔ ان کے مشن کو فالو کیجیے۔ مجھ سے زیادہ تجربہ آپ کا ہے۔ سیاست کا راستہ کھلا ہے۔

' میں سیاست میں نہیں آنا چاہتا۔'

' نہیں چاہتے سے کیا ہوگا۔ کچھ دنوں میں سب کو پتہ چل جائے گا کہ جہانگیر مرزا کیا کر رہے ہیں۔ پھر آپ کو فرق نہیں پڑے گا۔'

مولوی فرقان ہنسے.... آپ کو کیا لگتا ہے، بی مشن والے آسانی سے آپ کو چھوڑ دیں گے۔ یہ لوگ آپ سے بھی کام لیں گے۔ ابھی یہ وقت نہیں آیا ہے مگر دو تین مہینوں میں مشن والے آپ سے کوئی نہ کوئی بڑا کام ضرور لیں گے۔'

'بڑا کام مثلاً'

' میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ آپ بڑے آدمی ہیں۔ ان کے لیے بڑے ناموں کو کیش کرنا سب سے ضروری عمل ہے۔ آپ جیسے لوگوں

کے آنے کا مطلب ہے، ایک سیکولر طبقہ مسلمانوں کا بی مشن میں داخلے کے بارے میں غور تو کرسکتا ہے۔'

میرا سر بھاری تھا، مولوی فرقان سچ بول رہے تھے۔

' کیا کبھی آپ کو کوئی خوف محسوس ہوتا ہے۔؟'

' ہاں۔' فرقان نے کہا۔

' کس طرح کا خوف...'

' کہ مسلمانوں پر برا وقت ہے۔'

' اور تمہاری فیملی؟'

' ہم جب تک مشن کا حصہ ہیں، ہمیں کوئی خطرہ نہیں۔ نہ ہمارے خاندان کو۔' مولوی فرقان نے آہستہ سے کہا۔ آنکھیں بند کیے رہیے۔ ہر جگہ آنکھیں کھولنے کی ضرورت کیا ہے۔ آنکھیں بند ہوں تو کوئی مصیبت نہیں۔ مصیبت آنکھیں کھولنے کے بعد شروع ہوتی ہے۔ یہاں آ کر ہم سب نے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ استغفار پڑھتے رہیے۔' فرقان مسکرایا۔

' ایک بات اور، انہیں پل پل کی خبر رہتی ہے۔ یہ ہمیں مسلسل واچ کرتے رہتے ہیں۔ ہمیں ہی نہیں بلکہ پورے ملک کو۔ ان کی کروڑوں آنکھیں ہیں جو ہمیں ہر لمحہ دیکھ رہی ہوتی ہیں۔ اس لیے غلطی سدھارنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ آپ نے دیکھا، ایک وزیر سڑک پر مارا گیا۔ وہ ای وی ایم ہیکر سے مل رہا تھا۔ پہلے ہیکر س ہلاک ہوئے۔ پھر سڑک پر آ کر وزیر کو کچل دیا گیا۔ ایک نہیں ہزاروں مثالیں۔ آسان راستہ ہے...'

' آنکھیں بند رکھوں۔' میں خوفزدہ تھا۔

' پھر آپ محفوظ ہیں۔'

مولوی فرقان کی آنکھوں میں چمک تھی۔' اچھا یہ بتائیے، ان کی سب سے زیادہ مدد کون کر رہا ہے۔؟'

' پتہ نہیں۔'

' ہم کر رہے ہیں۔ ہم ان کی سب سے بڑی طاقت بن چکے ہیں۔ اس لیے آپ کو کون کیا کہتا ہے، ان باتوں سے نکل آئیے۔ آرام سے زندگی گزاریے۔ دلدل میں پھنسنے کی ضرورت نہیں ہے۔'

اس رات تیز بارش ہوئی تھی۔ ٹی وی چینلز پر بتایا گیا کہ کچھ علاقوں میں خونی بارش ہوئی ہے۔ پانی کی سرخ دھار اس سے قبل کبھی دیکھی نہیں گئی۔ بلکہ بارش کے ساتھ برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکرے بھی گرے۔ یہ ٹکرے بھی سرخ تھے۔ سرخ بارش دیکھ کر لوگ اپنے اپنے گھروں میں بند ہو گئے۔ کچھ جگہوں پر اس کا ذمہ دار اقلیتوں کو مانا گیا اور انہیں بے گھر کر دیا گیا۔ الگ الگ گاؤں کی پنچایتوں میں بھی اقلیتوں کے بارے میں کچھ اہم فیصلے سنائے گئے۔ ایک بڑا طبقہ تسلیم کرتا ہے کہ ان سب کے پیچھے جادوگر ہے۔

اسی رات تارا دیش پانڈے کا فون آیا۔

' کہاں ہو سرخ...'

' اب سرخ نہیں رہا۔'

تارا نے قہقہہ لگایا۔' اتنی جلدی سرخ رنگ تمہارے اندر سے جائے گا نہیں۔'

' چلا گیا۔ میں نے اس رنگ کو مٹا دیا۔'

' جھوٹے ہو۔' وہ زور سے چلائی ۔' اچھا سنو۔کل ملو۔ پریشان مت ہونا۔ میں راکیش کو بول دوں گی کہ تم میرے ساتھ ہو۔'

' تمہارے علاقے میں سرخ بارش تو نہیں ہوئی ۔'

' اُف ۔' وہ زور سے ہنسی ۔' میں بارودی بارش کا انتظار کر رہی ہوں ۔افواہوں پر زیادہ دھیان نہ دو۔'

اس نے فون کاٹ دیا۔ میں دیر تک تارا کے خیالوں میں کھویا رہا۔

(۱۳)

دوسرے دن صبح ہی صبح ناظر قاسمی اور شاہنواز قادری مجھ سے ملنے آ گئے ۔ دونوں کی عمر تیس کے آس پاس تھی ۔ دروازہ میں نے ہی کھولا اور انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ مجھے تارا سے ملنے بھی جانا تھا۔ سب سے اہم کام تھا کہ جن لوگوں کے ساتھ میں کام کر رہا ہوں، ان کو کسی کسی حد تک سمجھ سکوں ۔ یہ آسان کام نہیں تھا۔ اور مجھے اس بات کا احساس تھا کہ ان میں سے کوئی بھی مجھ سے زیادہ کھلنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ یہ دونوں بھی مولوی فرقان کی طرح ٹی وی چینلز کا حصہ بن چکے تھے۔ اور اب تینوں کو مسلسل ٹی وی چینلز پر ڈبیٹ کے لیے بلایا جا رہا تھا۔ شاہنواز اور ناظر دونوں نے یہ بات کہی کہ اب وہ لوگ جلد ہی ٹاور ورکشاپ سے الگ ہو جائیں گے۔ کیونکہ بی مشن کی ٹیم کو یہ گوارہ نہیں کہ لوگوں کو یہ پتہ چلے کہ ہم لوگ بی مشن سے وابستہ ہیں یا ان کے لیے کام کرتے ہیں۔ اب ان سے زیادہ بڑے کام لیے جائیں گے، یہ کہا جا چکا ہے۔ شاہنواز قادری نے اپنے گاؤں میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ ناظر اور فرقان کی دلچسپی سیاست میں تھی۔ شاہنواز قادری بھی پارٹی کی اہم ذمہ داری سنبھالنا چاہتے تھے۔ میرا قیاس ہے کہ مسلم چیتنا منچ میں تینوں کو شامل کر لیا جائے گا۔ یہ کئی برسوں سے کام کر رہے تھے۔ اور اب بی مشن انہیں نوازنا چاہتا تھا۔ اور یہ تینوں اس کے لیے تیار بھی تھے۔

چائے آ گئی۔ چائے پینے کے درمیان خاموشی حاوی رہی ۔شہنواز قادری نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا، ہم میں سے کسی کے پاس کوئی راستہ نہیں ۔ سیاست کی کاٹ بھی سیاست ہے اور ہم لوگوں کو یہ سمجھنا بھی ہوگا۔ بی مشن میں شامل ہونے کا مطلب یہ قطعی نہیں کہ ہم نے اپنا مذہب چھوڑ دیا ہے یا ہم اپنی اسلامی تعلیمات سے پھر گئے ہیں ۔ ہم ان کے قریب ہو کر سیاست میں اندر تک پہنچ کر جو کر سکتے ہیں، وہ ان سے فاصلہ رکھ کر نہیں کر سکتے ۔ ۔ہم ابھی بھی اس بات کو سمجھنے میں ناکام ہیں کہ یہ لوگ کس قدر طاقتور بن چکے ہیں اور ہم ان کی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتے ۔ ہم کیا، اس وقت کوئی بھی ان کی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ کچھ برسوں میں ہم جن لوگوں کو مسخرہ اور پاگل سمجھ رہے تھے، وہ آج ہم لوگوں پر حکومت کر رہے ہیں۔ ہم جن سیاست دانوں کے بیانات سے مشتعل ہو جاتے تھے، وہ کابینہ میں شامل ہیں ۔ اور جو لوگ ہلاکت کا کھیل، کھیل رہے ہیں، ان کے درجات بلند کیے جا رہے ہیں۔ ہم حاشیہ پر اس لیے ہیں کہ ہم مسلسل ان کے خلاف ہیں ۔، ہم اپنے آپ کو تبدیل کر دیں تو ممکن ہے ہمارے لیے بہتر راستہ نکل آئے۔'

ناظر قاسمی بھی کچھ اسی سطح پر سوچ رہے تھے۔ ان کے مطابق، ہم نہیں آئیں گے تو ہماری جگہ ٹوپی پہن کر کوئی اور آ جائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ہمارے لوگوں میں نہ ہو۔ کچھ حادثے ہو چکے ہیں۔ کچھ عورتیں حجاب میں پکڑی گئیں ۔جن کا تعلق ہمارے مذہب سے نہیں تھا۔ ایسے ہی کچھ نوجوان بھی گرفتار ہوئے، جو ہم میں سے نہیں تھے۔، یعنی ہم نہیں آئیں گے تو یہ ہماری جیسی اقلیتیں پیدا کر دیں

گے۔نقصان تو ہمارا ہوگا۔ان سے لڑنے کا بہتر طریقہ ہے کہ اقلیتیں زیادہ مضبوطی کے ساتھ پاور کا حصہ بنیں۔'

' کیا یہ مضبوط ہونے دیں گے؟' میں نے سوال کیا۔

' کیوں نہیں۔حمام میں کل بھی سب لوگ ننگے تھے۔لیکن دو ایک ایسے بھی ہیں جو لباس رکھتے ہیں۔یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ کا لباس کتنا سفید ہے یا آپ اپنے لباس کو کس حد تک سفید رکھ سکتے ہیں۔'

' کیا ایسا نہیں لگتا کہ یہ ہمارے کندھے پر بندوق رکھ کر ہم کو ہی ہلاک کرنا چاہتے ہیں؟'

شاہنواز قادری زور سے ہنسا۔کیا آزاد ملک میں ایسا پہلی بار ہوا ہے۔تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم کچھ باتوں کو بھول جائیں۔'

میری آواز کمزور تھی۔بھول جائیں کہ ہم چاروں طرف ہلاک ہو رہے ہیں۔خون کی بارش ہو رہی ہے۔چنار کے درخت کٹ گئے۔ایک پاگل بھیڑ درندہ بن کر ہماری طرف بڑھتی ہے۔کچھ نئے قانون صرف ہمارے لیے بنتے ہیں۔آئین کے ساتھ مذاق ہو رہا ہے۔ایسے بھی لوگ ہیں جو سیکولرزم اور جمہوریت کو گالیاں دے رہے ہیں۔اور سرعام ہمیں قبرستان بھیجنے کی باتیں ہوتی ہیں۔کیا ایسے مشن کا ساتھ دیتے ہوئے ہم یہ بھول جائیں کہ ہمارے ساتھ کیا کیا کارروائیاں ہو رہی ہیں؟'

' بھولنا تو ہوگا' ناظر قاسمی نے کہا۔ہم نے بھی تو آزادی کے بعد مسلسل ان لوگوں کو گالیاں دی ہیں اور اب بھی دے رہے ہیں۔ہمارا ووٹ بینک تمام پارٹیوں کے لیے کھلا ہے مگر بی مشن کے لیے بند ہے۔پھر ہم اس بات کی امید کیوں رکھیں کہ یہ ہمارے زخموں پر مرہم رکھیں گے۔'

' ٹھیک ہے۔' میں نے اس بار دونوں کی طرف غور سے دیکھا۔مان لو،بس ایک رنگ ہی رہ جاتا ہے۔دیواروں،گھروں، کھڑکیوں پر ایک رنگ،اس ایک رنگ سے کیا کوئی خطرہ نہیں ہے؟'

' ہے۔' ناظر قاسمی نے کہا۔لیکن خطرہ تو آپ کو دکھائی دیتا ہے۔راستہ کیا ہے؟ ایک رنگ۔مشکل یہ ہے کہ اس رنگ کو بھی قبول نہیں کیا جائے گا۔دلتوں،قبائلیوں،چھوٹی ذات،نیچی ذات بلکہ اس سے بھی نیچی ذات،اقلیتیں سب ایک رنگ میں رنگ جائیں۔تب بھی یہ رنگ انہیں قبول نہیں ہوگا۔کیونکہ چھوٹی دیوار کے مقابلے ایک بڑی دیوار کھڑی ہے۔چھوٹی مچھلیوں کے سامنے بڑی مچھلیاں ہیں۔

شاہنواز قادری کے چہرے پر کشمکش کے آثار تھے۔جادوگر کس کی ہتھیلیوں سے پیسے غائب کر رہا ہے؟ سب کچھ آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔قبول اس لیے کرنا ہے کہ ہم سب کے اندر ایک لجلجا جانور بھی چھپا ہے۔'

' لجلجا....؟ یہ کیا ہوتا ہے....'

' وہ جانور جو مختلف موقعوں پر اپنی شکلیں تبدیل کر دیتا ہے۔جیسے ہم،جیسے آپ،جیسے جادوگر،جیسے شارک مچھلیاں.....'

ناظر قاسمی نے قہقہہ لگایا۔' ہمارے ہتھیار ڈالنے سے بھی خطرہ ٹلے گا نہیں۔اس ایک رنگ کو قبول کرنے کے بعد بھی۔'

' کچھ دن پہلے ایک واردات ہوئی تھی۔مسلسل دھماکوں کی آواز آتی رہی۔لیکن یہ دھماکے مخصوص گھروں تک ہی محدود تھے۔بہتر زندگی کے لیے ضروری ہے کہ ہم صرف اپنے کام سے مطلب رکھیں۔'

' کیا دھماکوں کے درمیان صرف کام سے مطلب رکھا جا سکتا ہے؟'

ناظر نے کہا۔یہ آپ پر منحصر ہے۔ہماری تو کچھ دنوں میں چھٹی ہو جائے گی۔پھر ہمارا استعمال بڑی سیاست میں ہوگا۔'

' کیا دوسرے بھی اسی طرح سیاست میں استعمال ہو رہے ہیں؟'

قادری نے کہا۔'اس وقت سب استعمال ہو رہے ہیں۔کیا آپ استعمال نہیں ہو رہے؟'

ناظر نے کہا۔'استعمال چھوٹا ہو یا بڑا، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔آج آپ بڑے استعمال کو نظرانداز کر رہے ہیں، ہوسکتا ہے آنے والے وقت میں بڑے استعمال کا ذریعہ بن جائیں۔'

' جادوگر سب دیکھ رہا ہے۔' قادری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔'

جادوگر۔اس لفظ نے مجھے پھر چونکا دیا تھا۔ہم تینوں اس وقت بیمار اور نفسیاتی مریض نظر آرہے تھے۔ایسے مریض، جنہیں بہت آسانی سے کبھی شکار کیا گیا اور لاکھوں کی تعداد میں مار ڈالا گیا۔ مجھے احساس تھا، ایک ان دیکھی موت خاموشی سے ہماری طرف بڑھ رہی ہے اور ہمارے راستے کھو گئے ہیں۔

گیس چیمبر کا دروازہ آہستہ آہستہ ہمارے لیے کھولا جا رہا تھا۔ مجھے ان خیالوں سے باہر نکلنا تھا۔ اور مجھے امید تھی کہ تارا دیش پانڈے میرا انتظار کر رہی ہوگی۔

(۱۴)

ایک بیحد ناخوشگوار شام۔اور جیسا کہ مجھے پچھلے کچھ دنوں سے احساس تھا کہ کبھی کسی وقت بھی یہ حادثہ ہوسکتا ہے۔مگر محتاط رہنے کے باوجود یہ حادثہ ہو گیا تھا۔ کیفے ہاؤس میں تارا دیش پانڈے سے باتیں کرتے ہوئے نقلی دانت میز پر آگئے تھے۔سیکنڈ کی تاخیر کے بغیر میں نے دوبارہ ان دانتوں کو اپنے اصل دانتوں کے درمیان جوڑ لیا تھا۔مگر تارا دیش پانڈے کے لیے اتنا کافی تھا۔اس کی تیز نگاہیں بغور میرا جائزہ لے رہی تھیں۔

'دانت دھو تو لیے ہوتے......'

'ہو......ہو......' میں نے ہنسنے کی کوشش کی۔

'مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کے آگے کے دو دانت ٹوٹے ہوئے ہیں، تارا کی گدھ جیسی آنکھیں مجھ کو چبھ رہی تھیں—' دو ہی ٹوٹے ہیں نا......؟ یا اور بھی۔ جب آپ باتیں کرتے ہیں تو آپ کے پیلے دانتوں کے درمیان یہ دو دانت سفید ہیرے کی طرح چمک اٹھتے تھے۔میں نے پچھلی بار بھی سوچا تھا کہ آپ سے پوچھوں گی......'

'ہو......ہو......'

'واش روم کیوں نہیں چلے جاتے۔'دانت اور ہاتھ دونوں صاف کر لیجیے۔'

میں نے محسوس کیا، تارا دیش پانڈے کے چہرے کی ساری رومانیت اس کے چہرے سے گم ہو گئی تھی۔ واش روم سے واپس آنے تک تارا میں ایک نئی عورت پیدا ہو چکی تھی۔

'مجھے گھر جانا ہے۔'

بیگ ہلاتی ہوئی کچھ ہی سیکنڈ میں وہ سامنے کے دروازہ سے باہر نکل چکی تھی۔میرے لیے یہ کشمکش سے بھرے لمحے تھے۔ چہرے پر ایک ساتھ کئی رنگ آئے اور غائب ہو گئے۔مجھ کو احساس تھا، یہ حادثہ محتاط نہ رہنے کی وجہ سے ہوا ہے۔ دانت کے ڈاکٹر نے مشورہ بھی دیا تھا کہ ان دانتوں کی جگہ مضبوط اور پرمانٹ دانت لگوا لیجیے۔ یہ نقلی دانت کئی دنوں سے ہل رہے تھے بلکہ گھر میں گفتگو کے دوران کتنی

ہی باہر نکل کر میرے ہاتھوں میں آ گئے تھے۔ لیکن میں باہر کی دنیا میں باتیں کرتے ہوئے کچھ زیادہ ہی احتیاط کا مظاہرہ کرتا تھا۔ اس لیے مطمئن بھی تھا کہ باہر کی میز پر خوبصورتی سے میں ایسے حادثوں کو ٹال سکتا ہوں۔

مگر اب یہ حادثہ ہو چکا تھا۔ میں اس بیہودہ لمحے سے باہر نکلنے کے لیے کوئی اچھا سا گیت گنگنانے کا خواہشمند تھا۔ مگر گیت بھی جیسے اس لمحے میرے ہونٹوں تک آنے کا راستہ بھول گئے تھے......

میز سے اٹھنے تک میری رومانی دنیا ایک مضحکہ خیز دنیا میں تبدیل ہو چکی تھی۔

مجھ کو اپنے دوست سبحان علی کی بات یاد آ رہی تھی۔

'بزرگ ہوتا آدمی ایک جوکر ہوتا ہے۔ بلکہ جوکر سے زیادہ۔ اپنی بزرگی چھپانے کے لیے چور دروازے سے جوان بننے کی کوشش میں اس کا وجود کسی مسخرے سے زیادہ نہیں ہوتا۔ بزرگی چھپانے کی چیز نہیں ہوتی۔ اب آئی ہے تو قبول بھی کرو۔'

لیکن میرا مسئلہ اور تھا۔ میرے اندر کی کائنات میں ایک ایسی رومانی سلطنت موجود تھی، جس سے الگ کی زندگی کا تصور کر پانا بھی میرے لیے مشکل تھا۔ اس لیے میں مطمئن تھا کہ آگے کے ۲۰۔۱۵ برسوں تک میں اس بزرگی بھرے احساس کو بڑی خوبصورتی سے ٹال سکتا ہوں۔ اور یہ ۲۰۔۱۵ برس کم نہیں ہوتے۔

.......اور اسی لیے میری اپنی دنیا میں وہ سب کچھ تھا جو میرے بیٹے یا کسی بیس پچیس سال کے جوان کے پاس ہوتا ہے۔ میں اس زندگی سے خوش تھا۔ انٹرنیٹ، فون اور سوشل میڈیا کی اس زندگی میں خود کو جوان بنائے رکھنے کا ہنر میرے پاس تھا۔ اسی لیے تارادیش پانڈے کے جانے یا ناراض ہونے سے مجھ کو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ اور سبحان علی کے لفظوں میں، ایک تارادیش پانڈے جائیں گی تو دوسری آ جائیں گی۔ میں نے دل کے دروازے کھلے رکھے تھے......

لیکن تارادیش پانڈے کے جانے سے فرق تو پڑا تھا....اور یہ اصلیت میرے علم میں تھی کہ دو ایک برس میں یہ رشتے محبت کی حدود سے کہیں آگے نکل چکے تھے۔ لیکن مکالمے کی حد تک۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسے مکالمے اب اخلاقیات کی دیوار کو توڑتے ہوئے جسم تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور تارادیش پانڈے کی فون پر الجھی ہوئی سانسیں ان حدود کے ٹوٹنے کا برا بھی نہیں مانتی تھیں اور مجھ کو یقین تھا، ایک دن مکالموں کے اسی چور دروازے سے تارادیش پانڈے کے جسم تک پہنچا جا سکتا ہے۔ لیکن محبت کے احساس کو خوشگوار بنانے والی رسم ہونٹوں کے سہارے بوسے تک پہنچتی ہے....اور بوسے کی رسم میں اکثر ہیرے موتی کی طرح جھانکتے شفاف دانتوں کی قطار بھی آتی ہے—

تارادیش پانڈے کی نظروں میں صرف یہ نقلی دانت نہیں تھے بلکہ رومانی احساس کے گلشن میں اچانک ہونے والا دھماکہ بھی تھا جس نے ایک ساتھ کئی حملے کیے تھے۔ ایک تو اندر کے خوشنما رومانی احساس پر خزاں حاوی ہو گئی۔ بلکہ نقلی دانتوں کے تصور سے ہی اچانک وہ شخص برسوں کا بیمار اور بزرگ نظر آنے لگا، کچھ دیر پہلے تک جس کے ساتھ وہ حسین رومانی وادیوں کی سیر میں گم تھی۔ میں اس سے زیادہ اس حادثے کا تجزیہ نہیں کر سکتا تھا۔ اور میں نے یہ بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ آئندہ تارادیش پانڈے سے بات نہیں کروں گا۔

کبھی کبھی ہم جو سوچتے ہیں، ہوتا اس کے برعکس ہے۔ دوسرے دن صبح ہی صبح اچانک تارادیش پانڈے کا فون آ گیا۔

'ابھی ملو......'

'لیکن کہاں—اور کیوں......؟'

’مجھے نہیں معلوم۔ بس آ جاؤ۔‘
’ٹھیک ہے......‘

بارہ بجے کا وقت ہوگا۔ ایک نارمل، پرسکون صبح۔ لیکن یہ سکون تارادیش پانڈے کے چہرے سے غائب تھا۔ آمنے سامنے کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے اس کے چہرے کی کشمکش کا جائزہ لیا جاسکتا تھا۔
اس کی آنکھوں میں خوف تھا۔ جسم میں تھرتھراہٹ تھی۔ وہ اچانک میری کی طرف گھومی۔
’اچھا بتاؤ۔ میری عمر کیا ہوگی۔؟‘
’اب یہ عمر کہاں سے آ گئی—؟‘
’آئی ہے—‘ تارادیش زور سے چلائی۔ آئی ہے عمر۔ اور یو نو۔ میں کل رات......سو نہیں پائی۔ ساری رات جاگتی رہی......‘
’مگر کیوں......؟‘
’وہ تمہارے دانت......‘ وہ کہتے کہتے رک گئی۔ کیا میرے چہرے پر جھرّیاں ہیں؟
نہیں تو......
یہ دانت دیکھو میرے......اس نے دہانہ کھول دیا......کیا میرے دانت پیلے ہیں؟ ٹوٹے ہوئے......یا چمکتے ہیرے کی طرح آب دار......؟
’یہ سب کیا ہے تارا......؟‘
’نہیں جواب دو مجھے۔‘ تارا نے سن گلاس آنکھوں سے نکال کر میز پر رکھ دیا۔ اب میری آنکھیں دیکھو۔ خدا کے لیے دیکھو۔ مذاق مت بناؤ میرا۔ اور بتاؤ۔ کیا یہ آنکھیں خوبصورت اور گہری نہیں۔؟‘
’ہیں۔ بہت گہری ہیں۔ اور دانت بھی۔ جیسے سفید موتیوں کی قطار ہوتی ہے۔
’اور میرا جسم......؟‘
تارادیش پانڈے کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ مجھے غور سے دیکھو......میرا جسم بولتا ہے نا؟ چیختا ہے نا......؟ کسی بوڑھی عورت کا جسم تو نہیں لگتا یہ......؟‘
’بالکل بھی نہیں......‘
’ہونہہ—‘ تارا نے گہرا سانس لیا۔ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کی کشمکش اب بھی جاری تھی......میں ساری رات سو نہیں پائی۔ جانتے ہو کیوں......تمہاری وجہ سے......چشمہ اتارو۔
’کیا۔ میرے لیے یہ چونکنے کا لمحہ تھا۔ چشمے کے اندر میری آنکھیں بے حد کمزور لگتی تھیں— مجھے اپنا فیصلہ معلوم تھا۔ میں نے ٹکا سا جواب سنایا۔
’نہیں اتار سکتا۔‘
’جانتی تھی۔‘ تارادیش پانڈے نے ہنسنے کی کوشش کی۔ ’دانت ٹوٹے ہوئے۔ آنکھیں کمزور۔ سر پر کم سے کم ہوتے ہوئے بال......
رات بھر تمہاری موجودگی ایک بوڑھے ویمپائر کی موجودگی تھی، جو مجھ پر جھکا ہوا میرا خون چوس رہا تھا اور مجھے ابکائی آ رہی تھی۔‘

میں نے ایک زور کی ہلچل جسم میں محسوس کی—

'ایک وقت آتا ہے جب ہم اوریجنل ہوتے ہیں۔ سمجھ رہے ہونا۔ اوریجنل...... پھر جسم کی مشین میں کمزوری آجاتی ہے۔ اور جسم کو بحال رکھنے کے لیے ہم مصنوعی چیزیں لے آتے ہیں۔ جیسے نقلی بال......نقلی دانت......' تارا دیش پانڈے کا لہجہ کڑوا تھا— پھر نقلی ہوجاتے ہیں ہم...... پوری طرح سے نقلی......'

میرے لہجے میں کڑواہٹ تھی۔ تو تمہارے اس پورے مکالمے کا مقصد ہے کہ تم اوریجنل ہو۔ اور میں نقلی۔ ٹھہرو۔ تمہارے پہلے سوال کا جواب دے دوں۔ جسم اور مشین میں فرق ہوتا ہے تارا دیش پانڈے۔ ۱۵ ہزار کا ٹی وی بھی خراب ہوجائے تو پھینک نہیں دیتے۔ بلکہ ٹھیک کراتے ہیں۔ اور ٹی وی پھر سے کام کرنا شروع کردیتا ہے۔ رہی جسم کی بات۔ تو ہر انسان بیمار ہوتا ہے۔ علاج کراتا ہے اور اچھا ہوتا ہے نا......

تارا دیش پانڈے کی آنکھوں کا خوف برقرار تھا۔

'اور کتنی عمر ہوگی تمہاری تارا۔ ۴۰ سال؟ تو مجھ سے زیادہ نہیں صرف کچھ برس چھوٹی ہو۔ اور میرے جسم کے مقابلے تمہارے جسم نے تیزی کے ساتھ ڈھلنا شروع کیا ہے......میرا لہجہ سخت تھا— نہیں۔ غصہ مت ہو۔ عمر کے اس احساس کو سمجھو جس میں ہم تم دونوں داخل ہیں۔ یا جو بات مجھ پر صادق آتی ہے، وہ تم پر بھی آتی ہے تارا۔ بال کم ہونے، چشمہ پہننے یا آگے کے دو دانت کے ٹوٹ جانے کی وجہ سے میں نقلی نہیں ہوگیا۔ میں اوریجنل ہوں'

میں نے بادبان کی طرح دونوں ہاتھ کھول دیے۔ ایک جواں مرد۔ جواں جسم۔

'جس کا ایک جوان بیٹا ہو وہ جواں مرد نہیں ہوتا'

'یہ کس نے کہہ دیا کہ بیٹا جوان ہوجائے تو باپ بوڑھا ہوجاتا ہے......' میرے چہرے پر اب شرارت کے سرخ رنگ نمودار ہوئے۔ آگے بڑھ کر میں نے تارا کی معصوم ہتھیلیوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا......

'میری انگلیوں کی تپش سارے جسم میں محسوس کرسکتی ہو تم......اور دیکھو......دو ہی سیکنڈ میں تمہارے ہاتھ بھی جلنے لگے......'

تارا نے تیزی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا......

'اگر کچھ اوریجنل ہے تو وہ میرا اور تمہارا احساس ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ذہن میں اٹھنے والے بیمار سوالوں سے تم اپنے احساس کو بوڑھا کررہی ہو......'

میں نے آگے بڑھ کر تارا دیش پانڈے کے ہاتھوں کو تھام لیا اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

'چلو چلتے ہیں۔ اور ہاں سنو......جیسے میرے بیٹے کے پاس اڑان کے لیے یہ پورا آسمان موجود ہے، ویسے ہی یہ آسمان میرے لیے بھی ہے......'

سڑک پر ٹریفک کا شور تھا۔ میں نے اب بھی تارا کے ہاتھوں کو تھاما ہوا تھا۔ تارا نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی۔ میں مطمئن تھا۔ اور طمانیت کے اس احساس کو اب میرے چہرے پر بہ آسانی پڑھا جاسکتا تھا—

تارا کے نازک ہاتھوں کو تھامے ہوئے میرے احساس میں ایک نوجوان، رومانی احساسات والے آدمی کی آمد ہوچکی تھی۔ میں ان بہت ساری آنکھوں سے بے نیاز تھا، جو شاید میری طرف دیکھ رہے تھے......

چلتے چلتے تارا ایک لمحے کے لیے رکی—
'اگر مان لو، اس وقت تمہارا بیٹا یہاں آجائے تو......'
'کوئی بات نہیں۔'
'مان لو۔ وہ کہیں ہو......اور وہ ہمیں دیکھ بھی رہا ہو......'
میں نے سر کو جھٹکا دیا۔ 'کوئی بات نہیں۔'
اس بار میرے چہرے پر مسکراہٹ تھی......اور مان لو......اس وقت تمہارا شوہر یہاں آجائے تو......'
تارا دیش پانڈے کوئی بات نہیں...... کہتے کہتے ٹھہر گئی۔ اس کی طرف شرارتی نظروں سے دیکھا......ناٹی بوائے......
'اڑتے ہوئے ہم اتنا زیادہ کیوں سوچتے ہیں۔؟'
'پتہ نہیں۔'
تارا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ میرے ہسبنڈ دس دنوں بعد واپس آئیں گے۔ چلو میرے گھر......'
اس بار میں مسکرایا تھا۔ ناٹی گرل......'

دھوپ روشن تھی۔ عام طور پر روشن دھوپ میں کناٹ پلیس کے اس علاقے میں کسی گداز ہاتھ کو تھامے ہوئے چلنا اچھا لگتا ہے۔ مجھ کو احساس تھا، وہ بیحد چھوٹی ہتھیلیاں تھیں، جو میری ہتھیلیوں میں اس وقت پیوست ہوگئی تھیں۔ میں نے کانپتی انگلیوں کے لمس میں تارا کے اندرونی جذبات کی شدت کو پڑھ لیا تھا۔ اور یہی لمحہ تھا جب پارکنگ میں گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے، مونگ پھلیاں بیچتی ایک چھوٹی سی بچی میرے سامنے کھڑی ہوگئی تھی۔ میں مسکرایا۔ دس کا نوٹ بڑھایا۔ لڑکی کی پیٹھ تھپتھپائی اور اخبار کے کاغذ میں لپٹی ہوئی مونگ پھلی کو جیب کے حوالے کر دیا—

گاڑی چلاتے ہوئے تارا نے میری طرف دیکھا۔

'عورت میں ہر بار ایک نئی عورت آجاتی ہے۔ میرے ہونٹوں پر شرارت تھی—ایک ساتھ اتنی عورتوں کو ایک بے حد معصوم وجود میں تم لوگ کیسے جمع کر لیتی ہو......'

تارا دیش پانڈے کا گھر آ گیا تھا۔ اور آگے جو کچھ ہوا یا ہونے والا تھا میرے لیے اس کا تجزیہ کوئی مشکل نہیں تھا۔ میں ایک بے حد خوشنما لمحے کو اذیت پہنچا کر اپنے لیے سکون کا سامان بہم کرنا چاہتا تھا......

اور یہ وہی لمحہ تھا، جب تارا ڈر گئی تھی......

◆◆

اس وقت ٹاور کی دس منزلہ عمارت، بی مشن، جادوگر، میں تمام خیالوں سے دور نکل آیا تھا۔ میں ایک بہروپیا تھا اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ آگے کیا قیامت ہونے والی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کچھ دیر کے لیے میں سیاست کے زہر اور فاشزم کے طوفان سے باہر نکلنا چاہتا تھا۔ ایک ایسی دنیا، ان دنوں جہاں میں بھی قید تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں سب کچھ بھولنا چاہتا تھا۔ مگر یہ اندر کا ہمزاد ہوتا ہے، جو اکثر ایسے موقع پر بھی آپ کو گھیر کر سوال کرنا شروع کر دیتا ہے۔

میرا عکس میرے سامنے تھا۔ 'بے وفائی کر رہے ہو....'
' بالکل نہیں۔'
' کر رہے ہو۔'
' میں کچھ دیر کے لیے اپنی دنیا سے دور رہنا چاہتا ہوں۔'
' اچھا مذاق ہے جبکہ اس دنیا کا انتخاب بھی تم نے کیا ہے۔'
' مجبوریاں بھی ہوتی ہیں۔'
' سارہ کہہ چکی ہے کہ کوئی مجبوری نہیں۔'
' مگر مجبوری ہے۔ اور اسے قبول کرنا ہوگا۔'
عکس قہقہہ مار کر ہنسا۔ اب بہت کچھ قبول کرتے جا رہے ہو۔ نقلی دانت، مونگ پھلی کے چھلکے اور زندگی۔'
' نہیں۔'
' دراصل تم زندگی سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔'
ہمزاد غائب تھا۔ تارا کا گھر آ چکا تھا۔

شاید مجھ کو بھی ان بے چین کرنے والے لمحوں کا انتظار تھا۔ اور انتظار ہی نہیں تھا بلکہ اکثر خوابیدہ شب کے پراسرار سناٹے میں میں نے تارا دیش پانڈے کے جسم سے گونجتے گھنگھروؤں کی موسیقی سنی تھی۔ تب ایک برہنہ ساحرہ ڈھلتے ہوئے شب کے آخری پہر اپنی زلفیں کھولتی اور ناگن کی طرح لہراتی ہوئی میرے جسم کا حصہ بن جاتی......اور میرا خیال تھا، ندی کی طرح بہتے ہوئے محبت کا احساس ضروری ہے۔ یا اسے یوں کہہ لیں کہ محبت کے احساس کے بغیر جسم کے آبشار کی لذت ادھوری ہے......

اور اس وقت میں کمرے میں اکیلا تھا۔ تارا دیش پانڈے کا بیڈ روم۔ دیوار پر آویزاں شادی کے وقت کی ایک دھندلی سی تصویر...... ڈن لپ کا بستر......مجھ کو یاد تھا، میرے ایک دوست نے کبھی کسی زمانے میں عورت کے بدن کا موازنہ ڈن لپ کے اسی بستر سے کیا تھا۔ اور عورت اگر تارا دیش پانڈے ہو تو......ڈن لپ کے بے جان بستر سے بھی آگ کی شعاعیں نکلنی شروع ہو جاتی ہیں......

ایش ٹرے میں بجھی ہوئی سگریٹ کے ساتھ مونگ پھلیوں کے چھلکے بھر گئے تھے......میں آنکھوں کے پردے پر مونگ پھلیوں کی طرح تارا دیش پانڈے کے جسم کے چھلکے اتار رہا تھا......جسم میں آگ بھر گئی تھی...... بیڈ پر تارا کا لیپ ٹاپ پڑا تھا۔ میرے ہاتھوں کی انگلیاں لیپ ٹاپ پر ناچنے لگیں......ٹوئٹر پر میں نے اپنے نام آئے ہوئے کچھ میسیج پڑھے۔ پھر ٹوئٹ کیا......

'ایک بے رحم دوپہر، میرے لیے جلنے کا انتظام کر گئی ہے۔
'کیا لکھ رہے ہو......؟'

بڑی اداؤں کے ساتھ تارا دیش پانڈے نے اپنی بانہیں میرے گلے میں حمائل کر دیں......
'ایک بے رحم دوپہر...... پڑھتے ہوئے تارا کے ہونٹوں پر سبک سی مسکراہٹ لہرائی...... ناٹی بوائے......اور یہ وہی لمحہ تھا جب ایک گداز جسم ڈن لپ کے حسین گدے میں تبدیل ہو گیا تھا......
ایک سنامی لہر تھی...... جہاں لفظ گونگے تھے...... جہاں سسکیوں میں سانپ کی پھپھکار شامل تھی۔ میں اس لمحے انسان کی ردِعمل کی

نفسیات سے گزر رہا تھا۔ سنامی خاموش تھی۔ ہونٹوں پر ایک دلآویز بوسہ دے کر تارا بستر پر لیٹ گئی...... چت۔ سانسیں اب بھی کچھ دیر قبل آئی آندھی کی کہانی سناتی ہوئی۔

میں نے تارا کے برہنہ جسم کو غور سے دیکھا۔ اور پھر وہ ہوا، جس کے بارے میں شاید تارا دیش پانڈے نے بھی نہیں سوچا تھا۔

میں نے چشمہ اتارا اور میز پر رکھ دیا— چشمہ کے بغیر میری آنکھیں بیحد ڈراؤنی دکھتی تھیں۔ میں نے سنگار میز سے کنگھی اٹھائی اور سر کے آگے کے بالوں کو پیچھے کر دیا۔ اب آگے کا سر پوری طرح گنجا نظر آرہا تھا۔ میں یہیں نہیں رکا، اب ایک مرحلہ اور باقی تھا۔ میں نے آگے کے دو نقلی دانت نکالے اور انھیں بھی میز پر رکھ دیا— پھر سرعت سے تارا دیش پانڈے کی طرف گھوما۔ دہانہ کھولا اور بندر کی طرح منہ سے عجیب سی آواز نکالی......

تارا دیش پانڈے کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ زور سے چیخی۔ اسٹاپ...... بند کرو...... بند کرو......'

میں اپنے برہنہ جسم کے ساتھ آئینہ کے سامنے کھڑا تھا۔ بجھی ہوئی آنکھیں...... دو ٹوٹے دانت...... گنجا سر...... رومانٹک احساس کہیں کھو گیا تھا۔ ایک ہونق بوڑھا سامنے تھا— میں نے پلٹ کر دیکھا، تارا دیش پانڈے نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس کا جسم اب بھی کانپ رہا تھا—

دیکھو مجھے...... میں زور سے چیخا۔

'میں نہیں دیکھ سکتی۔'

'کیوں......؟'

'تم ایک Beast لگ رہے ہو......'

میں زور سے ہنسا۔ آگے بڑھ کر میں نے نقلی دانت اپنے دانتوں کے درمیان پھنسا لیا۔ چشمہ پہن لیا۔ کنگھی سے دوبارہ بال کے آگے کی جانب سنوار دیے۔ میں نے مسکرانے کی کوشش کی...... تارا دیش پانڈے نے اپنی آنکھیں کھول دیں......

'مائی گاڈ...... تم اس حال میں میرے پاس آتے تو......'

'آبشار کا بہنا تھم جاتا......؟'

'پرفیکٹ۔'

'لیکن کیوں......؟' اس بار میرے چہرے پر شکن تھی......

'نہیں جانتی......'

'ہم کسی بدنما چہرے کو گوارہ نہیں کرتے...... میرا لہجہ نپا تلا تھا......

'وہ انسان ہی کیوں نہ ہو...... ایک بدنما انسان...... مجھے یہ بدصورتی گوارہ نہیں— میں اکثر اپنے بیڈروم میں جب کوئی نہیں ہوتا، دروازہ بند کر کے خود کا جائزہ لیتا ہوں...... چشمے کے اندر سے جھانکتی میری آنکھیں جتنی جاندار لگتی ہیں، چشمے کے بغیر اتنی ہی بجھی ہوئی یا مردہ...... چھپکلی کی طرح...... پھر میں خود سے لڑتا ہوں۔ اور ردعمل کے طور پر اندر سے اس باغی کو دریافت کر لیتا ہوں جو بے حد خوبصورت اور پرکشش ہے۔ ساتھ ہی رومانی بھی—'

تارا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ بغور میرا جائزہ لے رہی تھی......

'تم اذیت پسند ہو......'

’کیوں......؟‘

’کیونکہ تم ہو— ابھی جو تم نے کیا۔ کیا اس کی ضرورت تھی—؟ میں نے تمہارے اس روپ کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اور نہ دیکھنا چاہتی تھی۔‘

’اور اسی لیے میں نے دکھایا...... میں نے اپنی ہتھیلیوں کو جنبش دی...... جیسے تمہارا...... یہاں...... یہاں......اور یہاں کا حصہ میں نہیں دیکھ سکتا......‘ میرے ہاتھ تارا کے جسم پر رینگ رہے تھے۔

’کیوں......؟‘

کیونکہ یہ بدنما ہیں۔ جیسے میرے دو نقلی دانت، چشمہ کے بغیر میری آنکھیں۔ رومانی ہوتے ہوئے ہم صرف ایک فنتاسی کی دنیا میں رہتے ہیں۔ کیونکہ حقیقت ظالم اور کریہہ ہے......‘

تارا نے نائٹی دوبارہ پہن لی تھی۔ اس کی پیشانی شکن آلود تھی......

’پھر بھی— تم میں وائلڈ نیس ہے۔‘

’حقیقت ہمیشہ وائلڈ ہوتی ہے۔ اور شاید اسی لیے حقیقت کو ہم جلد قبول نہیں کر پاتے۔‘

میں نے کپڑے پہن لیے تھے۔ کپڑے پہن کر پرانے جہانگیر مرزا کو میں نے وہیں چھوڑ دیا تھا۔ تارا دیش پانڈے کے کمرے میں۔ تارا کے رخسار کو Kiss کرنے کے بعد میں باہر نکل آیا تھا۔ اب میں ایک پرفیکٹ اور ذمہ دار باپ تھا۔ باہر آنے تک میرا لہجہ، انداز سب کچھ بدل چکا تھا۔ جیسے میں اپنے باپ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔، جوان دنوں میرے پاس ہی آئے ہوئے تھے اور میں نے سارہ کو تاکید کی تھی کہ وہ انہیں یہاں کے مذہبی مقامات کی سیر کرا دے جیسا کہ وہ چاہتے ہیں۔ مثال کے لیے اس وقت میں، اپنے بیٹے کی باغیانہ فطرت اور کیریر کو لے کر سوچ رہا تھا۔ مونگ پھلی کے کچھ دانے جیب میں اب بھی رہ گئے تھے۔ منڈلاتے کبوتروں کے آگے مونگ پھلی کے دانے اچھال کر میں آگے بڑھ گیا۔

◆◆

گھر میں واپس لوٹنے تک میری دنیا بدل چکی تھی۔ یہاں بیڈروم کے علاوہ میرا اپنا ایک کمرہ تھا جہاں میز کرسی کے علاوہ ایک بیڈ بھی تھا۔ میز پر پرانے زمانے کا ایک کمپیوٹر تھا، میں جسے بہت دنوں سے بدلنے کے لیے سوچ رہا تھا۔ یہ کمرہ میری اپنی دنیا تھی۔ جہاں مجھے بیڈروم سے زیادہ سکون ملتا تھا۔ میں اسی کمرے میں اپنی تنہائیاں شیئر کرتا تھا۔ میں نے تنہائی کی اس دنیا کو حسین تنہائیوں کا نام دیا تھا، جہاں لیپ ٹاپ پر ایک نئی دنیا کے دروازے میرے لیے کھل جاتے۔ پھر چیٹ فرینڈس تھیں، جس سے کافی کافی دیر تک میں چیٹ کیا کرتا۔ اور ایسے وقت میں محتاط رہتا کہ کہیں بیٹا کسی چور دروازے سے مجھ پر نظر تو نہیں رکھ رہا ہے۔

ہو......ہو...... جب یہ بات میں نے اپنے دوست سبحان علی کو بتائی تھی تو وہ قہقہہ مار کر ہنسا تھا۔

تم ہنسے کیوں؟ میں نے پوچھا۔

سبحان علی سنجیدہ تھا۔ بچوں سے ڈرنا پڑتا ہے۔ وقت کتنا بدل گیا۔ ہم چھوٹے تھے تو ماں باپ سے ڈرتے تھے اور ماں باپ ہم پر نظریں رکھتے تھے کہ کہیں ہم کچھ غلط تو نہیں کرنے جا رہے......‘

’ہاں۔ وقت وقت کی بات—‘ میں بھی سنجیدہ تھا۔ آج بچوں کو ہماری طرف سے کھلی چھوٹ ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں، بچے جوان

ہو رہے ہیں تو وہ اڑیں گے ہی مگر یہی بات بچے ہمارے لیے بھول جاتے ہیں۔ بچے نظر رکھتے ہیں کہ باپ کہاں جا رہا ہے؟ کس سے چیٹ کر رہا ہے۔ سیکس یا ہاٹ چیٹ تو نہیں کر رہا۔ فیس بک میں باپ کی کتنی فرینڈس ہیں۔ فون پر باتیں کرو تب بھی بچے اپنے کان کھلے رکھتے ہیں۔'

'تو تم اسے کان کہتے ہو.....' سبحان علی نے ہنسنے کی کوشش کی مگر گہری سنجیدگی نے یہ موقع اس سے چھین لیا تھا۔ ہم شاید ایک بیوی سے کچھ زیادہ چاہتے ہیں۔ یا ایک بیوی سے ہمارا دل نہیں بھرتا۔ ہماری عمر میں ہمارے ماں باپ ایسی خواہشوں کو دفن کر چکے ہوتے تھے۔ ہم نہیں کر سکتے— ہمارے لیے جسم کے اندر موجود، دہکتی آگ کی بھٹی کو سلا دینا آسان نہیں ہے۔ اور اسی لیے شاید ہم کچھ زیادہ ہی چاہتے ہیں۔ یا ہماری مانگ جسم سے کہیں زیادہ آگے کی ہوتی ہے۔'

میں گنگناتے ہوئے ہوئے باہر نکلا۔ پاشا مرزا کسی سے موبائل پر گفتگو میں مصروف تھا۔ میں نے اس کے کندھے تھپتھپائے۔ یہ میرے پیار کا انداز تھا۔ میں نے کچن سے آتی ہوئی اپنی بیوی کی طرف دیکھا، جو باہر نکلتے ہوئے مجھے دیکھ کر شاید تھوڑا سا مسکرائی تھی— میں آگے بڑھا تو دیکھا، پاشا کے دادا بالکنی میں کرسی پر بیٹھے کسی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے.....سب اپنی زندگی میں مصروف ہیں اور اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے.....اپنے کمرے میں دوبارہ واپس آنے تک اندھیری پرچھائیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ میری آنکھوں میں اتر چکا تھا—

' کیا یہ لوگ اپنی دنیا میں واقعی مصروف تھے.....؟ مجھ کو شک ہو رہا تھا۔ کہیں سارہ اس لیے تو نہیں مسکرائی کہ میری چوری پکڑی گئی ہے۔ اور پاشا نے موبائل پر گفتگو کرتے ہوئے مجھے نظر انداز کیا ہو— اور میرے باپ.....؟ دراصل وہ بھی کتاب نہیں پڑھ رہے تھے بلکہ مجھے نظر انداز کر رہے تھے......

میں اب ایک سہمی ہوئی دنیا میں تھا۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ اب اکثر اس دنیا کے دروازے میرے لیے کھل جاتے تھے— اور جب جب ایسا ہوتا میں خود کو اس دنیا سے باہر نکالنے کی کوشش کرتا۔

سارہ کی مسکراہٹ ابھی بھی مجھ کو پریشان کر رہی تھی۔ میں جانتا تھا، سارہ مجھ سے خوش نہیں ہے۔ کچھ دیر آنکھیں بند کیے میں اپنی کرسی پر بیٹھا رہا۔ اچانک کسی کی آہٹ سے میں چونک گیا۔ ابا اخبار لے کر سیدھے میرے کمرے میں آ گئے تھے۔

' تم ان خبروں کو پڑھ رہے ہو نا...'

' جی۔'

' پاشا اب بڑے ہو گئے ہیں۔'

' جی۔'

' ایک دن ہمارے زمانے گزر جاتے ہیں۔ اور بچوں کے زمانے آ جاتے ہیں۔'

' جی۔'

اب بھی وقت ہے۔ پاشا کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ میرا کیا ہے۔ دو دن کے لیے ہوں پھر چلا جاؤں گا۔ مگر پاشا مرزا کی خاموشی مجھے خوفزدہ کر رہی ہے۔'

ابا حضور دوبارہ واپس لوٹ گئے۔ تارادیش پانڈے کا چہرہ اوجھل تھا۔ رات کا سایہ گھنا ہو گیا تھا۔ مجھے اس اندھیری رات سے الجھن ہو رہی تھی۔

میں نے خاموشی سے ڈارکی کھولی اور لکھنا شروع کیا.... میرے پاشا بیٹے۔ میں چاہتا تو زندگی کے اس رنگ کو کبھی نہیں دکھاتا۔ یہ دکھانا ضروری بھی نہیں تھا۔ میں بہت آسانی سے یہ رنگ تم سے پوشیدہ رکھ سکتا تھا۔ مگر حقیقت یہ بھی ہے کہ زندگی کے کسی لمحے چور دروازے سے کوئی نہ کوئی جانور ہمارے اندر دستک دیتا ہے اور ہم کچھ دیر کے لیے اس جانور کے غلام بن جاتے ہیں۔ انسان اپنی ایک زندگی میں ہزاروں اقسام کے جانوروں کو اپنے اندر پناہ دیتا ہے۔ ایک جانور میرے اندر بھی تھا۔ اور یہ جانور اس وقت آیا جب زرد آندھیاں تیز تھیں۔ کھڑکی کے باہر جامن اور بیل کے درخت آپس میں مل گئے تھے۔ سڑک کے پار مندر سے بھجن کی آوازیں آنی شروع ہوئی تھیں۔ اور سبحان علی کے گھر کے دروازے تک آ کر کچھ لوگ دبے قدموں سے واپس لوٹ جاتے تھے۔

(۱۵)

مولوی فرقان، ناظر قاسمی اور اور شاہنواز قادری اب سیاست اور میڈیا کا حصہ تھے۔ اب یہ ایسے چہرے تھے جو ہر ڈبیٹ میں بلائے جاتے تھے۔ سوشل ویب سائٹس پر مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ ان سے ناراض رہتا تھا پھر یہ معاملہ اتنا بڑھا کہ مسلم تنظیمیں بھی ان کی مخالفت میں آ گئیں۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ ان باتوں سے مولوی فرقان، ناظر اور شاہنواز قادری کو کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ عاصم نورانی اور الیاس معروفی کو کمپوزنگ کے علاوہ کچھ اور ذمہ داریاں دی گئی تھیں۔ سلیم عباسی اور مونس رضا کا رخ بھی یہی تھا کہ بی مشن انہیں بھی سیاست میں لانے کے دروازے کھولے۔ میری دلچسپی انیس جامعی میں زیادہ تھی۔ جو عام طور پر خاموش رہتا تھا۔ زرین زیادہ تر اپنے کام میں مشغول رہتی تھی۔ جن چیتنا کے دو شمارے میری موجودگی میں شائع ہو چکے تھے۔ میں آہستہ آہستہ یہاں کے نظام سے واقف ہو گیا تھا۔ یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ بظاہر سیدھے سادے شریف نظر آنے والے لوگ ایک ایسی سیاست کا حصہ تھے جو ایک مخصوص مذہب کے خلاف نفرت اور تشدد پھیلانے کا کام کر رہے تھے اور اب ہمارا محکمہ بھی اس کام میں شامل تھا۔ میں انیس جامعی کے ساتھ کچھ دیر بیٹھنے کا خواہشمند تھا۔ مگر اس کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ کچھ باتوں کو سمجھنا مشکل نہیں تھا۔ آدھار کارڈ کے ذریعہ عام شہریوں کی تمام تفصیلات حکومت کے پاس موجود تھیں۔ اور حکومت کسی کا بھی ریکارڈ چیک کر سکتی تھی۔ ہر شاخ ایک دوسری شاخ سے منسلک تھی۔ اس طرح ایک آدمی کے ریکارڈ دوسری شاخ تک آسانی سے پہنچ جاتے تھے۔ بی مشن سے کچھ بھی اوجھل نہیں تھا۔ اس طرح ہر وہ شخص جو بی مشن کے ساتھ نہیں تھا، بی مشن اس پر نظر رکھ سکتا تھا۔ یہ شاخیں سوشل ویب سائٹس پر ملک سے باہر بھی پھیل چکی تھیں۔ انیس جامعی نے گفتگو کے دوران کچھ بھی بولنے سے پرہیز کیا۔ اس نے صرف اتنا بتایا کہ ذریں سے بچ کر رہیے گا۔ وہ جو نظر آتی ہے، وہ ہے نہیں۔ اس کے مراسم دور تک ہیں۔

میں اب اس نظام سے باہر نکلنا چاہتا تھا۔ تین ماہ ہو چکے تھے۔ اس درمیان باہر کی دنیا میں بھی یہ بات پھیل چکی تھی کہ میں بی مشن کے لیے کام کر رہا ہوں۔ مجھے اندازہ تھا کہ مخالفت کرنے والوں کو جواب دینا آسان نہیں ہوگا۔ منہ بند کرنے میں ہی بھلائی ہے۔ نجف گڑھ کے قریب کی مسجد پر کچھ دہشت گردوں نے حملہ کیا تھا۔ ایک قبرستان کی چہار دیواری توڑ دی گئی تھی۔ کچھ لوگوں کو زندہ جلا دیا گیا تھا۔ ملک کے مختلف حصوں میں وارداتیں جاری تھیں۔ مغل پورہ میں جس وقت بم حادثہ ہوا، وہاں سے کچھ دوری پر جادوگر کی گاڑی کو بھی دیکھا گیا۔ لیکن اب اس طرح کے حادثے معمولی حادثوں سے زیادہ معنی نہیں رکھتے تھے۔ کیونکہ ایسے حادثے مسلسل ہو رہے تھے۔
زرین اکثر آفس سے غائب ہو جاتی۔ پھر دو ایک گھنٹے بعد واپس آ جاتی۔ ادھر کچھ دنوں سے وہ گھبرائی گھبرائی بھی رہنے لگی تھی۔ ایک

دن راکیش وید نے بھی اسے اپنے کیبن میں بلوایا تھا۔ وہاں سے لوٹنے کے بعد زرین کچھ زیادہ ہی پریشان نظر آنے لگی تھی۔ اب ٹاور کا یہ دسواں مالہ مجھے ایک ایسا مقام نظر آ رہا تھا، جہاں سے سازشوں کی داغ بیل رکھی جاتی ہے۔ راکیش وید نے مجھے بھی بلا کر ہدایت کی تھی کہ اب آپ سے ضروری کام لیے جا سکتے ہیں۔ میں نے صرف اتنا کہا کہ میں بیمار رہنے لگا ہوں۔ میری صحت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ کوئی ذمہ داری بھرا کام سنبھال سکوں۔ راکیش وید نے مسکرا کر میری طرف دیکھ کر کہا، آپ کو صحت مند رکھنا ہی ہمارا کام ہے۔ آم کھایئے، گٹھلیاں مت دیکھیے۔ اب میں شدت کے ساتھ سوچنے لگا تھا کہ جیسے بھی ممکن ہو، مجھے اس نظام سے باہر نکلنا ہے۔

راکیش وید سے ملنے کے چوتھے دن جب عمارت کے قریب آیا تو میں نے دیکھا کہ زرین تیز تیز دوڑتی ہوئی آ رہی ہے۔ لفٹ کے قریب کوئی نہیں تھا۔ اس نے تیز تیز چلتی ہوئی سانسوں کو برابر کیا۔ اچانک اس کی نظر میری طرف گئی۔ مجھے دیکھ کر وہ ضرورت سے زیادہ گھبرا گئی۔ لفٹ نیچے آئی تو وہ خاموش تھی۔ دسویں مالہ تک ہم دونوں خاموش رہے۔ مگر اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ زریں کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آیا ہے۔ زرین کچھ دیر تک ٹائپ کرتی رہی پھر اٹھ کر کیبن کی طرف چلی گئی۔ میرے نزدیک راکیش وید کا کیبن ایک بلاسٹ روم تھا، جہاں خاموشی سے دھماکے تیار کیے جاتے تھے۔ اس کمرے سے ماسٹر مائنڈ اور برین تیار کیے جاتے تھے۔ دو ایک بار میں نے دبی زبان سے زرین سے اس کی پریشانی کے بارے میں پوچھنا چاہا مگر وہ ایک مجسمہ کی طرح خاموش رہی۔ اس کے بعد میں نے زیادہ بات کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ مگر اس کے اندر کی خاموشی بتا رہی تھی کہ کبھی بھی اس کے اندر کا بارود دھماکہ کر سکتا ہے۔

سات بجے میں گھر آ گیا۔ کالونی کے پاس خاموشی چھائی تھی۔ گھر کے دروازے پر پہنچ کر بیل بجائی۔ دروازہ پاشا مرزا نے کھولا۔ وہ اس وقت غصے میں نظر آ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہوئے خاموش رہے۔ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ فریش ہونے کے بعد میں ریڈنگ روم میں واپس آ گیا۔ بی مشن کے بڑھتے اثرات کو محسوس کرتے ہوئے میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب میں اس مشن سے الگ ہو جاؤں گا۔ اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ یہ شریف لوگ اب جلد میرا استعمال کرنے والے ہیں۔ اور میں اس استعمال کے لیے تیار نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد پاشا مرزا کمرے میں داخل ہوئے۔ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ ان کا انداز جارحانہ تھا۔ کچھ دیر وہ میری طرف دیکھتے رہے۔ پھر غصے میں بولے

'یہ آج کل آپ کہاں جا رہے ہیں۔'

میں خاموش رہا۔ میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

'آپ اچھا نہیں کر رہے۔' پاشا مرزا کا لہجہ سخت تھا۔ آپ کے اندر ایک ہی خاصیت تھی۔ وہ بھی آپ نے گروی رکھ دی۔

میرا لہجہ کمزور تھا۔ میں اس نظام کو سمجھنا چاہتا تھا۔

'یہ سسٹم اب تک سمجھ میں نہیں آیا؟' پاشا مرزا ہنسے۔ 'اخبار، ٹی وی، میڈیا کون بلاک کر رہا ہے ہمیں۔ سسٹم کو سمجھنے کے لیے سسٹم کا حصہ بننے کی ضرورت نہیں تھی۔ آپ نے خود کو فروخت کر دیا۔'

میں نے پاشا کا چہرہ دیکھا۔ اس کے اندر کی ساری نفرت اس کے چہرے پر آ گئی تھی۔ اس کے بعد وہ خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔

باہر کتے بھونک رہے تھے۔ کچھ عجیب سی آوازیں تھیں۔ جو کمرے میں گونج رہی تھیں۔

کیا یہ میں ہوں؟ مجھ پر ہذیان کی کیفیت طاری ہے۔ کیا قدرت کے کارخانے نے مجھے ٹھوکر کھانے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ یہی وہ لمحہ تھا، جب سارہ اچانک چیخ کر اٹھی۔ رات کا آدھا پہر گزر چکا تھا۔

'سارہ چیخ رہی تھی۔ تم نے دیکھا۔ سنگھار دان نے پیچھے کوئی ہے۔ میں نے آہٹ سنی ہے۔

'تمہارا وہم ہے۔'

'وہم نہیں کوئی ہے۔' وہ پھر چیخی۔

'کہاں کوئی ہے؟' میں زیادہ زور سے چیخا۔

'کوئی ہے، جو ہمارے گھر، ہمارے کمرے تک آ گیا ہے۔'

سارہ خوف سے کانپ رہی تھی۔ اسے تم بھی جانتے ہو لیکن تم بات کرنے کو تیار نہیں ہو۔ سن رہے ہو تم، ہم اچھے دنوں کے انتظار میں ہلاک کیے جا رہے ہیں۔ کوئی نہیں بچے گا.....'

'تم پاگل ہو گئی ہو۔'

سارہ نے خوفزدہ ہو کر میری طرف دیکھا۔ 'اس وقت کون پاگل نہیں ہے۔ پاگل بنایا جا رہا ہے۔ بلی آنکھیں دکھاتی ہے۔ چوہوں نے ڈرنا چھوڑ دیا ہے۔ دن اور رات بدل گئے ہیں۔ فریج میں رکھے سامان یا تو بدل جاتے ہیں یا غائب ہو جاتے ہیں۔ ہر جگہ ہم پر شک کیا جاتا ہے۔ اور اس ملک کی ۵۰ فیصد سے زیادہ پولیس ہمیں قابل اعتبار نہیں سمجھتی۔'

کھڑکی سے باہر آسمان سرخ نظر آ رہا تھا۔

میں نے آہستہ سے کہا۔ 'باہر آسمان سرخ ہے۔ اور یہاں زمین ڈول رہی ہے۔ ہم کبھی بھی گر سکتے ہیں مگر ہمارے پاس کوئی علاج نہیں۔'

◆◆

رات کب کیسے گزر گئی، پتہ بھی نہیں چلا۔ آسمان پر سرخی نمودار ہو چکی تھی۔ مندر سے بھجن کی آوازیں آنی شروع ہو گئی تھیں۔ سات بجے کا وقت ہوگا کہ میں اچانک بیل کی آواز سن کر چونک پڑا۔ دروازہ کھولا تو سامنے سہمی ہوئی زرین کھڑی تھی۔

'تم۔'

'جلدی سے دروازہ بند کر لیجیے۔ ممکن ہے میرا پیچھا کیا جا رہا ہو۔'

ہم ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ زرین دیر تک اپنی تیز چلتی ہوئی سانسوں کو برابر کرتی رہی۔ مجھے اپنے ماتحت کام کرنے والوں کی باتیں یاد آ رہی تھیں کہ زرین پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت ایک سہمی ہوئی لڑکی میرے سامنے تھی۔ چہرہ زرد اور ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے زندگی کا رس اس کے وجود سے نچوڑ دیا گیا ہو۔ میں نے پانی کا گلاس بڑھایا۔ زرین نے ایک سانس میں گلاس خالی کر دیا۔ میری طرف دیکھا اور پوچھا۔

'آپ کتنا جانتے ہیں میرے بارے میں۔'

'شاید کچھ بھی نہیں جانتا۔'

'کسی سے دریافت کیا ہوگا؟'

'نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں پڑی۔ مگر تم اس وقت؟'

'مجھے کبھی بھی ہلاک کیا جا سکتا ہے۔' زرین نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

وہ رو رہی تھی۔ یہاں کوئی بھی محفوظ نہیں۔ آپ بھی نہیں۔ ہم جنہیں اپنا سمجھتے ہیں، وہ ہمارے نہیں۔ سب بھیس بدلے ہوئے بہروپیے ہیں۔ دن رات ہم پر نظر رکھی جاتی ہے۔ اور مجھے یقین ہے، کہ ابھی بھی، میں یہاں آئی ہوں، یہ بات ان لوگوں کو معلوم

ہوگی۔'

' لیکن کیسے؟'

' ریکٹ۔ایک بہت بڑا ریکٹ۔میں ان کی بہت ساری باتیں جان گئی ہوں۔اس لیے آپ کو کچھ بتانا چاہتی ہوں۔'

زرین غور سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔اس نے اپنے آنسوؤں کو خشک کیا۔میری طرف دیکھا اور کہا۔' میں قاری محمد افضل کی بیٹی ہوں۔'

' جو ماب لنچنگ میں مارے گئے تھے؟'

' جی ہاں۔ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک ہجوم نے بے دردی سے قتل کر دیا۔پولیس نے پورے معاملے کو دبا دیا۔جبکہ شہادتیں تھیں، ویڈیو تھا۔کیس دفعہ ۳۰۴ کے تحت درج کیا گیا۔جبکہ مجرموں پر دفعہ ۳۰۲ لگنی چاہیے تھی۔انہیں اسپتال لے جایا گیا لیکن راستے میں ہی انہوں نے دم توڑ دیا۔

مجرم آزاد ہو گئے۔گھر پر ایک میں ہوں، ایک میری بوڑھی ماں ہے۔میں انتقام لینا چاہتی تھی۔اور میں نے اس کی قیمت بھی چکائی۔'

' زرین نے سر جھکا لیا۔میں بی مشن کا حصہ بن گئی۔ان کا مہرہ بن کر میں لگاتار الگ الگ لوگوں سے مل رہی تھی یا مجھے الگ الگ لوگوں کے پاس بھیجا جا رہا تھا۔حالات وہ نہیں ہیں، جو نظر آتے ہیں۔حالات اس سے کہیں زیادہ سنگین ہیں، جتنا میں جان چکی ہوں۔'

اس نے میری طرف دیکھا۔' فرقان، ناظر قاسمی، شاہنواز قادری، ان لوگوں کے بارے میں کیا جانتے ہیں آپ؟ یہی کہ یہ لوگ مسلمان ہیں۔یہ موساد کے آدمی ہیں۔موساد کے لیے کام کرتے ہیں اور ان میں سے کسی کے پاس پیسوں کی کمی نہیں۔میں نے فرقان کے بارے میں بہت سی تفصیلات حاصل کی تھیں۔میں نے کئی بار اس کا پیچھا کیا۔اس کو باضابطہ تربیت دی گئی ہے۔اور وہ جھوٹا آدمی ہے۔وہ مسلمان نہیں ہے۔'

میرا چہرہ فق تھا۔' یہ بات تم اتنے اعتماد سے کیسے کہہ سکتی ہو۔؟'

' فرقان اس بات کو جان گیا تھا کہ میں اس کے بارے میں کچھ زیادہ ہی جان گئی ہوں۔میں ناظر اور قادری کے پیچھے بھی تھی۔آہستہ آہستہ مجھے ان کے رابطوں کا پتہ چلا۔سارے کھیل بہت ہوشیاری سے کھیلے جا رہے ہیں۔فرض کیجیے، ہماری اقلیتی آبادی کا دسواں حصہ آج ان کے ساتھ ہے تو یہ سمجھ لیجیے کہ آپ آزاد کہیں نہیں ہیں۔ہمارے لوگ ہی ان کی طاقت بن رہے ہیں۔پچھلی ۲۴ تاریخ کو میں نے ناظر کا پیچھا کیا وہ گیلارڈ ہوٹل میں ایک شخص سے ملا۔اس کے ساتھ قادری بھی تھا۔میں نے خاموشی سے اس کی تصویر لے لی۔یہ لوگ جس سے مل رہے تھے، وہ بھی موساد کا ایجنٹ تھا۔مشکل یہ ہے کہ ہمارے پاس میڈیا بھی نہیں۔تمام ایجنسیوں پر بی مشن کا قبضہ ہے۔میں انتقام لینا چاہتی تھی مگر میرے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔اس درمیان مجھے آشرم میں سوامی وینا مہاراج کے پاس بھیجا گیا۔شراب کے نشے میں، میں اس سے کچھ معلومات حاصل کر سکی۔وہ بی مشن کے لیے کام کرتا ہے اور اس نے بتایا کہ آگے چھ ماہ کے اندر ملک کے مختلف گوشوں میں فسادات کی آگ بھڑکے گی اور ہمارے ہزاروں لوگ ہلاک ہوں گے۔

اس نے یہ بھی کہا کہ آگے تمہارا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ایک وقت آئے گا جب ہم تمہیں ملک چھوڑنے یا ہلاک ہونے کے لیے وقت دیں گے۔میں نے مسکرا کر کہا، سوامی جی۔مگر میں تو آپ کے پاس رہوں گی۔وہ بولے۔تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔'

کچھ باتیں تھیں جو مجھے پریشان کر رہی تھیں۔انیس جامعی، فرقان، شاہنواز قادری اور ناظر قاسمی، ان سب کا لہجہ ایک جیسا تھا۔بات کرنے اور مکالمے کے انداز یکساں تھا۔شاید یہ ان کی تربیت کا بھی حصہ تھا کہ یہ تمام لوگ ایک جیسی زبانیں بولتے تھے۔ان سب نے

مجھے زرین سے ہوشیار رہنے کو کہا تھا۔ اور زرین اس وقت ان تینوں کی مخالفت میں بیان دے رہی تھی۔ ایک سوال تو یہ تھا کہ کیا زرین مجھ سے کچھ جاننا چاہتی ہے؟ یا جو کچھ وہ کہہ رہی ہے، اس پر آنکھیں موند کر اعتبار کیا جائے۔ ٹاور کے دسویں مالہ پر بیٹھے ان تمام لوگوں کو معلوم تھا کہ حالات انہیں کہاں لیے جا رہے ہیں۔ زرین کو محمد فرقان کے مسلمان ہونے پر بھی شک تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ پیچھا کرتے ہوئے اس کے پرانے گھر تک گئی تھی۔ وہاں محلے والوں سے علم ہوا کہ اس نام کا کوئی آدمی کبھی نہیں رہتا تھا۔ ایک بات اور تھی، زرین کو یہاں تک آنے اور مجھ سے ملنے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر وہ کسی طرح کے خطرے میں تھی، تو وہ یہاں آنے سے پرہیز بھی کر سکتی تھی۔ کچھ تو وجہ ہوگی کہ اس نے مجھ پر اعتبار کیا اور یہ تفصیلات مجھ تک پہنچانے کی کوشش کی۔ میں شک کے دائرے سے ابھی بھی باہر نہیں نکلا تھا۔ اور مجھے اس بات کا احساس تھا کہ زرین کچھ نہ کچھ مجھ سے چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس درمیان سارہ چائے اور ناشتہ کی پلیٹ رکھ کر چلی گئی۔

'تم کہہ رہی تھیں کہ ہم میں سے زیادہ تر لوگوں کو ملک چھوڑنا ہوگا؟'

'ہاں۔'

'اور تم یہ بھی کہہ رہی تھیں کہ وہ ہمیں ہلاک کرنے کے لیے وقت دیں گے، اس کا کیا مطلب ہے؟'

'آپ کو مرنے سے بچنے کے لیے موقع دیا جائے گا۔ یہاں اس ملک میں اسلام باقی کہاں بچا ہے۔ اور ان کے پاس کیا نہیں ہے۔ پورا ہندوستان ان کی مٹھی میں ہے۔ کسی خوش فہمی میں نہ رہیے۔ زندگی کا دائرہ تنگ کیا جا چکا ہے اور یہ دائرہ اتنا تنگ ہو جائے گا کہ وہ آرام سے آپ کو ہل میں جوت سکیں گے۔'

'ایسا نہیں ہوگا۔'

'یہ آپ کا وہم ہے۔ اس سے بھی برا ہوگا اور آپ دوسرے ملکوں کی داستان بھول جائیں گے۔' زرین حیدر کا لہجہ جذباتی تھا۔ ہم پر ۳۷۰ چنار کے درخت اور پاکستان کی تلوار لٹکا دی گئی۔ لٹکا اس لیے دی گئی کہ یا تو ہمارے سر کٹ جائیں یا پھر ہم اس بوجھ سے ہمیشہ دبے رہیں۔ ان دونوں سے ایک اور بھوت پیدا ہوا۔ راشٹریتا۔ قومیت۔ ہندو راشٹر واد۔ چنار کے درخت اور پاکستان کی سرحد جب تک آپ سے جڑی ہے، آپ راشٹر وادی نہیں ہیں۔ اور ایسا اس لیے کہ تقسیم کے لیے کوئی گناہگار ہے تو صرف مسلمان.... زرین کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ابا مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ میں انتقام تو لوں گی۔ مگر انتقام لینا آسان نہیں۔'

'کس سے انتقام لوگی؟'

اس بار زرین نے چہرہ اٹھایا۔ میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ چہرے پر نفرت سمٹ آئی تھی۔ 'ان لوگوں سے، جو اپنوں میں شمار ہوتے ہیں۔ پہلے اس گندگی کو صاف کرنا ہوگا۔ وہ گندگی جو ہمارے اپنوں کی وجہ سے ہے۔ ایسے لوگ جو اس راستے کو آسان بنا چکے ہیں۔ میں انہیں نہیں ماروں گی تو یہی لوگ میرا قتل کر دیں گے۔ میں یہی بتانے آئی ہوں کہ میرے ساتھ کبھی بھی کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ مگر میں ڈرتی نہیں ہوں۔ ابا ماب لنچنگ میں مارے گئے۔ کل میرا نمبر بھی آئے گا۔ میں ان لوگوں کو اندر سے سمجھ چکی ہوں۔ بی مشن کی ہر شاخ ایک لیبارٹری ہے جہاں ہمارے لیے نئے نئے دھماکے تیار کیے جا رہے ہیں۔'

اس کے بعد زرین رُکی نہیں۔ کچھ دیر بیٹھی اور چلی گئی۔ پہلا خیال یہی تھا کہ بی مشن نے ہر جگہ قبضہ کر لیا ہے۔ اور زرین کے ساتھ ساتھ کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی آئیڈیالوجی کے ذخیرے، حیات کے ہر شعبے میں منتقل کر دیے ہیں اور اب ان لوگوں سے جنگ آسان نہیں رہ گئی۔ کمیونسٹ پارٹی کا کوئی وجود نہیں رہا۔ دیگر سیاسی پارٹیاں حاشیہ پر ہیں اور اپنی شناخت بچانے کی کوشش کر رہی

ہیں اور اب کوئی بھی پارٹی اقلیتوں کے ساتھ وقت ضائع کرنا پسند نہیں کرتی۔ زرین نے اگر سچ بولا ہے تو اس کی جان کو واقعی خطرہ ہے۔ مگر زرین کس سے انتقام لینا چاہتی ہے، اس نے کھل کر اس کی وضاحت نہیں کی تھی۔ اس کے تیسرے روز ایک حادثہ ہوا۔ سڑک حادثے میں مولوی فرقان کی موت ہوگئی۔ اس موت پر چینل والوں نے کافی طوفان کھڑا کیا اور اس بات کا اشارہ کیا کہ مولوی فرقان سے مسلمان طبقہ خوش نہیں تھا۔ ممکن ہے، اس وجہ سے ان کی جان چلی گئی۔ کس نے ٹکر ماری، کیا ہوا، اس راز پر پردہ پڑا رہا۔ لیکن یہ کام زرین کر سکتی ہے، یہ دل قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔ زرین میٹرو میں سفر کرتی تھی۔ اس کے پاس کوئی کار نہیں تھی۔ وہ ایک معمولی سی لڑکی تھی اور اتنا بڑا خطرہ مول لینا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ سبحان علی کے مطابق، یہ کام مشن والوں کا ہے۔ ایسے لوگ جب مشن کے بارے میں بہت کچھ جان جاتے ہیں، تو مشن کے لیے خطرہ بن جاتے ہیں۔ مشن آسانی سے انہیں راستے سے ہٹا دیتا ہے۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ شاہنواز قادری اور ناظر قاسمی اپنی حد سے تجاوز نہیں کریں گے۔ کیونکہ اس کا انجام انہیں پتہ چل چکا ہے۔

میں نے سارہ کو بتا دیا تھا کہ میں استعفیٰ دینے جا رہا ہوں اور مجھے نہیں پتہ کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ وہ میرے فیصلے سے خوش تھی۔ ہم میں سے کوئی بھی اس انجام کی طرف نہیں سوچ رہا تھا، جس کی طرف ہم قدم بڑھا چکے تھے۔ اندھیرے سے جنگ مشکل نہیں۔ اس جنگ میں اکیلے آپ نہیں ہوتے۔ جب اندھیرا گہرا ہو جاتا ہے تو اس دھند میں آہستہ آہستہ بے شمار چہرے نظر آنے لگتے ہیں۔ میرا جسم پھر سکڑنے کی حالت میں تھا اور ممکن ہے، میں اس وقت کسی آکٹوپس میں تبدیل ہو جاتا، مگر میری خودداری نے ایسا ہونے سے روک دیا تھا۔ اب مجھے راکیش وید سے ملنا تھا اور اپنا فیصلہ سنانا تھا۔

(۱۶)

امریکہ میں بیٹھا ہوا آدمی ووٹ ہائی جیک اور ٹرانسپلانٹ کے قصے سنا رہا تھا۔ وہ ایک مسلمان تھا اور بتا رہا تھا کہ یہ سب کچھ بہت آسانی سے ممکن ہے۔ اتنی جلدی بچوں کے نیکر بھی نہیں بدلے جا سکتے۔ مدنی ہاؤس پر حملہ ہوا تھا۔ راجستھان میں کچھ زعفرانی شکاریوں نے ۱۵ شکار کیے تھے۔ ملک کی مختلف ریاستوں میں خونی کھیل جاری تھا۔ اور کچھ دانشوروں کے قتل کی وارداتیں بھی سامنے آئی تھیں۔ بی مشن کے لوگ اب مسلم علاقوں میں ممبرز بنانے کی پرچیاں لے کر گھوم رہے تھے اور اس وقت ان کے ممبرز کی تعداد ۷۰ کروڑ سے بھی زیادہ ہو چکی تھی۔ جادوگر کا کھیل شروع تھا۔ وہ عدالت کی سب سے بلند عمارت پر زعفرانی پرچم لہرا چکا تھا۔ الیکشن کمیشن، عدلیہ، ججز کی تقرری، انصاف اور فیصلے سب اس کی جیب میں تھے۔ وہ قانون بناتا تھا اور قانون توڑتا تھا۔ اور اسے روکنے والی سیاسی پارٹیوں کے ہونٹوں پر تالے پڑے ہوئے تھے۔ جس دن میں استعفیٰ دینے والا تھا اس سے ایک رات قبل ایک اور حادثہ سامنے آیا۔ شاہنواز قادری بھی محمد فرقان کی طرح سڑک حادثے میں مارا گیا۔ یہ دوسرا حادثہ تھا، جس کار نے اسے روندا، اس کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ پولیس کا نظام اس حد تک ناقص ہو سکتا ہے، اس کا ایک ثبوت یہ دونوں قتل بھی تھے۔ جبکہ ہر جگہ سی سی ٹی وی کیمرے لگے ہیں اور یہ دونوں قتل ایسی سڑک پر ہوئے جہاں عام طور پر بھیڑ بھاڑ رہتی ہے۔ میڈیا نے ایک بار پھر شور وغل مچایا اور اس معاملے کو بھی ختم کر دیا جائے گا۔ مجھے احساس تھا۔ مگر کیا دونوں قتل کے پیچھے زرین کا ہاتھ ہے، یہ ناممکن لگ رہا تھا۔ سبحان علی کی بات میں زیادہ وزن تھا کہ ایسے قتل کون کراتا ہے۔ اور ایسے قتل میں کس کا ہاتھ ہوتا ہے۔ توازن قائم رکھنے کے لیے یہ لوگ اپنے لوگوں کو بھی ہلاک کرتے ہیں۔ اور ایسا اس لیے کرتے ہیں کہ خوف کی سلطنت باقی رہے۔ اور اسی لیے سیاست کے تمام وزرا اس وقت محض کٹ پتلی تھے۔ اور ان کے خوشامدی بیان محض بی مشن کمپنی

کوخوش کرنے کے لیے دیے جاتے تھے۔

صبح ہی سڑک پر افراتفری کا ماحول تھا۔ ٹریفک رُک گیا تھا۔ پولیس والے ادھر ادھر دوڑ رہے تھے۔ کچھ دکانیں تھیں، جن کے شٹر جلدی جلدی گرائے جارہے تھے۔ سڑک پر ایک قطار سے گائیں گزر رہی تھیں۔ گایوں کو گزرنے کے لیے ایک طرف کا ٹریفک روک دیا گیا تھا۔ گائیں بڑی تعداد میں تھیں۔ بھیڑ سڑک کے کنارے ایک طرف جمع ہوگئی۔ گایوں کو راستہ دے دیا گیا۔ کچھ لوگ دکانوں کے درمیان سے نکلتی گلیوں کی طرف تیزی سے بھاگ رہے تھے اور چلا بھی رہے تھے۔

'بھاگو۔'

'ایک طرف ہو جاؤ۔'

'گائیں آ رہی ہیں۔

سڑک کے کنارے جو بھیڑ جمع تھی، وہ ان گایوں کو پرنام کررہی تھی وہیں دو پولیس اہلکار بھی تھے جنہوں نے ایک آدمی کو ہتھکڑی پہنا رکھی تھی۔ گایوں کے گزرنے کے بعد پولیس والے ان کو لے کر آگے بڑھ گئے۔ آگے ایک پولیس چوکی تھی، جو اس وقت ٹرائل کورٹ میں تبدیل ہوگئی تھی۔ چوکی میں اس وقت ایک ہیڈ کانسٹبل اور دو پولیس والے پہلے سے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دو پولیس والے اس آدمی کو لے کر چوکی میں حاضر ہوئے۔ یہ ایک دبلا پتلا آدمی تھا۔ کرتا پائجامہ پہن رکھا تھا۔ سر پر ٹوپی تھی اور ہلکی سی داڑھی بھی تھی۔ یہ آدمی بری طرح کانپ رہا تھا۔

ایک پولیس والے نے کہا۔ 'یہ کہتا ہے، اس قطار میں دو گائیں اس کی بھی تھیں۔'

'یہ کیسے ہوسکتا ہے۔' ہیڈ کانسٹبل نے داڑھی والے کا جائزہ لیا۔

'میری ہیں سرکار۔ میں اپنی گایوں کو پہچانتا ہوں۔'

'ان گایوں کو چارہ کھلاتے تھے۔'

'ہاں۔'

'پھر دودھ بھی نکالتے ہوں گے۔'

'ہاں۔ میرا یہی پیشہ ہے۔ اس سے میرا گھر چلتا ہے۔'

'کب سے؟'

'برسوں سے۔ میرے باپ بھی یہی کرتے تھے۔'

ہیڈ کانسٹبل نے غور سے داڑھی والے کو دیکھا۔ 'پھر تو گایوں کو ماتا بھی کہتے ہو گے۔'

'نہیں سرکار۔'

'پوجا تو ضرور کرتے ہوں گے۔'

'نہیں سرکار۔'

ہیڈ کانسٹبل کے چہرے پر حیرت تھی۔ ماتا بھی نہیں کہتے تھے۔ پوجا بھی نہیں کرتے تھے۔ پھر تو ضرور ہماری پوتر گایوں کو مار دیتے ہوں گے۔'

فیصلہ سنا دیا گیا۔ اس کو جیل لے جاؤ۔ اس کا فیصلہ بعد میں ہوگا۔ یہ آدمی گایوں کا قاتل ہے۔

دبلے پتلے آدمی کے روز گڑگڑانے کے باوجود اس کو ہتھکڑی پہنا کر دونوں پولیس والے گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ یہ سب میری آنکھوں کے سامنے ہوا تھا۔ بی مشن سے وابستہ افراد فیصلہ سنانے والی طاقتور ہستیوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ گایوں کے گزر جانے کے بعد راستہ صاف ہو گیا تھا۔ گایوں کے گلے میں گھنٹیاں ڈالی ہوئی تھیں، جس سے موسیقی کی آواز ابھرتی تھیں۔ کچھ لوگ ابھی بھی خوفزدہ تھے۔ سڑک پر ٹریفک شروع ہو گیا تھا۔ ایک آٹو والے کو ہاتھ کا اشارہ کیا۔

اب میں دسویں مالے پر تھا۔ ایک بار پھر میں نے بی مشن کے دروازے کو غور سے دیکھا۔ یہ میرا فیصلہ تھا کہ اب مجھے یہاں نہیں آنا تھا۔ سب سے پہلے میں اپنے کیبن میں آیا۔ مجھے تعجب ہوا کہ زرین موجود تھی۔ وہ اپنے کام میں مصروف تھی۔ میں کچھ دیر تک غور و فکر میں ڈوبا رہا۔ غور و فکر کے یہ چند لمحے عجیب ہوتے ہیں، جب اچانک سارے جسم میں خون کی گردش بڑھ جاتی ہے۔ جیسے سانپ جنگلوں سے سرسراتے ہوئے گزرتے ہیں، اسی طرح کی سرسراہٹ میں اپنے جسم میں محسوس کر رہا تھا۔ میں اچانک تیزی سے اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا راکیش وید کے کمرے میں پہنچ گیا۔ ان کے چہرے پر حیرت تھی۔ اس وقت وہ اکیلے تھے۔ میں ان کی سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ راکیش وید کچھ دیر تک میرے چہرے کا جائزہ لیتے رہے۔ چالاک آدمی تھے۔ انہیں یہ سمجھتے دیر نہیں لگی کہ اس وقت میں کس لیے آیا ہوں۔ وہ مجھے دیر تک دیکھتے رہے اور مسکراتے رہے۔ پھر بولے۔

’ آپ نے کبھی بھئے کا سنگیت سنا ہے۔ مجھے یہ سنگیت پسند ہے۔‘

’ میری سنگیت سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں۔‘

’ راکیش نے میری بات کو نظر انداز کیا۔ مسکرائے۔ ایک سنگیت آپ لوگوں میں ہے۔ ۵۰ مسلم میجورٹی ممالک کا سنگیت ان میں ۴۵ سے زیادہ اسلامی ممالک کا سنگیت۔ جب آپ بولتے ہیں، یہ سنگیت سمٹ کر آپ کا ’استیتو‘ بن جاتا ہے۔ ہم تو دو تین بھی نہیں۔ ہیں ہی نہیں۔ پھر بھی بھئے۔‘

’ کہاں ہے بھئے۔‘

راکیش وید نے قہقہہ لگایا۔’ وہ صاف دکھتا ہے۔‘

’ اس کا مطلب آپ بھئے دکھا رہے ہیں۔‘

’ دکھانے کی کیا ضرورت ہے۔‘ راکیش وید مسکرائے۔

’ بھئے کا ایک منو گیان ہے کہ بھئے نکل جاتا ہے تو پھر کرانتی آجاتی ہے۔‘

’ اتہاس کو چھوڑیے۔ اتہاس بنائے جاتے ہیں۔‘

’ یعنی آپ بھئے کی راج نیتی کر رہے ہیں۔‘

’ نہیں۔‘ راکیش وید کے چہرے پر معصومیت تھی۔ راج نیتی تو آٹھ سو ورشوں تک آپ کرتے رہے۔ ہم نے کچھ کہا۔ ہم نے آرام سے خود کو غلام بنا لیا۔ آپ کے لیے کیوں مشکل ہے....؟‘

’ غلام بننا۔‘

’ نہیں۔ آج کی تاریخ میں خود کو سویکار کرنا۔‘

’ جیسے یہ سویکار کرنا کہ ہمارے پاؤں کے نیچے سے زمین غائب ہے۔‘

’ تتھاستو۔‘ راکیش وید ہنسے۔ بھئے میں شکتی ہے، بھئے میں اُللاس ہے۔‘

’ بھئے پیدا کرنے والا سب سے زیادہ ڈرا ہوا ہوتا ہے۔‘
راکیش وید نے قہقہہ لگایا۔ کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس سمئے آپ بھیبھت نہیں۔ آپ کے لوگ تو آہستہ آہستہ ہمارے بنتے جا رہے ہیں۔ جانتے ہیں، دیش اتنے برسوں تک انگریزوں کا غلام کیوں رہا۔ ہمارے لوگ ان کے ساتھ تھے۔‘
’ اور آپ بھی۔‘
کیونکہ ہم آدرش گاندھی واد کو سویکار نہیں کرتے تھے۔ ہم فاشزم کی شکتی کو پہچانتے تھے۔ یہ آدرش ہمیں غلام رکھتا ہے۔ ہم نے آدرش کی کڑیاں ہی توڑ دیں۔ آگے بہت کچھ توڑیں گے، جسے سویکار کرنا ہی ہوگا۔‘
’ بھئے سے؟‘
’ ہاں،‘ راکیش وید کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ آپ جہاں جائیں گے، ہم سے ٹکرائیں گے۔ اور آپ بھی جانتے ہیں کہ اب ہم سے ٹکرانا آسان نہیں۔ ہم مہاشکتی بن کر ابھرے ہیں اور اب ہمارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔‘
’ ہے۔‘ میں نے راکیش وید کی طرف دیکھا۔ آپ بھول گئے کہ ایک بھئے آپ لوگوں کے یہاں بھی تیزی سے جمع ہو رہا ہے۔ آپ کے لوگوں میں۔ آپ کے محکمے میں۔ آپ کی کابینہ میں۔ آپ کی عدالتوں میں، آپ کے طاقتور لوگوں میں جو آپ سے گھبرائے ہوئے ہیں۔ آپ نے کبھی ان کی طرف نہیں دیکھا۔ آئندہ یہی لوگ آپ کے لیے بڑا خطرہ بن کر ابھریں گے۔ آپ کے لیے مشکلیں کھڑی کریں گے۔ کسی نہ کسی دن یہ لوگ ایک آواز ہو جائیں گے۔ اس دن آپ کے لیے خطرہ بھی بڑھ جائے گا۔‘
’ ایسا نہیں ہوگا،‘ راکیش وید مطمئن تھے۔ ہم ایسے باغی لوگوں کی بھی چھٹائی کر رہے ہیں۔ ہم ایسے لوگوں پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ اور جادو کے زور سے کچھ ایسے لوگوں کو غائب بھی کر دیتے ہیں،‘ راکیش وید مسکرایا۔ اس بار گہری نظروں سے اس نے میری طرف دیکھا۔‘ اپنی چنتا کیجیے۔ اور ہاں امید ہے، یہاں سے جانے کے بعد آپ جادوگری دکھانے کی کوشش نہیں کریں گے۔‘
اس بار میرے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔’ میں جادوگر نہیں ہوں۔ مگر اب جادوگر جیسا دکھنے لگا ہوں۔ یہ دیکھیے۔‘
میں نے سیاہ چشمہ اتار امنہ پر رکھ دیا۔ آگے کے دانت نکالے اور وہ چشمہ کے ساتھ ہی رکھ دیے۔ سر کے آگے کے بکھرے بالوں کو پیچھے کی طرف کر دیا۔ میں نے وہی کیا، جسے دیکھ کر تارا دیش پانڈے ڈر گئی تھی۔ اور اس وقت یہی خوف میں راکیش وید کے اندر دیکھ رہا تھا۔
’ یہ کیا ہے۔‘ راکیش وید زور سے چیخا۔
’ جادوگری۔‘
’ آپ بھیانک لگ رہے ہیں۔‘
’ میرے اندر ایک جانور ہے، جو کبھی کبھی باہر آ جاتا ہے۔‘
میں نے آہستہ سے کہا۔ چشمہ پہنا۔ بال ٹھیک کیے۔ نقلی دانت کو دانتوں کے درمیان جگہ دی اور خاموشی سے کمرے سے باہر آ گیا۔ تیز تیز چلتا ہوا میں لفٹ تک پہنچا۔ کچھ ہی دیر بعد سڑک کی بھیڑ کا حصہ تھا۔ میں کچھ دیر ٹہلنا چاہتا تھا۔ گھر جانے کی جلدی نہیں تھی۔ مگر اس وقت مجھے چکّر آ رہے تھے۔ پیٹ کے حصے میں بھیانک طور پر جلن کا احساس ہو رہا تھا۔ میں ایک دوسرے سے ٹکراتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اب آنکھوں کے آگے اندھیرا تھا۔ مجھے اپنا سر سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں لڑکھڑایا۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔

(۱۷)

میں ہوش میں آیا تو ایک چھوٹے سے کمرے میں تھا۔ ایک معمولی درجے کا بستر تھا، جس پر مجھے لٹا دیا گیا تھا۔ میں نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی تو مجھے کامریڈ کی آواز سنائی پڑی۔ کمرے میں دس سے زیادہ لوگ تھے۔ جو میری طبیعت کو لے کر خاصے پریشان نظر آ رہے تھے۔ میں ے آہستہ آہستہ ان چہروں کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ ان میں ایک ادھیڑ عمر کا آدمی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ یہ کامریڈ شاستری تھے اور میری پہلے بھی ان سے کئی ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ ٹاور کے قریب ہی کمیونسٹ پارٹی کا ایک چھوٹا سا آفس تھا۔ یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ یہ لوگ مجھے لے کر اس آفس میں آئے ہوں گے۔

' اب طبیعت کیسی ہے؟' شاستری نے پانی کا گلاس بڑھایا۔ فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم نے ڈاکٹر بھی بلایا تھا۔ اتفاق تھا کہ آپ جہاں گرے، میں وہیں بس اسٹینڈ کے قریب تھا۔ میں نے اپنے کچھ دوستوں کو خبر کی اور آپ کو لے کر آفس آ گئے۔'

شاستری نے کسی کو چائے لانے کا اشارہ کیا۔ گرم گرم چائے حلق میں اتارتے ہوئے کچھ طمانیت کا احساس ہوا۔ میں نے مسکرا کر شاستری صاحب اور دیگر دوستوں کا شکریہ ادا کیا۔

' اب آپ کی طبیعت ٹھیک ہے۔ چاہیں تو گھر جا سکتے ہیں۔ طبیعت بحال ہو تو ہم لوگ کچھ دیر وارتا بھی کر سکتے ہیں۔'

' طبیعت ٹھیک ہو' میں نے شکر گزار نگاہوں سے شاستری جی کی طرف دیکھا۔

' پھر ٹھیک ہے۔ یہ سب میرے دوست ہیں۔ آپ سے پریچے ہو جائے گا۔ کچھ لوگ آپ کو جانتے بھی ہیں۔ یہ سب کامریڈ ہیں۔ مگر کامریڈ اب کہاں ہیں؟ کچھ لوگ کہتے ہیں کمیونسٹ پارٹی مر چکی ہے۔ دیش کو جیوت رکھنے کے لیے کمیونسٹ پارٹی کا زندہ رہنا ضروری ہے۔ دراصل ہم آپس میں ہی الجھ گئے تھے۔ ہمارے خیال دیش کی طرح وبھاجت تھے اور اس کا نقصان ہمیں اٹھانا پڑا۔ اس درمیان بیس ورشوں تک ہماری آئیڈیالوجی ادھر ادھر گھومتی رہی۔ ہم مرکزی حکومت کا بھی حصہ بنے مگر اصولوں کے آدھار پر ہم شکست کھا گئے۔ یہ بھی ہماری بھول تھی۔ ہم کو حکومت میں بنے رہنا تھا۔ فیصلہ جلد بازی میں ہوا۔ پھر ہم نے مغربی بنگال بھی کھو دیا۔ غلطیاں ہماری تھیں۔ لیکن ہماری آئیڈیالوجی صحیح تھی۔ ہماری آئیڈیالوجی میں کچھ غلطی نہیں تھی۔ ہاں ہمارے یہاں بھی ستّا کے لوبھی موجود تھے۔ ابھی ہیں۔ مگر ابھی بھی ہم لاکھوں کی تعداد میں ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ہم جانتے ہیں ہماری واپسی مشکل ہے مگر اس سے دیش کو ہماری ضرورت ہے۔'

شاستری جی دبلے پتلے آدمی تھے۔ قد زیادہ سے زیادہ پانچ فٹ ۴ انچ ہوگا۔ اس وقت وہ سفید دھوتی اور کرتے میں تھے۔ کہتے کہتے رُک گئے۔ پھر پارٹی کے لوگوں کی طرف دیکھا۔ کسی کی طرف اشارہ کیا۔

موہن بابو کیا رپورٹ ہے۔

موہن بابو کی عمر ۳۵ برس کی ہوگی۔ معلوم ہوا کہ وہ ایک صحافی ہیں۔ فری لانس صحافی اور پارٹی کے اہم رکن ہیں۔ موہن بابو کی طبیعت اچھی نہیں تھی۔ پہلے انہوں نے گلا صاف کیا۔ پھر کہا۔ 'نمائندے کم ہوتے جا رہے ہیں۔

' تو بڑھایئے نا۔'

' لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ پارٹی اب مردہ ہے۔'

دوسرے لوگوں سے بات کیجیے۔خاص کر نوجوان طبقے سے۔

اسی طرح ایک ایک کر کے وہ اپنے ساتھیوں سے رپورٹ لیتے رہے۔کسی کو ساتھی کے نام سے پکارتے۔کسی کو کامریڈ کے نام سے۔ پھر انہوں نے تمام ساتھیوں کو کسی نہ کسی کام سے بھیج دیا۔اب کمرے میں کامریڈ شاستری اور میں بچ گیا تھا۔

شاستری جی نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔آپ کے بارے میں ساری رپورٹ میرے پاس ہے۔آپ نے اچھا کیا جوان کے قریب رہے کچھ دن۔اور مجھے خبر مل گئی کہ آج آپ نے نوکری چھوڑ دی۔'

'لیکن آپ کو کیسے معلوم ہوا۔'

'ہمارے نمائندے کم ہو گئے ہیں۔لیکن ابھی بھی ہماری تعداد کافی ہے۔اور آپ جیسے لوگوں کا اب پارٹی میں آنا ضروری ہے۔کچھ پڑھے لکھے دانشور بھی ہمارے خلاف ہیں۔فضا بدل گئی ہے۔مارکس اور لینن نوجوان نسل کے لیے آؤٹ ڈیٹڈ ہو چکے ہیں۔یہ نسل بی مشن اوران کے رہنماؤں میں دلچسپی لے رہی ہے۔لیکن ہمیں یقین ہے ایک دن ہمارے سرخ پرچم کے نیچے یہ سب لوگ آئیں گے۔ ابھی ان پر مذہب اور ہندوتو حاوی ہے لیکن ہمیں کیا،ہمیں اپنا کام کرنا ہے۔'

وہ آہستہ آہستہ بول رہے تھے۔بہت کچھ ایسا ہے جو پہلے کبھی نہیں ہوا۔دراصل آزادی ملنے کے بعد حکمراں پارٹی ہمارے خلاف تھی۔ ہماری طاقت کو دیگر تمام پارٹیاں ختم کرنا چاہتی تھیں۔سیکولرزم،جمہوریت،آئین یہ سب وعدوں کی پھلجھڑیاں تھیں۔نرم ہندوتو آزادی کے پہلے دن سے رہا اور پہلے دن سے ہم بھی رہے۔ہماری آئیڈیالوجی مضبوط تھی،اس لیے ہمیں اس بات کا خطرہ تو تھا کہ زیادہ لوگ ہمیں چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔عوام کو مردہ کمیونسٹ پارٹی کا چہرہ دکھا کر ہم سے دور کر دیا جائے گا۔ہماری جنگ فاشزم کے خلاف تھی۔ہم تعداد میں کم تھے لیکن ہم نے جنگ جاری رکھی۔اب ان کا نشانہ ہم بھی ہیں۔وہ ہماری آئیڈیالوجی کو سب سے بڑا خطرہ سمجھتے ہیں۔'

'لیکن کہیں نہ کہیں آپ بھٹک گئے۔' میں نے شاستری جی کے چہرے کا جائزہ لیا۔'آج بہت کم ملک ہیں جو مارکسسٹ نظریات میں دلچسپی رکھتے ہیں۔کیوبا،ارجنٹینا،پولینڈ جیسے کچھ ملک ہی اس قطار میں نظر آتے ہیں۔اس نظریہ نے بیسویں صدی کو متاثر کیا۔مگر آج اکیسویں صدی میں،روس اور چین میں بھی یہ نظریہ دم توڑ چکا ہے۔۱۹۹۱ میں سویت روس تقسیم ہوا۔چین آہستہ آہستہ ایک دولتمند ملک بن گیا۔مزدور،کسان،نوکری پیشہ کسی کو بھی اس مارکسزم کی ضرورت نہیں۔آپ کا مارکسزم پہلے ہی دو حصوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔پہلے لیننسٹ،دوسرا ماؤنواز۔کنزیومر ورلڈ کے اس دور میں سرمایہ داری انتشار کا شکار ہو چکی ہے۔مارکس کے خیالات کس حد تک ہماری تائید کریں گے؟ سرمایہ دار اوران کے حامیوں نے بیسویں صدی کے دوسرے نصف حصے میں سویت یونین کے ٹکڑے ہونے پر کمیونزم کے خاتمے کو قبول کر لیا۔اب یہ ممالک آسانی سے قبول کرتے ہیں کہ مارکسزم کے لیے ہمارے ملک میں کوئی جگہ نہیں۔'

شاستری جی کچھ دیر سوچتے رہے۔پھر میری طرف دیکھا۔تمہاری باتیں اپنی جگہ سچ ہو سکتی ہیں مگر میں آج بھی مارکس نظریے کو لے کر مایوس نہیں۔ایک ہی نظریہ ہے جو مستقبل میں بڑا انقلاب لا سکتا ہے۔میں مانتا ہوں کہ ایک زمانے سے ہم حاشیے پر ہیں۔ ہمارے نظریے پر چلنے والی پارٹیاں دم توڑ رہی ہیں۔کبھی ہمارا عروج تھا آج ہم زوال کی طرف ہیں۔مارکس کے نظریہ سے ہی متاثر ہو کر لینن نے ۱۹۱۷ میں اکتوبر انقلاب کا انعقاد کیا۔سویت یونین کا قیام عمل میں آیا۔مارکس اور لینن سے متاثر ہو کر ماو نے چین میں انقلاب برپا کیا۔عوامی جمہوریت قائم کی۔سیکنڈ ورلڈ وار کے دوران ایک طرف سرمایہ دار امریکہ تھا اور دوسری طرف روس کی کمیونسٹ اور سوشلسٹ پارٹی۔دونوں نے جم کر نازی جرمنوں کے خلاف مقابلہ کیا۔جنگ کے خاتمہ کے بعد یہ دونوں ایک

دوسرے کے دشمن بن گئے اور سرد جنگ کا آغاز ہوگیا۔ سوویت یونین کے ٹکرے ہوئے تو سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف لڑنا مشکل ہوگیا، ہمارے نظریات کمزور پڑ گئے۔ اب سنو جہانگیر مرزا۔ سیکنڈ ورلڈ وار کے بعد جب مغربی یوروپی مما لک میں روزگار اور کساد بازاری کا بحران پیدا ہوا تو سرمایہ دارانہ نظام بھی تبدیل ہوا۔ سوشلسٹ نظریہ کی کچھ خوبیوں کو اس نظام نے دوبارہ قائم کیا لیکن کمیونزم کو حاوی نہیں ہونے دیا۔ تم نہیں سمجھو گے۔ گلوبلائزیشن کی وجہ سے پروڈکشن نیٹ ورک میں فرق آیا۔ مزدور یونین ہاتھ سے نکل گئی۔ مارکسسٹ اس پورے نظام کو سمجھنے میں ناکام رہے۔ ان کی سوچ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ آج بھی یہی سمجھتے ہیں کہ ایک بورژوا ہے جو مالک ہے اور جو مزدوروں کا استحصال کررہا ہے۔ مارکسسٹ کہیں بھی اپنے نظریات یا سیاسی فلسفے کو نئے نظام سے جوڑ نہیں سکے۔ غلطیاں ہوئی ہیں، اس کے باوجود میں کہتا ہوں، مارکسزم کبھی ختم نہیں ہوگا۔ ہم مارکسس کے سیاسی فلسفوں کو عام آدمی تک پہنچانے میں ناکام رہے ہیں۔

میں نے شاستری جی کی طرف غور سے دیکھا۔ ہندوستان جیسے ملک میں ذات پات کا نظام بگڑی ہوئی شکل میں موجود ہے اور اس کے نام پر برسوں سے استحصال ہوتا رہا ہے۔ آپ لوگ طبقاتی جدوجہد میں الجھ گئے۔ اور ذات پات کے استحصال کو نظرانداز کیا۔ اب غور کیجیے، آپ کے پیچھے پیچھے کئی سوشلسٹ اور دلت پارٹیاں وجود میں آگئیں....اور ان پارٹیوں نے پسماندہ ذاتوں اور اقلیتوں کے مسائل کو اٹھانا شروع کردیا۔ آپ کوئی ہندوستانی ماڈل نہیں لا سکے۔ جبکہ مارکسزم کے ہندوستانی ماڈل کی ضرورت تھی۔ اس سے پہلے کہ آپ نئے ہندوستان کو سمجھتے وہ لوگ راشٹروادا اور ہندوتو کے ماڈل کو لے کر آ گئے۔ آپ نے امبیڈکر کو بھی برسوں بعد قبول کیا۔ آپ مارکسس، لینن، ماؤ، اسٹالن کے قصیدے پڑھتے رہے۔ لیکن ضرورت آپ کی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں۔'

' ہم مارکسزم کا انڈین برانڈ نہیں لا سکے۔ شاستری جی نے آہستہ سے دہرایا۔ پھر میری طرف دیکھا۔

' کچھ بیحد خطرناک ہونے والا ہے۔ مجھے آپ کی ضرورت ہے۔ ہم زیادہ تو نہیں دے سکتے۔ لیکن کچھ نہ کچھ آپ کی مدد ضرور ہو جائے گی۔'

مجھے یہ آفر منظور تھی۔

' شاستری جی نے دوبارہ میز سے ایک کاغذ نکالا۔ کاغذ بوسیدہ اور زرد تھا۔ یہ کاغذ انہوں نے میری طرف بڑھایا۔ یہ نشان دیکھ رہے ہیں۔'

' ہاں۔'

' یہ نازیوں کا ٹریڈ مارک ہے۔ میرے دادا نازی کیمپ میں تھے۔ جب سبھاش چندر بوس ہٹلر سے ملنے گئے تھے تو ان کی ملاقات میرے دادا سے بھی ہوئی تھی۔ اس کہانی کو آئندہ کے لیے رکھتے ہیں۔ بی مشن والے آپ پر نظر رکھیں گے۔ آپ کو محتاط رہنا ہے۔'

میں کمیونسٹ پارٹی کے دفتر سے نکلا تو ایک بار پھر میں سر میں چکّر محسوس کر رہا تھا۔ اس طرح کے چکّر مجھے پہلے کبھی نہیں آئے تھے۔ میں یہ بات سارہ اور پاشا مرزا کو بتانا نہیں چاہتا تھا۔ میں گھر آیا تو سارہ نے بتایا کہ آج کسی نے پیپل کے درخت پر زعفرانی پرچم لگا دیا ہے۔ اس نے آگے کہا، دیکھ لینا کچھ دنوں بعد ترنگا غائب ہو جائے گا۔ یہی پرچم ہر جگہ نظر آئے گا۔ لال قلعہ کی فصیلوں پر بھی یہی پرچم لہرایا جائے گا۔'

دن چھوٹے ہوتے جا رہے تھے۔ شام ۵ بجتے بجتے آسمان سیاہ ہو جاتا۔ ایک نئی بات اور ہوئی تھی۔ گھر سے کچھ فاصلے پر ایک پولیس چوکی قائم ہو گئی تھی۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا، دو پولیس والے چوکی کے آس پاس ٹہل رہے تھے۔ فضا ایسی تھی جیسے ہمیں جنگ کی طرف دھکیلا جا رہا ہو۔ میں نے آج سارہ دن اخبار نہیں دیکھا تھا۔ اخبار کی رپورٹوں سے پتہ چلا کہ معاشی و اقتصادی سطح پر ہمارا ملک کنگال ہو چکا ہے۔ ایل آئی سی اور کئی دوسری بڑی کمپنیاں بھی متاثر ہوں گی۔ اور شاید انہیں بند کر دیا جائے۔ حکومت کے منصوبوں اور اقدامات کا پتہ لگانا آسان نہیں تھا۔ سارہ نے بتایا کہ آج گھر میں کیا بنا ہے، اس کی تفصیل اس نے آن لائن بھیج دی ہے۔ ملک میں ایسی ایمر جنسی کبھی نہیں لگی۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ کتوں کی طرح بو سونگھتا ہوا خفیہ افسر کئی بار گھر آیا اور چلا گیا۔ اس کی دلچسپی محض اس بات میں تھی کہ گھر میں کیا بن رہا ہے۔ اس نے بتایا کہ آج صبح جب وہ آیا، اس کے بدن پر ایسا کوٹ تھا جو عام طور پر فوجی پہنتے ہیں۔

باہر سے بچوں کے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں الجھ گیا تھا۔ آج ہی میں نے بی مشن چھوڑا تھا۔ اور آج ہی میں نے کمیونسٹ پارٹی کو سلام کیا تھا۔ جب آپ پرانے ہو جاتے ہیں تو آپ کو نئے برانڈ کے ساتھ آنا ہوگا۔ اخبار اور ٹی وی پر پروڈکٹ کے اشتہارات بھی ایک دو برسوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کہ عوام کو کچھ نیا دیکھنا ہوتا ہے۔ سبحان علی نے کہا تھا، کہ ہندوستان میں کچھ نیا نہیں ہو رہا۔ پاکستان میں برسوں سے اسلامی راشٹر واد کی حکومت ہے۔ ہندوستان اب یہی کر رہا ہے۔ ہر حکمراں یہ راشٹر واد اپنے طریقے سے نافذ کرتا ہے۔ مگر جو شکار ہوتے ہیں، وہ بے بس پرندوں کی طرح ہوتے ہیں۔ آج بھی ایک بڑی دنیا پر ملاؤں، پنڈتوں اور پادریوں کا قبضہ ہے۔ مذہب کی اجارہ داری ہر جگہ قائم ہے۔

۹ بجے کی نیوز میں ایک دل دہلا دینے والی خبر موجود تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ ایسا ہوگا، مگر اس بات کی امید نہیں تھی کہ ایسا اتنی جلد ہو جائے گا۔ سوامی کے آشرم سے کچھ دوری پر پولیس نے زرین حیدر کی لاش برآمد کی تھی۔ سوامی نے بتایا کہ یہ لڑکی ان کے آشرم اپنی پریشانیاں لے کر آیا کرتی تھی۔ وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے۔ مولوی فرقان اور شاہنواز قادری کے بعد یہ تیسرا قتل تھا، جس نے مجھے حیرت میں ڈال دیا تھا۔ فرقان اور قادری کا قتل کس نے کیا، یہ راز اب معمہ بن چکا تھا۔ زرین کو کس نے قتل کیا، یہ بھی ایک راز تھا مگر مجھے یقین تھا کہ زرین آخری ملاقات میں مجھ سے سچ بول رہی تھی۔ ممکن ہے سوامی کے لیے بھی وہ خطرہ بن گئی ہو اور بی مشن والوں کے لیے بھی۔ زرین کا سہما ہوا چہرہ مجھے یاد آ رہا تھا۔ ایک خیال مجھے پریشان کر رہا تھا کہ ہم یا تو بہت تیزی سے غائب ہو رہے ہیں یا ہلاک کیے جا رہے ہیں۔ آئندہ موت کے صفحے پر کسی کا نام بھی ہو سکتا ہے۔ پاشا نے بتایا تھا کہ اس کا پیچھا کیا جاتا ہے۔ وہ نوجوان تھا اور اسے اس بات کا ذرا بھی خوف نہیں تھا کہ اس کا پیچھا کون کرتا ہے اور کیوں کرتا ہے۔ میں پچھلی تمام کڑیوں کو جوڑ رہا تھا۔ اقتصادی طور پر ملک کا تباہ

ہونا، بینکوں میں آنے والی تیز گراوٹ، کسانوں کی خودکشی، ملک سے روزگار کا ختم ہونا، تمام بڑے کرپشن اور گھوٹالوں کے درمیان بی مشن کا عروج، راشٹر واد اور ہندوتو کے فلسفے کا قبول کیا جانا.....اور جادوگر۔ اس پوری داستان میں اقلیت آرام سے حاشیے پر ڈال دیے گئے تھے۔ اور سلسلہ یہ تھا کہ لگاتار اقلیتوں کا قتل ہو رہا تھا۔

مندر سے بھجن کی آواز آ رہی تھی۔ کچھ دیر کے لیے بھجن رُک گیا اور پھر ایک عورت کی آواز سنائی پڑی۔ جو اسلام اور پاکستان کا نام لے کر تقریر کر رہی تھی۔ قیاس ہے کہ کسی نے ۱۰۰ نمبر پر فون کیا ہوگا۔ عورت کا آخری جملہ سخت تھا، جس میں مسلمانوں کو شمشان بھیجنے کی بات کی گئی تھی۔ تقریر کی جگہ بھجن دوبارہ شروع ہو گیا تھا۔ میرے اندر رینگتا ہوا سانپ دوبارہ زندہ ہو گیا تھا۔ ان نفرتوں سے لڑنا آسان نہیں۔ کیا کوئی جگہ محفوظ ہے؟ کیا سارہ یا پاشا محفوظ ہیں۔ راکیش وید جیسے لوگ کھل کر مخالفت کرتے ہیں۔ میڈیا کھل کر نفرتیں فروخت کرتا ہے اور فرقہ وارانہ فسادات پھیلانے کی کوشش کرتا ہے۔ بھجن کی جگہ اشتعال انگیز تقریریں بھڑکانے کا کام کرتی ہیں۔ اور ہم اپنے ہی ملک میں میں اجنبی اور غلام بنا دیے گئے ہیں۔

◆◆

صبح ہو گئی۔ زرین کے قتل کا حادثہ میں بھول چکا تھا۔ اب اس طرح کے حادثے عام ہو چکے تھے۔ لیکن ان کا مطلب صاف تھا۔ آپ بول نہیں سکتے۔ لکھ نہیں سکتے۔ بغاوت نہیں کر سکتے۔ مخالفت نہیں کر سکتے۔ آپ کو ایک بت بن کر رہنا ہے...اور ممکن ہے کسی دن پتھر کے مجسمے کو بھی شہید کر دیا جائے۔

شہر کی بھیڑ بھاڑ سے گزر کر گیارہ بجے میں کامریڈ شاستری کے دفتر میں داخل ہوا۔ وہ پہلے سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے اخبار کا ایک تراشہ آگے بڑھایا۔ لو پڑھ لو اسے۔

میں نے خبر پر نظر ڈالی۔ بی مشن سے وابستہ ایک شخص کا بیان شائع ہوا تھا۔ پورے ملک میں این آر سی لگانے کی مانگ کی گئی تھی۔ خاص کر دلّی میں۔ آسام کی مثال دی گئی تھی جہاں ۱۹ لاکھ سے زیادہ افراد اپنی ہندوستانی شناخت ثابت نہیں کر سکے۔ بیان میں کہا گیا کہ ایسے لوگوں کو ان کے ملک واپس بھیج دینے چاہئیں۔ دلّی کے بارے میں کہا گیا کہ غیر ملکی طاقتوں نے بڑے پیمانے پر زمینوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔ ان گھس پیٹھیوں کے پاس اسلحے بھی ہیں۔ ان میں زیادہ تر روہنگیائی گھس پیٹھیے ہیں۔'

شاستری جی ہنسے۔ روہنگیائی بنا دیا آپ سب کو۔ آپ سب کے پاس اسلحے ہیں...اور اسلحوں کی دکان چلانے والے حکومت میں بیٹھے ہیں۔ قتل اور ریپ کرنے والے آزاد گھوم رہے ہیں۔ ابھی ۱۹ لاکھ، آگے ۱۹ کروڑ بھی ہو سکتے ہیں۔ لاکھ سے کروڑ بننے میں اتنا وقت لگتا ہے۔ ابھی حال میں دیکھیے۔ کسی کے بینک میں محض پچاس ہزار تھے۔ دو برس میں پچاس کروڑ بن گئے۔ ہم اور آپ کنگال ہوتے چلے گئے۔ ہمیں طاقت چاہیے۔ ایک ایک آدمی جڑیں تو کچھ برس میں ہم بھی بڑی طاقت بن سکتے ہیں۔ ہمارے پاس میڈیا نہیں لیکن یوٹیوب اور سوشل ویب سائٹس تو ہے۔ ہمیں لوگوں کے پاس جانا ہوگا تعداد بڑھانی ہوگی۔ ابھی بھی ادیبوں اور دانشوروں کا ایک طبقہ ہمارے ساتھ ہے۔ مگر یہ لوگ ہمارا ووٹ بینک نہیں ہیں۔ یہ لوگ اپنے ووٹ کا استعمال کس طرح کرتے ہیں۔ کسی بھی قیمت پر اپنے ووٹ کو ضائع ہونے نہیں دیں گے۔'

' میں سمجھتا ہوں۔ اس دن آپ اپنے دادا کی بات کر رہے تھے جو نازی کیمپ میں تھے۔'

' ہاں یاد آیا۔' شاستری جی مسکرائے۔ ان کی ایک ڈائری ہاتھ لگی تھی۔ ڈائری میں بوس کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کا بھی

ذکر تھا۔ انہیں پانچ منٹ ملے تھے بوس سے بات کرنے کے لیے۔ دادا نے بان نام کے ایک یہودی کا ذکر کیا تھا، جس کے پورے خاندان کو لوہے کی ایک وین میں رکھا گیا اور زہریلی گیس سے سب کو ختم کر دیا گیا۔ یہ منظر میرے دادا کو یاد رہ گیا۔ اس میں جولی نام کی ایک لڑکی تھی، جس کی عمر مشکل سے تین سال کی تھی۔ میرے دادا اس کی موت کو بہت دنوں تک بھول نہیں پائے۔ دادا نے لکھا کہ اس وقت ۶۵۰۰۰ یہودیوں کو بے رحمی سے اس وقت تک قتل کیا گیا جب تک سوویت فوج انہیں آزاد کرانے نہیں پہنچ گئی۔'

شاستری نے گہری سانس لی، میرے دادا وکرم شاستری ہٹلر کی موت تک وہیں تھے اور کئی بار انہیں گولیاں بھی لگیں۔ مگر ہر بار وہ موت کے منہ سے بچ کر آ گئے۔ اس ڈائری میں ہٹلر اور نازیوں کے ظلم و ستم کی بہت سی روداد دادا نے لکھی ہے۔ بلکہ ایک جگہ ہٹلر کی موت کا بھی ذکر کیا ہے۔ ہٹلر ڈرپوک تھا۔ اس نے اپنی بیوی کے ساتھ خودکشی کر لی۔ موت سے پہلے اس نے کہا تھا کہ اگر میں مر جاؤں تو میرے جسم کو جلا دیا جائے۔ ہٹلر کو اس بات کا احساس تھا کہ اگر اسے دفنایا گیا تو ہجوم اس کی لاش نکال کر بے دردی سے اس کے مردہ جسم کی بے حرمتی کرے گا۔ برلن کے چاروں طرف سوویت فوج نے گھیرا ڈال دیا تھا۔ جرمنی اس گھیرے کو توڑنے میں ناکام رہا۔ ہٹلر نے خود کو ایک بنکر میں بند کر لیا۔ اور ایک ڈکٹیٹر نے خود کو گولی مار کر اپنا انجام خود لکھ دیا۔ ہر ڈکٹیٹر کا انجام یہی ہوتا ہے۔ ابھی ہمارے پاس وقت ہے۔ وہ بہت جلد بازی میں ہیں۔ ہمیں جلد بازی کی ضرورت نہیں۔ جو ہمارے نظریے میں دلچسپی رکھتے ہیں، ان کی دلچسپی کو ووٹ بینک بنانے کا کام کرنا ہے، اس کام میں ہمارا ساتھ دیجیے۔

میں نے کام سمجھ لیا تھا۔ مجھے ایک ڈوبی ہوئی کشتی کو ساحل کے کنارے لا کر کھڑا کرنا تھا۔ یہ کام ناممکنات میں سے ایک تھا۔ مگر میں اس نظریے کا قائل شروع سے تھا۔ اس لیے اس کام کو شروع کرنے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ مجھے مضامین لکھنے تھے۔ ہینڈ بل اور بروشرس تیار کرنے تھے۔ کچھ پوسٹر ڈیزائن کرنے تھے اور ایک ٹیم کو لے کر یوٹیوب چینل شروع کرنا تھا۔ اس چینل پر بی مشن کی کارروائیوں کو عوام کے سامنے لانے کا کام تھا اور اس وقت ایسے کئی چینل کام کر رہے تھے۔ چینل کے لیے مجھے صرف اسکرپٹ پر کام کرنا تھا۔ مگر مجھے بتایا گیا کہ اس کام میں پہلے بھی کئی لوگ حادثوں میں مارے جا چکے ہیں۔ پارٹی کے چار ممبر چنئی میں، آٹھ ممبر مہاراشٹر میں، تین ممبر اڈیشہ میں، ایک درجن سے زیادہ ممبر مغربی بنگال میں، اسی طرح بہار اور اتر پردیش میں بھی کئی ممبر مارے گئے۔ اور کچھ لوگوں کا پتہ آج تک نہیں چلا۔ زیادہ تر ممبر سڑک چلتے، موٹر سائیکل پر یا کار ڈرائیو کرتے ہوئے ہلاک ہوئے۔ لیکن یہ کارروائی دہری سطح پر ہوئی یعنی پارٹی نے بھی مشن کے کچھ اہم کارکنان کو ہلاک کیا۔ شاستری کے مطابق، تشدد کو روکنے کے لیے بھی تشدد کا ساتھ دینا پڑتا ہے۔ غلط لوگوں کو راستہ سے ہٹانا بھی ہمارا کام ہے۔ اور اس کے لیے بھی ہمارے پاس لوگ ہیں۔ شاستری نے آگے یہ بھی کہا کہ ابھی ہم پوری طرح سے مردہ نہیں ہوئے۔ یہ اچھی بات ہے کہ کچھ لوگ اور بی مشن مسلسل ہمارے مردہ ہونے کا اعتراف کر رہا ہے۔ ہم انہیں اس بھرم میں رکھنا چاہتے ہیں کہ ہم مردہ ہو چکے ہیں۔

میں نے کام کی شروعات کر دی تھی۔ اس درمیان پارٹی کے ایک ممبر سے زرین کے بارے میں نئی معلومات حاصل ہوئی۔ کامریڈ سرین کی اطلاع کے مطابق سوامی کے آشرم میں پچھلے چھ ماہ کے اندر ۱۵ جوان دلت لڑکیوں کی گمشدگی کی خبر ان کے ماں باپ نے پولیس میں لکھوائی۔ لیکن ان پر کوئی عمل نہیں کیا گیا۔ زرین کے پاس کچھ ثبوت آ گئے تھے جس کے مطابق آشرم میں ہی ان لڑکیوں کو آبروریزی کے بعد قتل کیا گیا اور وہیں دفن کر دیا گیا۔ زرین سوامی کو بلیک میل کر رہی تھی اور بی مشن سوامی کا بھگت تھا۔ اس لیے سوامی پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں تھا۔'

'زرین کی ماں کہاں گئی۔'

کامریڈ سرین کے مطابق، زرین کی موت کے بعد اس کی ماں بھی پُراسرار طور پر غائب ہوگئی، بلکہ وہ مکان بھی غائب ہے جہاں زرین اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔'

' پھر.....آدمی غائب، جگہ بھی، مکان بھی۔' شاستری کا لہجہ زہریلا تھا۔' یہ کوئی نشان نہیں چھوڑتے۔ ہنومان جی مکان تک اٹھا کر لے جاتے ہیں۔'

پارٹی آفس صرف ملنے ملانے کی جگہ تھی۔ چینل کا کام کامریڈ فرید دیکھتے تھے۔ مجھے بھی پارٹی آفس آنے کے لیے منع کیا گیا تھا۔ مجھے سارہ کام گھر سے انجام دینا تھا۔ اسکرپٹ مضامین مجھے گھر سے ہی ای میل پر بھیجنے تھے۔ آئندہ گفتگو کے لیے فون کی جگہ وہاٹس ایپ پر پیغام بھیجنے کی بات کہی گئی تھی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ میسیج کو فوراً ڈلیٹ کر دینا ہے۔

سوامی کا معاملہ آگے بڑھا تو میڈیا نے اور بی مشن نے پوری طرح سوامی کا ساتھ دیا۔ سوامی کو ایک دھارمک ویکتی قرار دیا اور یہ بھی کہا گیا کہ سوامی کی زندگی گناہوں سے پاک رہی ہے۔ مجھے اندازہ تھا کہ سوامی کی فائل بھی دیگر بہت ساری فائلوں کی طرح بند کر دی جائے گی اور زرین کے قاتلوں کا کوئی سراغ نہیں ملے گا۔

اس دن گھر پہنچ کر مجھے دوبارہ چکّر آئے۔ سر قابو میں نہیں تھا اور اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ سر سے آگ کی لپٹیں نکل رہی ہیں۔ میں تیزی سے بیمار ہو رہا ہوں۔ مگر میں نہیں چاہتا تھا کہ گھر والوں کو اس کا پتہ چلے۔ میں نے مضامین لکھنے اور اسکرپٹ تیار کرنے کا کام شروع کر دیا تھا۔ مگر بار بار یہ احساس ہو رہا تھا کہ ایک گیس چیمبر ہے یا لوہے کی ایک بدنما گاڑی، جس میں ہم سب کو ڈال دیا گیا ہے۔ کسی وقت بھی زہریلی گیس ہم سب کا خاتمہ کر سکتی ہے۔

باب چهارم

مرگ انبوه

میں پوری طاقت کے ساتھ
لفظوں کو پھینکنا چاہتا ہوں آدمی کی طرف
یہ جانتے ہوئے بھی کہ آدمی کا کچھ نہیں ہوگا
میں بھری سڑک پر سننا چاہتا ہوں وہ دھما کہ
جو لفظ اور آدمی کی ٹکر سے پیدا ہوگا
یہ جانتے ہوئے بھی کہ لکھنے سے کچھ نہیں ہوگا
میں لکھنا چاہتا ہوں........

— کیدار ناتھ سنگھ

No matter what cause one defends, it will suffer permanent disgrace if one resorts to blind attacks on crowds of innocent people.

--Albert Camus

(ا)

پاشا مرزا، میرے بیٹے

یہ واقعہ میرے بیمار ہونے سے پہلے کا ہے۔تم سترہ برس کے ہو گئے تھے اور زیادہ تر مجھ سے دور رہنے کی کوشش کرتے تھے۔میرے ایک دوست تھے، سبحان علی ان کے بارے میں بہت کچھ پہلے بھی تم کو بتا چکا ہوں۔شاعری کرتے تھے۔ٹیوشن کرتے تھے۔ایک بیوی تھی۔ایک بیٹی تھی۔میں نے اس شخص کو کچھ ایسے کاموں میں ملوث دیکھا کہ مجھے یقین کرنا مشکل تھا کہ سبحان علی ایسے کام بھی کر سکتا ہے۔سبزی منڈی میں کسی بزرگ کا ہاتھ تھام لیا، اس کے سامان کو اپنے ہاتھ میں اٹھالیا اور بزرگ کا ہاتھ تھام کر اسے رکشے تک لے آیا۔ایک زمانے میں وہ دو گھنٹہ پوسٹ آفس میں دیا کرتا تھا۔کسی کی چٹھی لکھ دی۔کسی کا فارم بھر دیا۔کسی کے پیسے جمع کرادیے اور یہ کام وہ بغیر اجرت کے کرتا تھا۔اس کے خیالات ترقی پسند تھے اور مذہب کو وہ خاطر میں نہیں لاتا تھا۔دبلا پتلا۔عمر چالیس کے آس پاس۔وہ اپنی زندگی سے خوش تھا۔ایک دن اس کا فون آیا۔

’ تمہارے پیچھے پولیس پڑی ہے۔‘

’ مگر کیوں۔؟‘

’ کہیں دو چار دنوں کے لیے چھپ جاؤ۔‘

' لیکن میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے۔'

' جو اول فول لکھتے رہتے ہو اس کا خمیازہ تو بھگتنا پڑے گا۔ تمہارے گھر پولیس آتی ہو گی۔'

پولیس تو نہیں آئی۔ لیکن شام کے وقت سبحان علی چنے چباتا ہوا گھر آ گیا۔ میں اسے ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ پوچھا۔ یہ سب کیا تھا۔ وہ چنے چباتا رہا۔ پہلے کچھ بولا نہیں۔ پھر میری طرف دیکھا۔

' میں نے سوچا۔ ایسا کچھ تمہارے ساتھ ہو سکتا ہے۔'

' بی مشن چھوڑنے کے بعد؟'

' ہاں۔'

' لیکن تم نے تو مجھے ڈرا دیا۔'

' ڈر سے کچھ حاصل نہیں۔ لو چنے کھاؤ۔'

تین دن بعد میں اس واقعہ کو بھول چکا تھا۔ تیسرے دن سبحان علی نے دوپہر کے وقت فون کیا۔ اس کی آواز میں لرزش تھی۔

' تمہارا بیٹا کہاں ہے جہانگیر۔؟'

' کیوں؟'

' ٹرمینل کے پاس فساد ہو گیا ہے۔ میں نے تمہارے بیٹے کو بھی دیکھا۔ کچھ نوجوان مارے گئے۔ مجھے ڈر ہے کہ ان میں تمہارا بیٹا بھی ہے۔'

میں زور سے چیخا۔ موبائل میرے ہاتھوں میں کانپ رہا تھا۔ میں بیٹے کے کمرے کی طرف آیا تو پاشا مرزا اپنے کمپیوٹر پر کچھ کام کر رہے تھے۔

' تم یہاں ہو؟'

' ہاں۔ مجھے کہاں جانا تھا۔'

' اوہ....'

میں واپس اپنے کمرے میں آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ دل کی دھڑکن بدستور جاری تھی۔ میں نے غصے میں آ کر سبحان علی کو فون کیا۔ اس نے آرام سے فون اٹھایا۔

' یہ سب کیا تھا سبحان علی؟'

' ٹرمینل پر کوئی فساد نہیں ہوا۔ یہی نا۔'

' ہاں۔ میرا بیٹا گھر میں ہے۔'

' یہ تو اچھی بات ہے۔ پھر مجھے کیوں فون کر رہے ہو۔'

' میں کیوں فون کر رہا ہوں؟' میرا لہجہ سخت تھا، تم ایسی باتیں کیوں کرتے ہو؟ کیوں ڈراتے ہو؟'

سبحان علی سنجیدہ تھا۔ یہ حادثے کبھی بھی ہو سکتے ہیں۔ ان میں میرا، تمہارا کسی کا بھی بیٹا ہو سکتا ہے۔ سنو جہانگیر مرزا۔' میں تمہیں مستقبل کے لیے تیار کر رہا ہوں۔ چنے کھاؤ گے۔'

وہ جہاں بھی تھا، اس وقت بھی چنے کھا رہا تھا۔ سبحان علی نے دوبارہ سخت لہجے میں کہا۔ ذرا کھڑکی سے باہر آسمان کا رنگ دیکھو۔ تم خطرے میں ہو جہانگیر مرزا۔'

میں جب واپس مڑا، اس وقت سارہ کھڑکی کھول کر باہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر قریب آنے کو کہا۔ آسمان کا رنگ زرد تھا۔ پیلی آندھی نے نیلے آسمان پر قبضہ کرلیا تھا۔ ہوا تیز تھی اور گرد و غبار کا قافلہ تھا جو کھڑکی کے اندر آسکتے تھے۔ میں نے سارہ کو کھڑکی بند کرنے کے لیے کہا۔ سارہ کے چہرے پر خوف کا سایہ تھا۔

' یہ سب کیا ہو رہا ہے۔'

' آسمان بھی رنگ بدلنے لگا ہے۔'

' پیلی آندھی، کبھی قصے کہانیوں میں سنتے تھے۔'

' اب ان آندھیوں کے لیے تیار رہو۔'

' میرا بیٹا ان آندھیوں کا سامنا نہیں کرسکتا۔'

' اسے کرنا پڑے گا۔'

جملہ ادا کرنے کے باوجود میرا لہجہ کمزور تھا۔ مجھے یقین ہے کہ پاشا ان حالات کا سامنا نہیں کرسکتا۔ شام تک پیلی آندھی گزر چکی تھی۔ حالات معمول پر آچکے تھے۔ دوسرے دن صبح 9 بجے کے قریب سبحان علی کا فون آیا۔ 'میرے دوست، میں مر رہا ہوں، جتنی جلدی آسکتے ہو آجاؤ۔' اس نے فون رکھ دیا۔ میں نے کچھ بھی پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ ایک گھنٹے بعد میں اس کے گھر پر تھا۔ دو کمرے کا فلیٹ۔ وہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس درمیان اس کی بیوی سعدیہ علی کچھ دیر کے لیے کمرے میں آئی، پھر واپس لوٹ گئی۔ میں نے سبحان علی کی طرف دیکھا۔

' پھر کوئی مذاق تو نہیں کیا۔'

'نہیں، اس کا لہجہ پُرسکون تھا۔ یہاں آؤ۔ تمہیں کچھ دکھاتا ہوں۔ دیوار پر ایک چھوٹی سی المیرا بنی ہوئی تھی۔ المیرا کا پہلا خانہ خالی تھا۔ سبحان علی نے اشارہ کیا۔ یہاں دیکھو۔'

' مگر یہاں تو کچھ نہیں ہے۔'

' وہی تو۔ پہلے یہاں کچھ چیزیں ہوا کرتی ہیں۔ تسبیح، امام ضامن، کلام الٰہی اور رحل۔ آج صبح بہت دنوں بعد المیرا کھولنے کا خیال آیا، تو یہ چاروں غائب۔ کلام الٰہی، رحل اور امام ضامن کون لے جاسکتا ہے؟'

' تمہارا وہم ہے۔'

' بالکل بھی نہیں۔ میری بیوی سے پوچھ لو۔'

میں نے اس کی اہلیہ سے دریافت کیا۔ اس نے بھی تصدیق کردی کہ یہ تینوں چیزیں برسوں سے یہاں موجود تھیں۔'

چائے پیتے ہوئے سبحان علی نے بتایا۔ دراصل مجھے ان کی ضرورت کبھی نہیں پڑی۔ تسبیح حج سے واپسی کے بعد چچا جان نے دی تھی۔ کلام الٰہی ابا کے زمانے کا تھا۔ ابا رحل پر قرآن شریف رکھ کر تلاوت کرتے تھے۔ امام ضامن اماں کی نشانی تھی۔ اگر عملی میدان میں کوئی دشمن کام کر رہا ہے تو وہ سب سے پہلے ان چیزوں کو غائب کرتا ہے، جو ہمارے کسی کام کی نہیں یا جس کو عمل میں لانے کی ہم نے ضرورت نہیں سمجھی۔'

’ یا جو صرف تمہاری کمزور شناخت کے کام آتی تھی۔؟‘
سبحان علی نے چائے ختم کر کے پیالی میز پر رکھ دی۔میری طرف دیکھا۔اور پوچھا۔اچھا اب یہ بتاؤ۔جب یہ چیزیں غائب ہو چکی ہیں تو میں زندہ ہوں یا مر گیا ہوں۔؟‘
اس کا جواب اس نے خود دیا۔میں نصف زندہ ہوں اور نصف مر چکا ہوں۔بہت کچھ تیزی سے بدل رہا ہے۔مگر ہم اب بھی یقین کرنے کو تیار نہیں ہیں کہ تبدیلی کی رفتار ایک دن ہمارے بچوں کو نگل لے گی۔ہم اپنی زندگی جی چکے، جہانگیر مرزا۔خطرہ ہمارے بچوں کو ہے۔اور ہم اپنے بچوں کے تحفظ کے لیے اسی طرح مردہ اور کمزور ہیں جیسے کوئی جنگلی جانور اپنے سے کمزور جانور کو آسانی سے مار دیتا ہے۔کیا اس موسم میں ہم مرنے کے لیے تیار ہو چکے ہیں۔؟

میں نے سبحان علی کے دو کمرے والے فلیٹ کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔دو چھوٹے کمرے۔ایک باتھ روم۔ایک کچن۔دو ڈبل بیڈ۔کرسی میز، کمپیوٹر۔جس پر اس کی بیٹی سمیرا کچھ کام کر رہی تھی.....سمیرا نے ہماری طرف دیکھا، کچھ بولی نہیں۔اپنے کام میں مصروف رہی۔ایک طرف سلیقے سے کچھ کتابیں سجی تھیں، جنہیں پڑھنے کی ضرورت شاید ہی محسوس کی گئی تھی۔دیواروں پر سیاہ دھبے تھے۔سعدیہ کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ سبحان علی سے خوش نہیں ہے۔اس سامان کے علاوہ ایک چھوٹی سی المیرا جس کے نیچے کے خانے میں کچھ برتن، کچھ ٹرافیاں رکھی تھیں۔پہلے خانے میں جیسا کہ سبحان علی نے بتایا، تسبیح، امام ضامن، کلام الٰہی اور رحل کو جگہ دی گئی تھی۔یہ سب غائب تھے۔مگر آخر انہیں کون لے جا سکتا ہے۔
سبحان علی نے بتایا کہ اس کے گھر پر زیادہ لوگ نہیں آتے۔وہ کسی کو بلاتا بھی نہیں۔کبھی ڈاکیہ آ گیا۔پانی پینے کی خواہش کا اظہار کیا تو اس کے لیے پانی لانے چلا گیا۔بجلی والے آئے تھے۔بجلی کاٹنے کے لئے۔وہ ایک گھنٹے سے زیادہ رہے۔پھر چلے گئے۔نل خراب تھا، اس لیے پلمبر کو بلایا تھا۔کبھی گیس والا آ جاتا ہے۔ان سب کے علاوہ کوئی نہیں آتا۔‘
اس درمیان سعدیہ وہیں بیٹھی رہی۔کئی بار اس کے چہرے کا رنگ تبدیل ہوا۔سبحان علی کے آخری جملے پر سعدیہ خود کو روک نہیں سکی۔اس نے جھنجھلا کر کہا۔
’ جھوٹ مت بولو۔کبھی کبھی تمہارے دوست بھی آتے ہیں۔‘
’ ہاں آتے ہیں۔تو کیا دوست لے گئے؟‘
’ اب یہ میں نہیں جانتی۔لیکن ایک بات جانتی ہوں بھائی صاحب۔‘
اس نے میری طرف دیکھا۔میرے گھر میں مذہب نہیں ہے۔نماز کوئی نہیں پڑھتا۔روزہ کوئی نہیں رکھتا۔یہ سب ان کی وجہ سے ہے۔اور میں سوچتی ہوں، جو سامان غائب ہوئے ہیں، وہ جنات اپنے ساتھ لے گئے۔‘
سبحان علی کے چہرے پر بے چارگی اور ناراضی کے آثار تھے۔’ ہمیشہ نہیں لیکن کبھی کبھی قرآن شریف میں بھی پڑھ لیتا تھا۔تسبیح کی ضرورت کبھی پیش نہیں آئی۔اور امام ضامن، یہ اماں کی نشانی تھی۔اور یہ جنات والی بات۔یہ بھی خوب ہے۔میں ان باتوں کو نہیں مانتا۔آؤ تمہیں کچھ دکھاؤں۔‘
دوسرے کمرے سے ملحق ایک چھوٹی سی بالکنی تھی۔بالکنی کے باہر درختوں کی قطار کے درمیان کچھ چھوٹے چھوٹے کچے پکے مکانات بنے ہوئے تھے۔ایک چھوٹا سا پارک بھی تھا جہاں اس وقت کوئی بھی نہیں تھا۔درختوں کے جھرمٹ کے درمیان ایک پگڈنڈی تھی، جو دور

تک چلی گئی تھی۔

سبحان علی میری طرف مڑا۔ کیا تم بھیڑیوں کی آوازیں سن رہے ہو...شی....کان لگاؤ۔ میں صاف سن رہا ہوں۔ میں تمہیں خوفزدہ نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن یہ آوازیں میں اکثر سنتا ہوں۔ خاص کر رات کے وقت۔ اور یہ جو سامنے پگڈنڈی ہے۔ کچھ لوگ اسی پگڈنڈی سے ہو کر آتے ہیں۔ وہ کبھی بھی آسکتے ہیں۔ اور کبھی بھی آجاتے ہیں۔ اکثر دروازے تک پہنچ کر ان کی آواز خاموش ہو جاتی ہے۔ میں نہیں جانتا، وہ میرے گھر کے دروازے کے پاس پہنچ کر کیا کرتے ہیں۔ پھر میں ان کے جانے کی آواز بھی سنتا ہوں اور اس کے بعد ہی بھیڑیے کی آواز آتی ہے۔ وہ دیکھو۔ کوئی ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔'

سبحان علی نے تیزی سے میرا ہاتھ تھاما اور تیز تیز باہر کا دروازہ کھول کر سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔ اس کے چہرے پر سراسیمگی کے آثار تھے۔ درختوں کے جھرمٹ اور پگڈنڈیوں کے درمیان اس کی آنکھیں کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔ وہ دو ایک بار زور چلایا۔

'کون ہے؟' وہ بجلی کی طرح میرے ہاتھ چھوڑ کر ادھر ادھر دوڑا۔ اس کے اطراف میں کوئی بھی نہیں تھا۔ مگر سبحان علی خاصا ڈرا ہوا تھا۔ آسمان پر بدلیاں چھا گئی تھیں۔ میرا خیال تھا، یہ جگہ ویسے بھی سبحان علی کے لیے محفوظ نہیں۔ اس کی پندرہ سال کی بیٹی ہے اور بیوی کی عمر بھی کوئی زیادہ نہیں۔ پچھواڑے کے راستے کوئی بھی اس کے گھر آجا سکتا ہے۔ وہ واپس پلٹا تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

میں نے انہیں بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ سات تھے اور ہماری طرح تھے۔ خطرناک بات یہ ہے کہ وہ ہماری طرح نظر آتے ہیں اور ان کو پہچاننا مشکل ہے۔'

' کیا یہ تمہارا وہم ہے؟'

بالکل بھی نہیں۔ وہ تھے اور پورے سات تھے۔ وہ کہیں سے بھی آجاتے ہیں۔' آؤ میں تمہیں کچھ دکھاؤں۔ یہ سامنے دیکھ رہے ہو....'

' ہاں کچا راستہ ہے۔ ان سے ہٹ کر درختوں کی قطار ہے۔'

' کچا راستہ نہیں۔ یہاں دو مکان تھے۔ راتوں رات غائب ہو گئے۔' سبحان علی نے میری طرف دیکھا۔ ہم غائب ہو رہے ہیں۔ اور یہ سب کچھ اس قدر تیزی سے ہو رہا ہے کہ یقین کرنا مشکل ہو رہا ہے۔'

سبحان علی کو یقین تھا کہ میں اس کی بات کو قبول کرنے میں تردد کا شکار ہوں۔ اس نے میرا ہاتھ تھاما اور زور سے چلایا۔

' جب ہم سب غائب ہو جائیں گے، کیا تم تبھی میری بات کا یقین کرو گے۔'

گھر کے دروازے پر پہنچنے تک سبحان علی خاموش رہا۔ سعدیہ نے دروازہ کھولا۔ اس کا چہرہ جذبات سے عاری تھا۔ اس درمیان وہ دوبارہ چائے بنا کر لے آئی تھی۔ میں نے بے روغن دیواروں کی طرف دیکھا، جہاں گہرے داغ کچھ بدنما ہیولوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ کمرے میں گہرا سناٹا تھا۔ اس سناٹے کے باوجود اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ کمرے میں ہم تینوں کے علاوہ بھی کئی لوگ موجود ہیں۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ 'سبحان علی، تم موجودہ سیاست سے ڈر گئے ہو'

' نہیں بالکل بھی نہیں۔'

اس بار سعدیہ نے میری طرف دیکھا۔' میں بھی ان کی بہت ساری باتوں کو واہمہ قرار دیتی تھی۔ مگر ان میں سے کچھ باتوں میں سچائی ہے۔ رات کو اکثر عجیب عجیب آوازیں سنائی دیتی ہیں۔'

' پھر یہ فلیٹ چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔' میں نے سبحان علی کی طرف دیکھا۔
' کیا فلیٹ ملنا آسان ہے، بھول جاؤ جہانگیر مرزا۔ اب کرایے کے مکان کے دروازے ہمارے لیے بند ہو چکے ہیں۔
' جاؤ۔ گھر جاؤ۔' سبحان علی نے میری طرف دیکھا۔ 'اور ہاں سنو جہانگیر مرزا۔ اپنے آپ کو بدترین حالات کے لیے تیار کرو۔'

(۲)

سبحان علی نے جو کچھ کہا، میں اس کے معنی دریافت کرنے میں ناکام رہا۔ اپنے آپ کو بدترین حالات کے لیے تیار کرو۔ کیا پاشا مرزا اس بدترین حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہے؟ اور کیا میں تیار ہوں۔ ہم چھوٹی بڑی نفرتوں کے درمیان الجھ گئے ہیں۔ پاشا کا مسئلہ ہے کہ میں نے اس کے لیے کچھ نہیں کیا۔ کمرے میں بیٹھا یا تو سگریٹ پھونکتا رہا یا خالی چھت کو دیکھتے ہوئے زندگی کا لمبا عرصہ گزار دیا۔

کچھ وقت بی مشن کو دیا۔ پھر گھبرا کر مشن سے باہر نکل آیا اور اب ایک دوسرے نظام کا حصہ ہوں۔ زندگی ایک تضاد ہے اور چھوٹی سی زندگی میں اکثر ہم اس حقیقت سے دور ہو جاتے ہیں کہ ہمیں چاہیے کیا۔ بی مشن میں اپنی مرضی سے گیا تھا اور اب شاستری جی کے ساتھ کو اپنی مرضی سے قبول کیا ہے۔ اس درمیان بی مشن کے کئی ساتھی مارے جا چکے ہیں۔ اور دنیا ایک پُر اسرار جنگل کی طرف جا رہی ہے، جہاں صرف بھول بھلیاں ہیں اور جنگل سے باہر آنے کا کوئی راستہ نہیں۔

میں نے کہیں پڑھا تھا، ادیبوں کی ازدواجی زندگی کامیاب نہیں ہوتی۔ فنکار اپنا سارہ وقت فن کے نام کر دیتے ہیں۔ اور اسی لیے پاشا جیسے جیسے بڑا ہو رہا تھا، میری کتابیں اس کے لیے نفرت کا سبب بنتی جا رہی تھیں۔ ہمارے درمیان مکالمے بہت کم رہ گئے تھے۔ کبھی گفتگو کا موقع ملتا تو میری خوشی کا ٹھکانا نہیں ہوتا۔

سبحان علی کے یہاں سے واپس لوٹنے کے بعد میں سارہ اور پاشا سے بات چیت کا خواہشمند تھا۔ جیسا کہ سبحان علی نے بتایا، کچھ گم ہو رہا ہے۔ اس نے ہنستے ہوئے یہ بھی کہا، ہم سمجھتے تھے کہ ہم اس ملک میں 35 کروڑ ہیں۔ حکومت نے سترہ کروڑ پر لا کھڑا کیا۔ اور پھر ایک دن آئے گا جب ہم گیس بن کر اڑ جائیں گے۔

خلاف توقع پاشا مرزا، سارہ سے ہنس ہنس کر بات کرتا ہوا نظر آیا تو میں بھی اس ہنسی میں شامل ہو گیا۔

' بات کیا ہے۔'

' محلے میں گربا ہونے والا ہے۔'

' گربا۔؟'

' گائیں گربا کریں گی۔'

' تمہارا مطلب ہے، گائیں رقص کریں گی۔؟'

پاشا مرزا کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ آپ کہتے ہیں نا، سب کچھ بہت تیزی سے بدل رہا ہے۔ پھر آپ کو حیرت کیوں ہے؟

' کیوں کہ میں گایوں کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا....'

' گربا کیا، گائیں کچھ بھی کر سکتی ہیں۔ ریس کر سکتی ہیں۔ گانا گا سکتی ہیں اور ڈانس بھی کر سکتی ہیں۔'

' پھر تو یہ دیکھنے کی چیز ہوگی۔'
' نہیں۔ہم نہیں جا سکتے۔'
' کیوں۔صاف کہا گیا ہے کہ ہماری برادری کے لوگوں کی انٹری نہیں ہے۔'
' تو اس میں ہمارا پڑوسی بھی شریک ہوگا،جس کا ڈیری فارم ہے؟'
ہو بھی سکتا ہے۔لیکن سنا ہے،اس کی گائیں کھونٹا توڑ کر بھاگ گئیں۔

یہ میرے لیے نئی خبر تھی۔ڈیری فارم کے مالک سے ملنے کی خواہش ہو رہی تھی۔شروعات کے چند برس دودھ اس کی ڈیری سے ہی آتا تھا۔پھر کچھ مہینے پہلے اس نے منع کر دیا۔اس کے منع کرنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔

پڑوس میں انٹلی جنس بیورو کا ایک افسر رہتا تھا۔آتے جاتے ٹکرا جاتا۔جب بھی ٹکراتا،وہ کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور کہتا جس سے مجھے غصہ آ جاتا تھا۔میں اسے خفیہ افسر کہتا تھا۔گائے اور گرباوالی بات پر اس کا ردعمل جاننا ضروری تھا۔اتفاق تھا کہ وہ اپنی موٹر سائیکل پر کہیں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔مجھے دیکھ کر ٹھہر گیا۔پھر اپنی دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

میں ایک دم سے چونک گیا۔
' یہ کیا کر رہے ہو۔'
' سکون مل رہا ہے۔'
' مجھے دیکھ کر آنکھیں بند کرنے سے؟'
' ہاں۔ایسا صرف میں نہیں کر رہا۔سب لوگ کر رہے ہیں۔تم چاہو تو تم بھی مجھے دیکھ کر آنکھیں بند کر سکتے ہو۔'
' لیکن میں ایسا کیوں کروں گا۔؟'

اس نے آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹا لیا۔پاس بلایا۔آسمان کی طرف اشارہ کیا اور زور سے ہنسا۔' آسمان دیکھو۔دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ادھر نیلا،ادھر سرخ۔جلد تمہارے یہاں آؤں گا۔اور ہاں۔حکومت نے بہت سارے نئے قانون بنائے ہیں۔مجھے پتہ چلا ہے کہ تم ان پر عمل نہیں کر رہے ہو۔عمل نہیں کروگے تو جیل جاؤگے۔'

خفیہ افسر دوبارہ ہنسا اور موٹر سائیکل دھواں چھوڑتی ہوئی نظروں کے سامنے سے اوجھل ہو گئی۔

خفیہ افسر کے جانے کے بعد میری ملاقات ناگارجن سے ہوئی۔اخبار پڑھنے کا شوق ہے۔کسی زمانے میں ادب سے بھی دلچسپی تھی۔پھر یہ دلچسپی وقت کے ساتھ ختم ہو گئی۔کچھ دن قبل وہ ایک ادبی سیمینار میں ٹکرائے تھے۔پیشانی پر سرخ ٹیکہ چمک رہا تھا۔لباس کا رنگ زعفرانی تھا۔میں نے ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں پر ایک نظر ڈالی۔پھر ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔پروگرام کی شروعات وندے ماترم کے ساتھ ہوئی۔میں ناظم کو پہچانتا تھا۔کسی زمانے میں کمیونسٹ پارٹی کا رکن تھا۔نظمیں لکھتا تھا اور ادبی رسائل میں شائع ہوتا تھا۔اس نے مائک سنبھالتے ہی جے بھارت ماتا کا نعرہ لگایا۔پورا ہال جے بھارت ماتا کی آواز کے ساتھ گونج اٹھا۔اب وہاں میرے بیٹھنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔میں اٹھا تو میرے ساتھ ناگارجن بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔میرے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے ہال کے باہر آ گئے۔

ناگارجن مسکرا رہے تھے۔کیوں میاں۔چل دیے؟'
' ادب تقسیم ہو گیا ہے۔' میرا لہجہ اکھڑا ہوا تھا۔
' کیا پہلے تقسیم نہیں تھا؟' ناگارجن نے قہقہہ لگایا۔تم نعت لکھتے تھے،ہم بھجن گاتے تھے۔صدیوں سے یہی ہوتا رہا۔انسان کبھی برابر

نہیں تھے۔ برہمن، برہمن تھے، اچھوت، اچھوت۔ تم حملہ آور بن کر آئے اور ہماری صدیوں کی پرمپرا کو حاشیہ پر ڈال دیا۔ اب ہم پراتن سے نیا جنم لے رہے ہیں تو تمہیں دکھ کیوں ہو رہا ہے۔؟ شروعات تو تم نے کی۔'

مجھے یاد آیا، خفیہ افسر نے بھی یہی بات کہی تھی۔ اس وقت وہ سیب چبا رہا تھا۔ مجھے ایسا لگا، جیسے وہ گوشت کی ہڈیاں چبا رہا ہو۔ اس کا لہجہ تیکھا تھا۔ آزادی کے بعد سے ہمارے تمہارے درمیان ایک سرد جنگ چل رہی ہے۔ تمہیں اندازہ ہے، اس جنگ کی شروعات تم نے کی تھی۔'

(۳)

دوسرے دن میں نے زرین حیدر کے قتل پر رپورٹ تیار کر کے یوٹیوب چینل چلانے والے کامریڈ فرید کو بھیجی۔ اس قتل کے ساتھ میں نے محمد فرقان اور شاہنواز قادری کا بھی ذکر کیا تھا۔ فرید نوجوان تھے۔ تیس برس کی عمر ہوگی اور ہکلا کر بولتے تھے۔ ان کو رپورٹ پسند آئی۔ اب یہ سلسلہ شر تھا کہ دو مکانات تھے اور یہ دونوں مکان راتوں رات غائب ہو گئے۔ گو کہ اب ایسی باتوں پر کوئی حیرت نہیں ہوتی تھی۔، اس کے باوجود میں اس جگہ کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ اس کے اطراف میں جنگل تھا۔ لیکن تھوڑی بہت آبادی بھی تھی۔ اور اس آبادی کے قریب ہی سبحان علی کا فلیٹ بھی تھا۔ جائزہ لیتے ہوئے میں نے محسوس کیا، موٹی موٹی سرخ چیونٹیوں کی لمبی قطار دور تک چلی گئی تھی۔ یہ زہریلی چیونٹیاں تھیں اور اس وقت یہ چیونٹیاں قطار بنا کر دور تک نظر آ رہی تھیں۔ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ سرخ چیونٹیوں نے اس جگہ کو پوری طرح گھیر رکھا تھا۔ سبحان علی نے کھڑکی سے مجھے اس طرف آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ میرے سامنے تھا اور خاصا گھبرایا ہوا تھا۔ میں نے چیونٹیوں کی طرف اشارہ کیا تو وہ ضرورت سے زیادہ گھبرایا ہوا نظر آنے لگا۔

' یہ چیونٹیاں.....'

' تم نے بتایا تھا کہ یہاں دو مکان تھے۔'

' ہاں۔ تھے نا.... مگر اب چیونٹیاں۔'

' چیونٹیوں نے راتوں رات مکان صاف کر دیا۔؟'

' ہو سکتا ہے۔' سبحان علی نے خوفزدہ لہجے میں بتایا کہ اس کے فلیٹ پر بھی سرخ چیونٹیوں نے حملہ کر دیا ہے۔ دیواروں کی کھوکھل سے، چھت سے، زمین سے یہ چیونٹیاں خاصی بڑی تعداد میں نکل رہی ہیں۔ سعدیہ اور سمیرا اس حملے سے پریشان ہیں۔ مگر سوال ہے کہ آدمی جائے تو کہاں جائے۔'

میں ابھی بھی حملہ آور سرخ چیونٹیوں کو دیکھ رہا تھا جو زمین سے لے کر جنگلی درختوں کی شاخوں سے بھی لپٹی ہوئی تھیں۔

' کچھ دنوں میں یہاں صرف چیونٹیاں ہوں گی۔' سبحان علی نے کہا۔

' کیا چیونٹیوں کے ہاتھ اور پاؤں ہیں؟'

' بالکل ہیں۔'

' کیا ان میں مکانات غائب کرنے کی صلاحیت ہے؟'

' یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔' سبحان علی زور سے چلایا۔ تمہارے سامنے یہ چیونٹیاں ہیں اور یہ کچھ بھی کر سکتی ہیں۔ یہ مردار

چیونٹیاں ہیں۔ایسی چیونٹیاں اکثر لاشوں پر رینگتی نظر آتی ہیں۔ہم زندہ کہاں ہیں۔چلو میرے گھر۔'

سبحان علی نے کچھ غلط نہیں کہا تھا۔میں نے اکثر ایسی چیونٹیاں کچی قبروں کے آس پاس دیکھی تھیں۔اس وقت اس ماحول میں شہر خموشاں جیسی پر اسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مجھے یہی خاموشی سبحان علی کے گھر میں نظر آئی۔سرخ چیونٹیوں کی لمبی قطار دیواروں سے ہو کر چھت تک چلی گئی تھی۔اس کی بیوی سعدیہ اور بیٹی سمیرا دونوں خوفزدہ تھے۔

' اب ہمیں یہاں نہیں رہنا۔' سعدیہ نے فیصلہ سنا دیا۔

سمیرا نے بتایا کہ یہ چیونٹیاں لہو پی جاتی ہیں۔

سبحان علی نے کہا، رینگتے رینگتے یہ چیونٹیاں بستر تک آجاتی ہیں۔ساری رات جاگنا پڑتا ہے۔سونا مشکل ہو گیا ہے۔

' تم نے کسی کو بلایا نہیں۔' میں نے دریافت کیا۔

' کس کو بلاؤں۔'

' کوئی آکر صفائی کر دیتا۔ جو سوراخ ہیں ان کی مرمت ہو جاتی۔ دیواروں پر رنگ وروغن چڑھ جاتا۔ کچھ دنوں کے لیے کہیں کرایے کا مکان لے لو۔'

' مجھے بار بار لگتا ہے کہ ایسا کرنے پر بھی کچھ نہیں ہوگا۔ یہ چیونٹیاں دوبارہ آجائیں گی۔'

' پھر ایک ہی راستہ ہے، گھر تبدیل کر دو۔'

اس وقت یہ چیونٹیاں خوفناک نظر آرہی تھیں۔ یہ سائز میں عام چیونٹیوں سے بڑی تھیں اور ان کے چلنے کی رفتار بھی تیز تھی۔ کچھ دن قبل سپریم کورٹ کے ایک جج کو ہلاک کیا گیا تھا جو جادوگر کے ایک بھیانک قتل کی تفتیش کر رہا تھا۔اس کے گھر سے بھی ایسی ہی چیونٹیاں برآمد ہوئیں۔ جہاں قتل ہوا تھا وہاں دور تک چیونٹیوں کی قطار تھی۔اس کے بعد ایک مشہور خاتون کو گولیاں ماری گئیں، جو بہت حد تک اس راز سے واقف تھی اور اپنے اخبار میں لکھنا چاہتی تھی۔اس کے گھر میں بھی سرخ چیونٹیاں پائی گئیں۔ جادوگر کے ذریعہ کیے گئے قتل کی تفتیش سے جو لوگ بھی وابستہ تھے، وہ بھی یکے بعد دیگرے قتل کرا دیے گئے۔

سرخ چیونٹیاں —

میری آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ میں دیر تک ان چیونٹیوں کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں گھبرایا ہوا باہر آیا۔اس وقت مجھے ہر جگہ چیونٹیاں ہی چیونٹیاں نظر آرہی تھیں۔ میرے ساتھ ساتھ سبحان علی بھی باہر آگیا۔

' کیا ہم محفوظ ہیں؟' اس کے چہرے پر سراسیمگی کے آثار تھے۔

' پتہ نہیں۔'

' ہمارے بچے.....؟'

' پتہ نہیں۔'

' ہمارے بچوں کو کون بتائے گا کہ حملہ آور چیونٹیوں نے چاروں طرف سے ہم کو گھیر رکھا ہے؟'

' ان کو بتانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔'

' جو لوگ ابھی ہمارے ساتھ نظر آرہے ہیں، وقت آنے پر ملک چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ پھر؟'

' میرے پاس اس کا بھی جواب نہیں تھا۔'

' جو لوگ ہمارے لیے فکرمند تھے، وہ بھی خاموش ہو گئے۔'

' چیونٹیاں ہر جگہ ہیں۔'

' خون چوسنے والی سرخ چیونٹیاں۔ یہ کیا ہو رہا ہے جہانگیر مرزا۔ کچھ لوگ غائب ہو جاتے ہیں۔ کچھ مکانات راتوں رات جن اور بھوت اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ کچھ سرعام ہلاک کر دیے جاتے ہیں اور کچھ خوف میں مبتلا ہو کر مر جاتے ہیں۔ ہم رینگنے والے کیڑوں سے بھی بدتر بنا دیے گئے ہیں۔'

' ہم صرف ماضی کی بات کر کے خود کو دلاسہ نہیں دے سکتے۔'

' ماضی میں کبھی ہم نے اتنا برا نہیں کیا۔ تاریخ میں نے بھی پڑھی ہے۔ مغل لٹیرے ہوتے تو لوٹ مار کر کے بھاگ گئے ہوتے۔ دیواریں بدل گئیں۔ سڑکوں اور شہروں کے نام بدل گئے۔ نصاب اور تاریخ کی کتابیں بدل گئیں۔ ہم ایک اجنبی ملک میں رہتے ہیں جہاں صدیوں کے سفر کے باوجود ہم آج اجنبی نظر آتے ہیں۔ تحفظ کہاں ہے؟'

' کہیں نہیں۔'

' فرض کرو میں یہ فلیٹ خالی کر دیتا ہوں۔ اب تو ہمیں فلیٹ دینے کے لیے بھی کوئی تیار نہیں۔ فرض کرو فلیٹ مل جاتا ہے، کیا وہاں چیونٹیاں نہیں ہوں گی۔؟'

' ہو سکتا ہے۔ وہاں بھیڑیے بھی ہوں....' میرا لہجہ تلخ تھا۔

' بھیڑیے.... میں سمیرا کو لے کر خوفزدہ ہوں۔ میں نے راتوں کو کئی بار بھیڑیوں کی آوازیں سنی ہیں۔ سمیرا اب پندرہ برس کی ہو گئی ہے۔'

' سمیرا اور سعدیہ کی حفاظت کرو۔ کمزور مت بنو سبحان علی۔ یہ تم نے ہی کہا کہ خود کو بدترین دنوں کے لیے تیار کرو۔'

' بدترین دنوں کے لیے۔' سبحان علی کی آواز کمزور تھی۔' ایک دن ہم بری طرح ٹوٹ جاتے ہیں۔ پھر ایک دن مر جاتے ہیں۔'

اس کے بعد وہ رُکا نہیں۔ میں نے اسے اپنے فلیٹ کی جانب تیز تیز چلتے ہوئے جاتے دیکھا۔

سڑک پر گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ ایسا احساس ہو رہا تھا، جیسے سب کچھ ٹھیک ہے اور حالات نارمل ہیں۔ مگر حقیقت کچھ اور تھی۔۔ حالات سنگین ہوتے جا رہے تھے۔

کامریڈ فرید نے جو خبر دی تھی، اس پر یقین کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اب ایسی خبریں ٹی وی پر نہیں دکھائی جاتی تھیں۔ ایسی خبریں صرف اردو اخبارات کی زینت بنتی تھیں۔ کامریڈ فرید صحافی تھے، اس لیے وہ اس مقام پر بھی گئے، جہاں ناظر قاسمی کا قتل کیا گیا تھا۔ ان کی لاش ایک پرانی وین میں ملی۔ یہ بتایا گیا کہ ان کی موت دم گھٹنے سے ہوئی ہے۔ مگر قتل سے پہلے کا جو منظر کامریڈ فرید نے کھینچا تھا، وہ مختلف تھا۔ ناظر قاسمی اپنی موٹر سائیکل پر تھے اور کچھ شاپنگ کے خیال سے موٹر سائیکل خان مارکیٹ کے پاس لگا کر اترے ہی تھے کہ اچانک کچھ لوگوں نے انہیں گھیر لیا، یہ پانچ سات لوگ تھے۔

' میں نے کچھ نہیں کیا۔'

ناظر قاسمی خوف زدہ لہجے میں چیختے ہوئے بھاگے۔ خان مارکیٹ میں اس وقت کافی بھیڑ تھی، مگر ان پر کسی نے بھی توجہ نہیں دی۔ ناظر تیز تیز بھاگ رہے تھے اور وہ لوگ ناظر کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ یہ بات کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر ناظر قاسمی نے ان لوگوں کا کیا بگاڑا تھا اور یہ لوگ ناظر قاسمی کے پیچھے کیوں دوڑ رہے تھے۔؟ اس وقت شام کا وقت تھا۔ سڑک پر اس موقع پر ٹریفک کافی ہوتا ہے۔ کچھ دیر تک دوڑنے اور پیچھا کرنے کا عمل جاری رہا۔ پھر کچھ لوگوں نے دیکھا کہ ایک پرانی وین سے دھواں نکل رہا ہے۔ یہ وین سڑک کے کنارے لاوارث کھڑی تھی۔ وہاں موجود لوگوں نے بتایا کہ دم گھٹنے سے ناظر قاسمی کی موت ہوگئی۔

کامریڈ فرید ناظر قاسمی کو جانتا تھا۔ ناظر قاسمی کو ملا کر چار قتل ہو چکے تھے اور یہ چاروں وہی تھے جو راکیش وید کے یہاں کام کرتے تھے۔ زرین کے مطابق محمد فرقان، شاہنواز قادری اور ناظر قاسمی اسرائیلی ایجنٹ تھے۔ اگر ایسا تھا تو پھر ان لوگوں کو قتل کیوں کیا گیا۔؟ یہی بات کامریڈ فرید نے بھی بتائی کہ ناظر قاسمی دو بار اسرائیل جا چکا تھا اور ان کے محکمے کا سب سے وفادار اور مضبوط آدمی تھا۔ اگر ایسا تھا تو پھر اس کا قتل کیوں کیا گیا۔؟ زرین کے قتل کے پیچھے کیا واقعی سوامی کا ہاتھ تھا یا زرین کا قتل بھی ایک راز بن کر رہ جائے گا۔؟ میرا سر گھوم رہا تھا۔ اب میرا نمبر بھی آ سکتا ہے۔ سبحان علی بھی پریشان ہے۔ ناظر قاسمی کے قتل کا سیدھا جواب مجھے کامریڈ شاستری نے دیا۔

کامریڈ شاستری نے اس دن مجھے بلایا تھا۔ شاستری جی بھی ناظر کی موت کو لے کر غمگین تھے۔ وہ دیر تک سوچتے رہے پھر بولے۔

' ناظر کا قتل اسی طرح کیا گیا جیسے نازی فوج یہودیوں کا قتل کرتی تھی۔ اس کی لاش ایک پرانی وین میں ملی۔ موت دم گھٹنے سے ہوئی۔'

' مطلب۔' میں نے شاستری جی کی طرف دیکھا۔

' مطلب صاف ہے، اب وہ صاف صاف کہنا چاہتے ہیں کہ نشانے پر آپ ہیں۔ نازیوں نے جو سلوک یہودیوں کے ساتھ کیا، وہی سلوک آپ کے ساتھ ہونے والا ہے۔'

' مگر ناظر تو اس کا آدمی تھا۔'

' ان کا آدمی کوئی نہیں۔ کام نکل گیا۔ آدمی غائب۔ آپ کسی بھی قیمت پر ان کے آدمی نہیں ہو سکتے۔ زیادہ پھڑ پھڑائے، غائب۔ زیادہ اڑنے کی کوشش کی، غائب۔ کچھ زیادہ قیمت چاہی، غائب۔ وہ آپ کو تحفظ کیوں دیں گے؟ وہ آپ سے صرف مطلب سادھیں گے۔ اور آپ لوگ یہ نہیں دیکھ رہے کہ کون آپ کے ساتھ ہے اور کون نہیں؟ اتنے برسوں میں دلت، پسماندہ، سکھ، جین، بودھ دھرم کے ماننے والوں کو ساتھ لے کر چلنا چاہیے تھا۔ مگر آپ نے بھروسہ کس پر کیا۔ ان لوگوں پر، جو آپ پر بی کیمپ کی شکل میں پہلے بھی مسلط کیے گئے۔ آپ سیکولرزم کا راگ الاپنے والوں کے ساتھ ہو گئے۔ جبکہ وہ لوگ سیکولر تھے ہی نہیں۔ اب نشانے پر کون ہے؟ ہم

ہیں، آپ ہیں، کامریڈ فرید۔ ہم میں سے ہر شخص نشانے پر ہے۔ وہ بھی جو آپ کے ساتھ ہے۔ یہ ہر اس ریڈیو کو خاموش کرنا چاہتے ہیں جس میں سے آپ کی حمایت کے سُر گونجتے ہیں۔ ناظر، فرقان، قادری نے ان کا آدمی بن کر دیکھ لیا۔ کیا ملا، موت۔ اور آپ کو پتہ بھی ہے الگ الگ ریاستوں میں، پورے ملک میں آپ کتنی بڑی تعداد میں گم ہو چکے ہیں۔ آپ سرخ چیونٹیوں کا نوالہ بن رہے ہیں۔ کہیں بھیڑیوں کا اور کہیں جنگلی جانوروں کا۔ آپ کی تنظیمیں کہاں کہاں ہیں؟ تنظیمیں آواز کیوں نہیں اٹھاتیں۔ وقت پڑنے پر تنظیمیں بی مشن کا ساتھ کیوں دیتی ہیں۔؟ ستہ، پاور، حکومت کا ساتھ اور حکومت کو آپ کے یہی چند لوگ چاہئیں۔ یہ تنظیمیں آواز بھی اٹھاتی ہیں تو اس کی قیمت دی جاتی ہے۔ کیونکہ یہ آوازیں نفرت پھیلانے کے کام آتی ہیں۔ میڈیا ان آوازوں کو بڑے پیمانے پر فروخت کرتا ہے۔ جب تک کوئی بڑی بغاوت ان کے درمیان سے پیدا نہیں ہوتی، ہم میں سے کوئی محفوظ نہیں۔ ایک دن ایک بڑی سی وین آئے گی اور سب کو اٹھا کر لے جائے گی۔'

' کامریڈ، ک..... کیا.... آپ کو.... خود پر بھی...ی.... یقین نہیں' فرید نے پوچھا۔

'ہم اندھیرے میں نہیں رہنا چاہتے فرید'

'ہ.....م... جیتیں گے۔' فرید کی زبان میں لکنت تھی۔

' ہاں ہم جیتیں گے لیکن تب، جب لڑائی جاری رہے گی۔ ہم مٹھی بھر لوگ ہیں، جنگ اب بھی وہی ہے، سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف۔ اس نظام میں دھرم بھی آ گیا ہے۔ ہمارے تمام بڑے انڈسٹریلسٹ بھی دھرم کو فروخت کر رہے ہیں۔ ایک بڑی آبادی کو دھرم کا افیون دے دیا گیا ہے لیکن ہم....

' جی.... تیں.... گے۔' فرید نے آگے کا جملہ پورا کیا۔

'اوور فیس' اجالے کی تلاش میں، تاریکی میں گم ہو گیا تھا۔ بربط کا آہنگ گم اور نغمہ خاموش تھا۔ میرے گھٹنے مڑ گئے تھے اور مجھے چکّر آ رہے تھے۔ یہ سردی کے خاتمے کے دن تھے۔ کچھ لوگ جیت کی امید لگائے بیٹھے تھے جبکہ دیوتاؤں کا وِش کا پیالہ ٹوٹ چکا تھا اور چاروں طرف وِش بہہ رہا تھا۔ دیوتا غائب تھے۔

اس رات سبحان علی نے فون کیا۔

' چیونٹیاں اب نہیں ہیں۔'

' مجھے خوشی ہے سبحان علی۔'

' میں نے مزدور بلائے اور رنگ وروغن کرا لیا۔'

' یہ تم نے اچھا کیا۔'

' مگر مجھے خوف ہے، چیونٹیاں دوبارہ آ سکتی ہیں۔'

' مسلسل خوف میں رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔'

' یہ تم نے ٹھیک کہا، جہانگیر مرزا۔ ۲۶ جنوری کا دن قریب آ رہا ہے۔'

' ہر سال آتا ہے، اس میں نیا کیا ہے؟'

' نیا ہے۔ ہم ان خوشیوں میں حصہ نہیں لیتے۔ جشن آزادی، جشن جمہوریہ ہمیں نہ صرف جوش وخروش کا مظاہرہ کرنا چاہیے بلکہ ان لوگوں کو بھی دکھانا چاہیے جو ہمیں محبّ وطن تسلیم نہیں کرتے'

' نمائش کرو گے؟'
' نمائش اب ضروری ہے جہانگیر مرزا۔ ان کی ہندوستانیت اور راشٹر واد کا حصہ بننا پڑے گا...'
' بننا کیوں پڑے گا؟' میرے لہجے میں حیرانی تھی۔' جو شک کرتے ہیں، کیا وہ ہمارے اس عمل سے شک کرنا بند کر دیں گے۔'
' نہیں۔ پھر بھی اب اس بات کی ضرورت ہے۔'
' میں نہیں سمجھتا۔'
' لیکن میں سمجھتا ہوں، مسلمانوں کو نمائش کی عادت ڈالنی ہوگی۔'
' صرف مسلمانوں کو کیوں؟'
' کیونکہ سرخ چیونٹیاں مسلمانوں کے گھروں میں ہی گھر بناتی ہیں۔'
' باقی اقلیتیں؟'
' ان کو ضرورت نہیں۔' سبحان علی زور سے بولا۔ خطرے میں ہم ہیں۔ بہتر ہوگا کہ تم صبح میں گھر آ جاؤ۔'
' ٹھیک ہے میں کوشش کروں گا۔'

فون رکھنے کے بعد میں دیر تک سبحان علی کے بارے میں غور کرتا رہا۔ ان سرخ چیونٹیوں کی یاد تازہ تھی جو دیواروں کی کھوکھل سے بڑی تعداد میں نکل رہی تھیں۔ اور جنگل کے پاس، جہاں راتوں رات دو مکان غائب ہو گئے تھے، وہاں بھی دور تک ان چیونٹیوں کی قطار موجود تھی۔ حملہ آور سرخ چیونٹیاں۔ میں نے ناشتہ کیا۔ سارہ سے حال چال پوچھا۔ پاشا مرزا صبح ہی صبح کہیں نکل گئے تھے۔ باہر آیا تو خفیہ افسر میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ مگر اس نے کچھ کہا نہیں۔ اس کا چہرہ سرخ تھا اور آنکھیں خوفناک نظر آتی تھیں۔ میں اچانک کچھ دیکھ کر چونک گیا۔ جہاں وہ کھڑا تھا، وہاں کی زمین گیلی تھی۔ کیلے کے کچھ چھلکے پڑے ہوئے تھے اور ان پر سرخ چیونٹیاں چل رہی تھیں۔
' ادھر آؤ اور مزیدار کھیل دیکھو' خفیہ افسر نے اشارہ کیا۔
' تم نے کیلے کا چھلکا کھا کر پھینک دیا۔ ابھی جو قانون بنا ہے.....'
خفیہ افسر زور سے ہنسا۔' سارے قانون تمہارے لیے ہیں، ہمارے لیے نہیں۔ اور یہ دیکھو سرخ چیونٹیاں۔ یہ مسلمان ہوتی ہیں۔'
وہ زور سے ہنسا۔ اور سیاہ چیونٹیاں ہماری۔ تم کیلے کے چھلکے تک نہیں چھوڑتے۔'
خفیہ افسر زور سے ہنسا۔ مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس سے الجھنا بے سود تھا۔ کچھ دیر بعد میں سبحان علی کے گھر تھا۔ دروازہ سعدیہ نے کھولا۔ میں نے برسوں بعد اس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی تھی۔
' آیئے بھائی صاحب۔'
سمیرا ایک طرف بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ اس نے مجھے سلام کیا۔ میں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ سبحان علی میرا ہی انتظار کر رہا تھا۔ میں نے دیواروں کی طرف دیکھا۔ گھر بدلا بدلا نظر آ رہا تھا۔ صفائی بہتر طریقے سے ہوئی تھی۔ اب کہیں مکڑی کے جالے بھی نہیں تھے اور سرخ چیونٹیاں بھی نظر نہیں آ رہی تھیں۔ سعدیہ نے مجھے پورا گھر دکھایا۔ مگر دیواروں پر جو رنگ تھا، وہ مجھے پریشان کر رہا تھا۔
' یہ زعفرانی رنگ؟'
' اس سے چیونٹیاں خوفزدہ ہو جاتی ہیں۔' جواب سعدیہ سے ملا۔ اس لیے گھر کی تمام دیواروں پر زعفرانی پینٹ ہی کرایا ہے۔'

مجھے خفیہ انسپکٹر کی بات یاد آ رہی تھی۔ سبحان علی زور زور سے ہنس رہا تھا۔
' اب اپنے اندر کے کامریڈ کومت زندہ کرنا'
' مگر یہ رنگ۔'
' میں سعدیہ کا غلام ہوں۔ جو کہتی ہے، آسانی سے مان لیتا ہوں۔' سبحان علی نے پھر قہقہہ لگایا۔ مجھے اس کے یہ قہقہے پسند تھے۔ چائے پینے کے بعد اس نے دکھایا کہ چھبیس جنوری کے لیے اس نے تمام انتظام کر لیے ہیں۔ اس نے ترنگا ہوا میں لہرایا۔ میرے ساتھ سعدیہ اور سمیرا بھی ہوں گے۔ اسے فلیٹ کے باہر لگاؤں گا۔ باہر جو ایک پارک ہے، اسی جگہ۔ میں نے سب سوچ لیا ہے۔
' تم دہشت زدہ ہو۔'
' بالکل بھی نہیں۔ غور کرو جہانگیر مرزا تو بس یہ کپڑے کا ٹکرا ہے۔ مگر یہ تین رنگ اور اشوک چکر اس کپڑے کے معمولی ٹکرے کو مقدس آزادی میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ آزادی، کیا ایک چھوٹا سا لفظ ہے۔' جمہوریت، ہم جمہوریت کا جشن منائیں گے۔'
' اس کے لیے جذبہ کافی ہے۔'
' اب اس جذبے کو نمائش گاہ میں لانا ہوگا' سبحان علی اپنی بات پر مصر تھا۔ مجھے ایسی خوشی اور سرشاری بہت دنوں بعد اس کے چہرے پر نظر آئی تھی۔ سمیرا نے قومی ترانہ گایا اور قومی ترانہ کے احترام میں ہم سب اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس کی آواز سریلی تھی۔ اور اس وقت سعدیہ، سمیرا، سبحان علی سب جوش اور حب الوطنی کے جذبے سے بھرے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی انسان اچانک وہم کا شکار ہو جاتا ہے۔ مجھے زعفرانی پینٹ کے اندر سے اس وقت بھی سرخ چیونٹیاں جھانکتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

(۵)

سب کچھ غیر متوقع طور پر ہوا تھا لیکن اس موقع پر بھی مجھے چیونٹیاں یاد آ رہی تھیں۔ چیونٹیاں جن کے بارے میں یہ بھی کہا گیا کہ ان کا شمار قدیم ترین اور قابل معاشروں میں ہوتا ہے۔ کچھ چیونٹیاں اُڑتی بھی ہیں۔ چیونٹیاں اپنے دشمنوں سے انتقام بھی لیتی ہیں۔ ایک چیونٹی دوسرے گروہ سے آنے والی چیونٹی سے لڑتی ہے تو اس کی بو کو یاد رکھتی ہے۔ اس بو میں ایک طرح کا کیمیائی مادہ ہوتا ہے جسے وہ اپنے گروہ میں منتقل کر دیتی ہے۔ نفرت بھی ایک کیمیائی مادہ ہے جو ایک دل سے دوسرے دل میں آسانی سے منتقل ہو جاتا ہے۔ ۲۶ رجنوری کو ہمارا آئین نافذ ہوا اور ملک جمہوری رنگ میں رنگ گیا۔ ۱۹۷۱ء میں دستور کے ابتدائیہ میں لفظ سیکولر کا اضافہ کر دیا گیا۔

سبحان علی صبح ہی صبح اٹھ گئے۔ صبح عام صبحوں سے زیادہ روشن تھی۔ یہ پروگرام پہلے سے طئے تھا کہ پارک میں ترنگا لہرایا جائے گا۔ سعدیہ نے آج کے دن کے لیے کھادی کی ساڑی کا انتخاب کیا تھا، جیسی ساڑی کستور با گاندھی پہنا کرتی تھیں۔ سمیرا نے پھولوں والا جمپر اور اس سے میچ کرتی ہوئی شلوار پہن رکھی تھی۔ پرچم کو پارک میں لہرانے کے لیے سبحان علی نے بانس کا بھی انتظام کر رکھا تھا۔ ٹی وی چینلز پر پرچم کشائی اور قومی گیتوں کا پروگرام شروع ہو چکا تھا۔ اسکول کے طالب علم انتہائی جوش اور جذبے کے ساتھ قومی گیت گنگنا رہے تھے۔ سارے ساز و سامان کے ساتھ سبحان علی، سعدیہ اور سمیرا کو لے کر فلیٹ کے نیچے آئے۔ آس پاس رہنے والوں نے انہیں دیکھا لیکن

ان کے ساتھ آنے کو کوئی بھی تیار نہیں ہوا۔ آس پاس محلے کے کچھ مسلمان، جن کی تعداد چار سے پانچ ہوگی، سبحان علی کی مدد کے لیے آگے آئے۔

بھاسکر بھائی کالونی کے سکریٹری تھے۔ سبحان علی نے انہیں دیکھ کر آواز لگائی۔

' بھاسکر بھائی آیئے نا....'

بھاسکر بھائی رُکے نہیں آگے بڑھ گئے۔ سبحان علی کو حیرت تھی کہ ان کے ساتھ جشن میں شامل ہونے کے لیے بھاسکر بھائی آگے کیوں نہیں آئے۔ دینکر جی، کلبھوشن، نریندر بھائی بھی آگے بڑھ گئے۔ محلے کے بوڑھے سکھ بزرگ چرن جیت سنگھ آگے آئے اور سبحان علی کی پشت پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔ کالونی کے دونو جوان روہن اور نتن بھی سبحان علی کے جوش اور جذبے کو دیکھ کر خوش تھے۔ سمیرا، سبحان علی کے پاس ہی سمٹی ہوئی تھی۔ اب کافی لوگ ہو گئے تھے۔

' چرن جیت سنگھ نے کہا، اب کسی کا انتظار مت کرو۔ پرچم لہرادو۔'

روہن کو غصہ تھا۔ سب کچھ صاف نظر آرہا ہے انکل۔ آپ اپنا کام کرو۔

نتن کے لہجے میں بھی ناراضی تھی۔ کچھ لوگ ہمیں بانٹ رہے ہیں۔ مگر آپ نہ گھبراؤ۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔

پارک کے کھمبے میں بانس لگانے میں نتن اور روہن نے مدد کی۔ پرچم اوپر کی طرف رسّیوں سے بندھا ہوا تھا۔ آخری سرا نیچے تھا۔ سبحان علی نے چرن جیت سنگھ کو آگے کیا۔ چرن جیت سنگھ پرچم کشائی کرنا ہی چاہتے تھے اچانک اسکوٹر، موٹر سائیکل کی آوازیں گونج اٹھیں۔ پندرہ سے بیس موٹر سائیکل سوار تھے۔ ان کے ہاتھوں میں زعفرانی پرچم اور ہاکی کی اسٹک تھی۔ بھارت ماتا کی جے کے نعروں کے ساتھ ان تمام لوگوں نے پارک کو گھیر لیا۔ سمیرا خوفزدہ ہو کر سبحان علی سے لپٹ گئی۔ ایک ہجوم تھا جو موٹر سائیکل اور اسکوٹر سے اترا اور آناً فاناً پرچم اتار دیا گیا۔ اس سے قبل کہ روہن اور نتن ان لوگوں سے الجھتے، وحشی ہجوم 'بچہ چور' کہتے ہوئے سبحان علی پر ٹوٹ پڑا۔ سمیرا زور زور سے رو رہی تھی۔ سعدیہ مدد کے لیے چلا رہی تھی۔ سردار چرنجیت سنگھ نے کچھ کہنا چاہا تو ہجوم نے بے دردی سے سردار جی کو دھکا دیا۔

' بچہ چور۔' ہجوم تیز آواز میں چیخ رہا تھا۔

ایک زور کی چیخ کے ساتھ سبحان علی زمین پر گر گئے۔ ان کی آواز گلے میں پھنس کر رہ گئی۔

' میں بچہ چور نہیں۔ یہ تو میری بیٹی سمیرا ہے۔ میری بیوی سعدیہ....'

' بچہ چور.....'

ہوا میں اسٹک لہرا رہی تھی۔ زعفرانی پرچم رقص کر رہے تھے۔ چیخیں گونج رہی تھیں۔ ہجوم جیسے آیا تھا ویسے ہی اسکوٹر اور موٹر سائیکل پر بیٹھ کر رخصت ہو گیا۔ جو آخری جملہ سبحان علی کے منہ سے سنا گیا، وہ تھا، جادوگر.......

سردار چرن جیت سنگھ بے ہوش پڑے تھے۔ ایک طرف سعدیہ گری ہوئی تھی۔ سبحان علی کے سر سے خون نکل رہا تھا۔ ان کے ساتھ چار داڑھی والے اور بھی تھے جو زمین پر مردہ پڑے تھے۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد پولیس آئی۔ روہن نے ہجومی تشدد کا خاموشی سے چھپ کر ویڈیو تیار کر لیا تھا۔ پولیس کے آنے تک سبحان علی کا جسم ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ چرن جیت سنگھ اور سعدیہ کو ہوش آچکا تھا۔ مگر سمیرا غائب تھی۔ سعدیہ چاروں طرف سمیرا کو تلاش کر رہی

تھی۔ پولیس نے سبحان علی کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی۔

مجھے جب یہ اندوہناک اطلاع ملی، اس وقت میں سویا ہوا تھا۔ پہلے کامریڈ فرید کا فون آیا۔ پھر کامریڈ شاستری کا۔ شاستری نے بتایا کہ وہ پولیس اسٹیشن جا رہے ہیں۔ ذہن و دماغ پر سرخ چیونٹیوں نے حملہ کر دیا تھا۔ اس وقت پورا جسم زخم آلودہ تھا۔ ذہن سناٹے میں ڈوب گیا تھا۔ میں کانپ رہا تھا اور چلا رہا تھا۔

' میں نے اسے منع کیا تھا۔ منع کیا تھا۔ لیکن وہ نہیں مانا۔ پہلے گئو رکشک بن کر اب بچہ چوری کا الزام لگا کر یہ لوگ ہمارا قتل کر رہے ہیں۔ یہ نہیں چاہتے کہ ہم ملک کے لیے اپنی وفاداری کے جذبہ کو نمایاں کریں۔ میں نے سبحان علی کو سمجھایا تھا' کامریڈ فرید نے بتایا کہ سعد یہ ابھی بھی بیہوش ہے اور سمیرا غائب ہے۔ سمیرا کہاں گئی۔؟

پاشا مرزا اور سارہ میرے سامنے کھڑے تھے، حواس باختہ۔

' ان لوگوں نے مار دیا سبحان علی کو۔' میں زور سے چیخا۔

کچھ دیر بعد میں نگم راج پولیس اسٹیشن میں تھا۔ اس وقت کامریڈ شاستری، کامریڈ رفیق کے ساتھ پندرہ بیس لوگ تھے جو پولیس اسٹیشن میں موجود تھے۔ ایس ایچ او ورما ان لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ سردار چرن جیت سنگھ کو ہوش آ چکا تھا۔ وہ بھی اس موقع پر موجود تھے۔

کامریڈ شاستری چیخ کر بولے۔ 'مسلمان اب اس ملک میں ترنگا بھی نہیں لہرا سکتا۔ وہ بھیڑیوں کی طرح آئے تھے اور سبحان علی کے ساتھ چار مسلمانوں کو بے دردی سے قتل کر کے چلے گئے۔ آپ کی پولیس دیکھتی رہ گئی۔'

' دیکھتی نہیں رہ گئی۔ بچہ چوری کے معاملات ان دنوں بہت بڑھ گئے ہیں۔ ہوسکتا ہے جو لوگ موقع واردات پر آئے، ان کو اس بات کی اطلاع ملی ہو کہ وہاں کوئی بچہ چور موجود ہے۔'

' سبحان علی اور باقی لوگ یوم جمہوریہ کا جشن منانے آئے تھے۔' اس بار میری آواز بھی تیز تھی۔ دو دن پہلے میں اس سے ملا تھا۔ جشن جمہوریہ کو لے کر وہ بہت جذباتی تھا۔'

' یہ معاملہ بچہ چوری کا ہے۔' ایس ایچ او کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ بھگدڑ مچ گئی اور کچھ لوگ مارے گئے۔ ہوسکتا ہے کہ ان لوگوں کا شک ہو کہ سبحان علی بچہ چور ہے۔'

'یہ معاملہ بچہ چوری کا ہے ہی نہیں۔' کامریڈ شاستری دہاڑے۔ 'جانتے ہیں گئو رکشک کے نام پر اس ملک میں کتنے قتل ہو چکے ہیں۔؟ اب یہ وحشی ہجوم بچہ چوری کا الزام لگا کر بے گناہ مسلمانوں کو مار رہا ہے۔'

ایس ایچ او پرسکون تھا۔ 'آپ لوگ غلط بات کہہ رہے ہیں۔ لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی گئی ہے۔'

' سمیرا کہاں ہے؟' میں نے زور دے کر پوچھا۔

' کون سمیرا، ایس ایچ او نے انجان بننے کی کوشش کی۔ دیکھیے معاملے کو طول نہ دیجیے۔ چھوٹا سا معاملہ ہے۔'

' آپ ایف آئی آر درج کیجیے۔ کیونکہ معاملے کی ویڈیو کلپ ہمارے پاس ہے۔'

' ویڈیو کلپ سے کیا ہوگا' ایس ایچ او مسکرایا۔ 'سبحان علی پر بچہ چوری کا الزام تھا اور اسے ہجوم نے مار ڈالا۔

' آپ سب ملے ہوئے ہیں۔'
کامریڈ شاستری کا اتنا کہنا تھا کہ ایس ایچ او نے ایک زور کا تھپڑ ان کے گال پر جڑ دیا۔' زیادہ آواز لگائی نا تو جیل میں ٹھونس دوں گا۔'
ایس ایچ او کا لہجہ سفاک تھا۔ کامریڈ شاستری کے ساتھ جو لوگ آئے تھے، وہ سناٹے میں تھے۔ شاستری کو بھی اس حملے کی امید نہیں تھی۔
ایس ایچ او دہاڑا۔' آپ ہمارا کیا بگاڑ لیں گے۔' وہ قہقہہ لگا رہا تھا۔ تم سب پاکستانی ہو۔ دفع ہو جاؤ۔'

ہم پولیس اسٹیشن کے باہر کھڑے تھے۔ کمزور اور شکستہ۔ کسی کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔
' یہ سب جانتے ہیں کہ ہم کھوکھلے لوگ ہیں۔' شاستری کی درد بھری آواز گونجی۔
' اور....ب.....ز.....دل....' کامریڈ رفیق نے کہا۔
' سمیرا کہاں گئی؟' میرے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔
' پتہ نہیں۔ ہجوم اپنے ساتھ لے گیا۔'
' مگر کہاں؟'
' یہ بھی پتہ نہیں۔'
شاستری کی آواز زہر میں ڈوبی تھی۔ جب میانمار جل رہا تھا، آنگ سانگ سو چی تشدد کو لے کر جشن منا رہی تھی۔ آج ۲۶ رجنوری ہے۔ کچھ مسلمانوں کو ہلاک کر کے مشن جشن کا انتظام کر رہی ہے۔
' اور ایک بیٹی غائب ہے۔'
' ابھی ہزاروں بیٹیاں غائب ہوں گی۔ کوئی ایف آئی آر درج نہیں ہوگی۔ ہم سب کو پاکستانی کہہ کر بھگا دیا جائے گا۔' ارون کمار ایک سینئر صحافی تھے۔ ان کی آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔' لوگ بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کیے جا رہے ہیں۔ انصاف چند لوگوں کے ہاتھوں کی کٹھ پتلیاں بن چکا ہے۔ ویڈیو کلپ موجود ہے مگر پولیس اس معاملے کو دوسرا رُخ دے رہی ہے۔ ہمیں کھلے عام پاکستانی کہا جا رہا ہے۔ اور ہم کسی میڈیا چینل تک اپنی آواز نہیں پہنچا سکتے۔ اتنی دیر میں ہر ٹی وی چینل کا رپورٹر یہاں آ چکا ہوتا۔ مگر ہر رپورٹر کو پہلے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے کہاں جانا ہے اور کہاں نہیں۔ ایک بچی غائب ہے اور پولیس نے ایف آئی آر لکھنے میں بھی ہاتھ کھینچ لیا۔'
' آخر ان کی نیت کیا ہے، منشا کیا ہے۔' شاستری کی آواز کمزور تھی۔ کیا بی مشن چاہتا ہے کہ پانی اس قدر سر سے بلند ہو جائے کہ مسلمان اپنے لیے آزاد ملک کی مانگ کرنے لگیں۔ ہم جانتے ہیں، ایسا نہیں ہوگا۔ ہندوستانی مسلمان اس حد تک کمزور ہو چکا ہے کہ ایک بیٹی کے لیے انصاف نہیں مانگ سکتا۔'
' لیکن آپ تو ہیں۔' میں کہتے کہتے ٹھہر گیا۔
' ہم کتنی طاقت اور تعداد میں ہیں۔ ہمیں بھی توڑ دیا گیا ہے۔ اگر ہم مضبوط ہوتے تو کیا تھانے سے بھگا دیے جاتے۔'
میں سمجھنے سے قاصر تھا کہ فرسٹ انفارمیشن رپورٹ کسی بھی طرح کی مجرمانہ واردات ہونے کے بعد پولیس کو لکھنے کا حق حاصل ہے۔ پولیس ایف آئی آر لکھنے کے بعد ہی جانچ پڑتال شروع کرتی ہے۔ لیکن ایس ایچ او ایف آئی آر لکھنے سے منع کر رہا تھا۔ ہجومی تشدد کو

ایک معمولی واقعہ ٹھہرا رہا تھا۔ شاستری نے باہر نکل کر ایک سینئر افسر اور مجسٹریٹ سے بھی فون پر بات کی۔ پولیس اگر ایف آئی آر درج نہیں کرتی تو مجسٹریٹ سے اس کی شکایت کی جاسکتی ہے۔ مگر مجسٹریٹ نے بھی اس معاملے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ فرید کے مطابق کل کی خبر ہوگی کہ بچہ چرانے والے گروہ کے کچھ لوگ مارے گئے۔ شاستری نے وہاں موجود لوگوں کو رُکنے کے لیے کہا۔ انہوں نے کئی جگہوں پر فون کیا۔ کچھ اخبار کے دفتر میں بھی۔ کچھ سینئر صحافیوں کو بھی آنے کے لیے کہا۔ دو گھنٹے بعد تھانے کے باہر تقریباً تین سو آدمی جمع ہو چکے تھا۔ پولیس کے خلاف نعرے لگنے لگے۔ ایف آئی آر کے لیے تمام سہولتیں ہونے کے باوجود تین سو لوگوں کی بھیڑ کچھ بھی کر پانے میں ناکام تھی۔ جبکہ قانون کے مطابق اگر ایف آئی آر رجسٹر نہ ہو تو سی آر پی سی کے سیکشن (3)156 کے تحت میٹروپولیٹن مجسٹریٹ کے پاس شکایت کی جاسکتی ہے۔ سپریم کورٹ ایکشن لے سکتی ہے۔ آن لائن شکایت بھی درج کرائی جاسکتی ہے۔ اس علاقہ کی پولیس ویب سائٹ پر جا کر بھی پراسیس کو فالو کیا جاسکتا ہے۔ ایس ایچ او نے فون کر کے اسپیشل فورس کو بلالیا۔ لاٹھی ڈنڈے چلے، آنسو گیس چھوڑی گئی اور طاقت کا یہ حربہ بھی ناکام رہا۔

میں شاستری کے ساتھ پارٹی آفس آ گیا۔ کامریڈ شاستری شکست خوردہ نظر آ رہے تھے۔ وہ کچھ دیر تک کمرے میں ٹہلتے رہے۔ پھر میری طرف مڑے۔

'ہم عام انسانی اور ہندوستانی حقوق سے بھی محروم ہو چکے ہیں۔ پہلی بار احساس ہوا کہ ہم ان کی طاقت کے آگے زیرو ہیں۔'

'کیا ہم سپریم کورٹ نہیں جاسکتے؟'

'وہاں کیا ہوگا؟' شاستری جی نے میری طرف دیکھا۔ چند مسلمانوں کی موت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ لیکن ہم جائیں گے۔ ہم انصاف کو مرنے نہیں دیں گے۔ کہیں تو انصاف زندہ ہوگا۔ کبھی تو کوئی شروعات ہوگی۔'

'شروعات؟' میں زور سے ہنسا۔ 'یہ معاملہ اردو اخباروں میں آ جائے تو آ جائے کسی دوسرے اخبار کو اس خبر میں کوئی دلچسپی نہیں ہوگی۔ آپ دیکھ لیجیے گا، دوسرے دن سبحان علی کی موت کی کیا سرخی بنتی ہے۔'

اسی دن شام کو سارہ کو لے کر میں سبحان علی مرحوم کے گھر پہنچا۔ کافی دیر تک دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد سعدیہ نے دروازہ کھولا۔ وہ نیم جاں بن کر رہ گئی تھی۔ اس نے بتایا کہ کئی بار پولیس والے آ چکے ہیں۔ وہ رونا تک بھول چکی ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ چیونٹیاں دوبارہ آ گئی ہیں۔ سرخ چیونٹیاں.... سارہ نے سعدیہ کو گھر چلنے کے لیے کہا، مگر سعدیہ کا کہنا تھا کہ اس کی سمیرا واپس آ سکتی ہے۔ وہ سمیرا کا انتظار کرے گی۔

دوسرے دن معلوم ہوا کہ بچہ چوری کے الزام میں شک کی بنیاد پر پولیس نے سعدیہ کو حراست میں لے لیا۔ اس سے کئی جگہوں پر انگوٹھے کے نشان لیے گئے۔ پولیس اپنی کارروائی میں مصروف تھی۔ کامریڈ شاستری کے ساتھ ہمارا قافلہ ایک بار پھر ایس ایچ او سے ملا۔ ایس ایچ او نے سعدیہ سے ملنے کے لیے صاف طور پر منع کر دیا۔ ایس ایچ او کے مطابق، اس کے پاس پختہ ثبوت ہیں.....اور ابھی تفتیش آگے چل رہی ہے۔

شاستری نے باہر آ کر کہا۔ خاموش رہنے کا مطلب ہے کہ مظالم اور اس طرح کی وارداتیں ہوتی رہیں گی۔ اب ہمیں سپریم کورٹ میں عرضی ڈالنی ہوگی۔ کچھ بڑے وکیلوں سے بات کرنی ہوگی۔ کامریڈ شاستری کچھ سوچ رہے تھے۔

’ تم کو یاد ہے جہانگیر، سبحان علی نے مرتے ہوئے جادوگر کو یاد کیا تھا۔‘

’ ہاں مجھے بھی حیرت ہے۔‘

’ وہ کہنا کیا چاہتا تھا، کیا اس نے ان تشدد پسندوں کے ساتھ جادوگر کو دیکھا تھا یا...‘

’ پتہ نہیں۔ شاید وہ جادوگر سے خوف زدہ تھا۔‘

’ جادوگر...‘ شاستری کچھ کہتے ہوئے رُک گئے۔

ایس ایچ او نے روہن اور نتن کو تھانے بلایا تھا۔ اس وقت دونوں ڈرے سہمے ہوئے تھانے سے باہر نکل رہے تھے۔ شاستری اور مجھے دیکھ کر دونوں رُک گئے۔ نتن اور روہن دونوں کا چہرہ سوجا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے تھانے میں پٹائی ہوئی ہو۔

روہن نے بتایا کہ اس کا ویڈیو ڈیلیٹ کر دیا۔ اور اس معاملے سے دور رہنے کو کہا گیا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ویڈیو جب وائرل ہوا تو اسے بی مشن کے بھکتوں کی طرف سے خوب گالیاں دی گئیں۔

نتن خاموش رہا۔

روہن نے کہا۔ گھر والوں نے بھی کچھ بولنے سے منع کیا ہے۔

اس نے یہ بھی بتایا کہ ممکن ہے دونوں کو گھر والے کچھ دنوں کے لیے باہر بھیج دیں۔ لیکن ہم آپ کے ساتھ ہیں انکل۔

دونوں آگے بڑھ گئے۔ شاستری جی نے میری طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر امید کی ہلکی سی جھلک نظر آئی۔

’ بہت ساودھان رہنے کی ضرورت ہے۔‘

’ یہ ملک ہم سے چھین لیا گیا۔‘ میرا لہجہ کمزور تھا۔ میں اس سے آگے کچھ کہنا نہیں چاہتا تھا۔ راستے بدل گئے۔ سمیرا کہاں گئی ہوگی، کس حال میں ہوگی، یہ بات مجھے پریشان کر رہی تھی۔

(۶)

دوسرے دن ہندی اور انگریزی اخباروں نے اپنے حساب سے سرخیاں لگائی تھیں۔ خبر میں کہیں بھی پرچم کشائی کا تذکرہ تک نہیں تھا۔ بچہ چوری کی افواہ پر ہجوم مشتعل۔ پانچ لوگ مارے گئے۔ ایک پندرہ برس کی بچی غائب ہے۔ گروہ کی ساتھی عورت کو پولیس نے اپنی کسٹڈی میں لے لیا ہے۔ اردو اخباروں میں ہجومی تشدد، پرچم کشائی کا ذکر تھا۔ یہ بھی لکھا تھا کہ غنڈے زعفرانی پرچم لے کر آئے تھے اور ترنگے کو لہرانے نہیں دیا گیا۔ بڑھتے ہوئے ہجومی تشدد پر اردو اخباروں نے ناراضی کا مظاہرہ کیا تھا۔

آج مطلع صاف تھا۔ سورج چمک رہا تھا۔ ۲۶/جنوری گزر چکی تھی۔ سڑک سے ٹریفک کا شور سنائی دے رہا تھا۔ مجھے بار بار ایک ہی آواز سنائی دے رہی تھی۔ جادوگر۔ سبحان علی نے مرتے وقت اس لفظ کی ادائیگی کیوں کی؟ کیا جادوگر کہیں قریب تھا۔ کیا اس نے جادوگر کو دیکھا تھا۔ کیا وہ ہجوم جو سبحان علی اور ساتھیوں کو مارنے آیا تھا، سارے کے سارے جادوگر تھے۔ جبکہ ان لوگوں نے کوئی نقاب نہیں لگائی تھی اور ان میں کئی کے چہرے واضح تھے جس کی بنیاد پر ان کی گرفتاری عمل میں آسکتی تھی۔ مگر یہ کوئی پہلی بار نہیں تھا۔ جرم ہوتے تھے، ویڈیو بنتے تھے اور مجرم شان سے سڑکوں پر گھومتا تھا بلکہ کبھی کبھی ایسے مجرموں کو اعلیٰ عہدوں پر بھی جگہ مل جاتی تھی۔ میں ان تمام کڑیوں کو جوڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سب سے پہلے محمد فرقان کا قتل۔ پھر شاہنواز قادری اور زرین حیدر کا قتل۔ پھر ناظم کا قتل۔ اور اب سبحان علی

جس کا بی مشن سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ مگر جو جمہوریت اور آئین پر بھروسہ رکھتے ہوئے جمہوریت کے جشن کو منانے کا خواہشمند تھا، لیکن سبحان علی کو کیا ملا۔ انگریزی کے ایک بڑے اخبار نے سبحان علی کی خبر کو سرخیوں میں جگہ دی تھی۔ اس اخبار پر کئی مقدمے چل رہے تھے۔ اس اخبار نے صاف صاف لکھا تھا کہ یہ قتل ایک بڑی سازش کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ سب سے پہلے اخبار نے ملک میں بڑھتی فاشسٹ طاقتوں کی طرف اشارہ کیا تھا جو آئین، قانون اور ملک کی جمہوریت سے کھیل رہی تھیں۔ ترنگا کی جگہ بی مشن کا زعفرانی پرچم لہرانے والے محبّ وطن نہیں ہوسکتے۔ اخبار نے صاف لکھا تھا کہ کچھ دنوں بعد ترنگا کی اہمیت ختم کردی جائے گی۔ بی مشن کے کچھ کارکن کے ایسے ویڈیو بھی آئے تھے جو ترنگا کو اپنے پاؤں سے روندر ہے تھے یا کھانے کے بعد ترنگا سے منہ صاف کرر ہے تھے۔ ایک ویڈیو کا بھی ذکر تھا جس میں ایک خاتون ترنگا اور گاندھی پر گولیاں برسا رہی تھیں۔ اخبار نے سبحان علی کے قتل کو ایک بے رحم اور سنگین قتل قرار دیتے ہوئے لکھا تھا کہ اس قتل کے ذریعے غنڈوں نے یہ پیغام دینے کی کوشش کی ہے کہ ترنگا لہرانا مسلمانوں کا کام نہیں ہے۔ مسلمانوں کے اندر حب الوطنی کا کوئی جذبہ نہیں ہے۔ اور اس لیے حملہ اس وقت کیا گیا جب سبحان علی پرچم کشائی کرنے والے تھے مگر ہجوم نے سبحان علی اور ساتھیوں کو اس کا موقع نہیں دیا۔ اس خبر کے سامنے آنے کے بعد سبحان علی کا معاملہ زور شور سے پارلیمنٹ میں بھی اٹھایا گیا۔ اب اس بات کا یقین ہوگیا تھا کہ اس معاملے کو دبانا میڈیا کے لیے بھی آسان نہیں ہوگا۔ میڈیا ابھی بھی قتل کو بچہ چوری کا معاملہ بتا رہا تھا۔ سعدیہ سے ایس ایچ او نے جو بات کی تھی، اس کی بھی تفصیل باکس میں دی گئی تھی۔

' کب سے بچہ چوری کر رہی ہو۔'

' جی...' ' اس کا مطلب بہت دنوں سے۔'

' میں گھریلو عورت ہوں۔'

' یہ کام ان دنوں گھریلو عورتیں ہی کر رہی ہیں۔'

' چوری کیسے کرتی ہو؟'

' جی۔'

' بچوں کو کہاں چھپاتی ہو....'

جی....(رونے کی آواز)....میری بیٹی غائب ہے۔ میرے شوہر کی ہتیا کر دی گئی۔

' تو تمہارے کام میں شوہر بھی شامل تھے۔'

' جی....'

' اس کا مطلب تم اقرار کرتی ہو۔'

' نہیں۔'

' ابھی تم نے جی کہا....'

' میں ہوش میں نہیں ہوں۔'

' مگر اس وقت پوری طرح ہوش میں نظر آ رہی ہو۔'

' جی...'

' تمہارے گروہ میں کتنے لوگ ہیں۔ دس؟ پندرہ....؟'

' جی۔'
' مطلب پندرہ لوگ ہیں۔'
' نہیں۔'
' ابھی تم نے اقرار کیا کہ پندرہ لوگ ہیں۔ان کے نام بتاؤ۔'
' میں نہیں جانتی۔'
' اس کا مطلب تم اپنے ساتھیوں کے بارے میں بتانا نہیں چاہتی۔'
' جی۔'
' اس کو لاک اپ میں بند کرو۔'
سبحان علی کے حادثے سے، سارہ سے زیادہ پاشا مرزا متاثر ہوئے تھے۔انہوں نے پہلا سوال یہی کیا۔
کیا ہم ہندوستانی نہیں۔
' ہیں۔'
' یہ آپ کہہ رہے ہیں۔'
' وہ جو کہتے ہیں کہنے دو۔'
' کیسے کہنے دوں۔ان کی تعداد بڑی ہے۔'
' کسی کے کہنے سے ہم غیر ملکی نہیں ہو جاتے۔'
' لیکن ہمیں غیر ملکی کہا جا رہا ہے۔'
' کہنے دو۔'
' یہ کوئی جواب نہیں ہے۔ہم ایک ترنگا نہیں لہرا سکتے۔'
' وہ یہی چاہتے ہیں۔'
' تو پھر ہم بزدل بن جائیں۔؟'
میں ہاں کہتے کہتے رُک گیا۔
' آپ کو لگتا ہے، اس سسٹم میں ہم جی سکتے ہیں۔؟'
' خود پر اعتبار کرو۔'
' اب اعتبار ٹوٹ رہا ہے۔'
' اعتبار کو ٹوٹنے مت دو۔'
' کل سبحان علی، پرسوں آپ، کسی دن میرا نمبر بھی آ سکتا ہے۔'
' ہاں۔'
' اور آپ کہتے ہیں خود پر اعتبار کروں۔'
' راستہ کیا ہے۔'

پاشا مرزا زور سے چلائے۔ 'راستہ نہیں تو راستہ بنائیے۔ گھٹن ہوتی ہے اب۔'

' کیا تمہارے سارے دوست.....'

' نہیں۔ میرے دوست میرے جیسے ہیں۔'

' تو پھر اعتبار کرنا سیکھو۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

لیکن مجھے احساس تھا، میرے لفظ کھوکھلے ہیں۔ اور پاشا مرزا میرے جواب سے مطمئن نہیں۔ میرے نزدیک سب سے بڑا خطرہ یہی تھا۔ یہ نوجوان نسل، یہ کسی کی نہیں سنے گی ایک دن یہ نسل بغاوت کر سکتی ہے۔ لیکن مجھے اس بغاوت کا انجام معلوم تھا اور یہ بھی کہ نوجوانوں کو بغاوت کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔

میں اس معاملے میں خوش قسمت تھا کہ سارہ میری زندگی کا اہم حصہ تھی۔ ہولناک زندگی مبارک، جب کمرے میں وہ آئی تو میں نے ایک طنزیہ کلمہ ادا کیا، یہ میرے دل کی آواز تھی۔ اور سارہ میرے چہرے کے مدوجزر کا جائزہ لے رہی تھی۔ وہ قریب بیٹھ گئی۔ اس نے میرے ہاتھوں کو تھام لیا۔ آہستہ سے کہا، تم سے جدائی کا تصور بھی سوہان روح ہے مگر تم بدل رہے ہو۔ برسوں کے بیمار لگ رہے ہو۔ میں کچھ دنوں سے سوچ رہی تھی کہ تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلوں۔

' ایک معجزہ ستاروں کو زمین پر لانے والا ہے۔۔'

' تم۔ تب تم اپنی پچاسویں سالگرہ مناؤ گے۔'

ایسا نہیں ہوگا۔ میرے لبوں کنارے پراسرار مسکراہٹ تیر رہی تھی۔

' ایسا کیوں کہتے ہو...اس دن میں تمہارے لیے ایک خاص مشروب تیار کروں گی۔'

' اس دن آسمان سے سارے کبوتر اڑ جائیں گے۔'

' اس دن میں سرخ چیونٹیوں کو بچاؤں گی۔'

میں چونک گیا۔ سارہ نے پیار سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ سرخ چیونٹیوں کو ہیٹ، دھواں یہاں تک کہ زہریلی گیسوں سے ہلاک کیا جا رہا ہے۔'

' وہ ہمیں ہلاک کر رہی ہیں۔'

' تم خوفزدہ ہو۔ میں تمہاری ۴۸ ویں سالگرہ کا انتظار کروں گی۔ اس دن میں ایک غبارہ لاؤں گی اور اسے آسمان پر اڑا دوں گی۔ تم بلندی پر ہو گے۔'

' مجھے بلندیوں سے ڈر لگتا ہے۔' ایک بار پھر میرے لہجے میں افسردگی سما گئی تھی۔ میرا ملک گم ہو رہا ہے۔'

' کہیں بھی گم نہیں ہو رہا۔ ایک بادشاہ نے اپنی تین شہزادیوں کے لیے راستے میں تین جلتے ہوئے دیے رکھ دیے تھے۔'

' کیوں۔'

' شہزادیوں کی آزمائش تھی۔ انہیں ان تین جلتے ہوئے دیوں سے گزرنا تھا۔'

' پھر۔'

' ایک کو کامیابی ملی۔ وہ آرام سے گزر گئی۔ یہ ایک تم ہو۔ شہزادے۔ فکر کیوں کرتے ہو۔'

' ایک خوفناک ستارہ ہمارے تعاقب میں ہے۔'

’ میں اسے وہیں روک دوں گی‘ سارہ کے لہجے میں دنیا جہان کا پیار سمٹ آیا تھا۔
میری الجھن کسی حد تک کم ہوئی تھی مگر میں یہ نہیں جانتا تھا کہ ابھی ایک اور خوفناک خبر مجھے پریشان کرنے والی ہے۔ یہ معاملہ دوسرے دن سامنے آیا۔

(۷)

اس رات تیز بارش ہوئی تھی۔ کھڑکی سے باہر مجھے ڈراکیولا نظر آرہا تھا۔ اس کے جبڑے پھیلے ہوئے تھے اور ہونٹ خون سے تر تھے۔ کیا کچھ ہونے والا ہے۔؟ مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ چند دن قبل پیش آنے والے واقعات وحادثات نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ میں نے کمرہ روشن کیا۔ کرسی پر بیٹھ گیا۔ ڈائری کھولی اور لکھنے لگا۔

’ کیا ہم ایک ایسی گھٹن اور غلامی کا شکار نہیں، جہاں سارے راستے بند ہیں اور اس کے باوجود ہم میں سے بیشتر لوگ سکون اور سہولت پسند زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ یا یہ طریقہ ایسے لوگوں نے صرف اس لیے اختیار کیا ہے کہ ان پر کسی طرح کی آنچ نہ آئے اور وہ حالات کے جبر سے محفوظ رہ سکیں۔ جبکہ ایسے لوگ اس بات سے واقف نہیں کہ حالات کا شکنجہ آہستہ آہستہ ان پر بھی کستا جارہا ہے۔

تحفظ دینے والی ایک ایسی پناہ گاہ جسے بی مشن کہتے ہیں، جب اس کا ہر قدم آپ کے خلاف ہو تو یہ سوچنا لازمی ہوجاتا ہے کہ ہمارا مستقبل کیا ہوگا؟ اور آج کے خوفناک حالات کا جبر ہمیں کب تک سہنا ہوگا۔؟ ایک ایسا مشن جس نے ہر اس شخص یا حکمراں سے دوستی کی جو مسلم مخالف ہے....اسرائیل، امریکہ کے بعد یہ سلسلہ روہنگیا سے آگے بھی قائم ہے اور یہ سلسلہ آگے بھی اسی طرح چلتا رہے گا۔ جب روہنگیائی مسلمانوں کو نوبل انعام یافتہ حکمراں کے اشاروں پر ملک بدر اور ہلاک کیا جارہا تھا، ہمارے محافظ نے اس حکمراں سے ملنے کے لیے یہی وقت مقرر کیا۔ جب معصوم بچے، جوان، نابالغ لڑکیوں کی عصمت لوٹی جارہی تھی۔، جب توپ کے گولوں سے انہیں اڑایا جارہا تھا۔ ایک خفیہ میٹنگ میں دربدری کے فرمان کی حمایت کی جارہی تھی۔

جب اسرائیلی فتنہ فلسطین پر موت کی بارش کررہا تھا، جب امریکی حکمراں ٹرمپ مسلم ممالک پر پابندیاں عائد کررہا تھا، ہمارے محافظ حکمراں ان حکمرانوں سے ملاقات اور تبادلۂ خیال کررہے تھے۔ کیا اب بھی یہ خیال یا یہ سوچنا دشوار ہے کہ ہمارے محافظ، ہمارے حکمراں، ہم سے انتقام کی سیاست کررہے ہیں۔

سچ بولنے والی سبحان

علی کی زبان خاموش کردی گئی۔ آگے بھی ایسے لوگوں کے نام موت کے فرمان جاری ہوں گے۔ لیکن ان لوگوں میں جرأت تھی، بولنے کا حوصلہ تھا، موت کو گلے لگانے کی آزادی تھی، یہ آزادی اس لیے حاصل تھی کہ ان لوگوں نے ذہنی غلامی پر حق بات کو فوقیت دی تھی۔ غور کریں تو یہ لوگ تھے جو ہمارے لیے بھی لڑتے رہے۔ ہمارے خلاف اٹھنے والی آوازوں کا جواب دیتے رہے، لیکن ہم کیا کررہے ہیں؟ ہم میں جرأت اور حوصلے کی کمی کیوں ہے؟ اپنی قوم کا تجزیہ کرتا ہوں تو ایک سوئی ہوئی بدقسمت قوم کا تصور سامنے آتا ہے۔ قدیم مصر کی کہانیوں میں مردہ جسم کو ممی میں محفوظ کرنے کی کہانیاں میں نے بھی پڑھی ہیں۔ اہرام کی تعمیر کے عظیم دور میں یہ رسم تھی کہ ہرم کے وسط میں فرعون کی لاش ایسے کمرے میں رکھتے جسے ایک چٹان تراش کر بنایا جاتا۔ لاش دفناتے وقت مختلف رسومات ادا کی جاتیں۔ یہ رسومات اب بھی خاموشی سے ادا کی جارہی ہیں اور آندھی خاموش ہے۔‘

لکھتے لکھتے کب نیند آ گئی پتہ بھی نہیں چلا۔ دوسرے دن کا اخبار سمیرا علی کی موت سے بھرا پڑا تھا۔ سمیرا کو ایک خفیہ جگہ پر اغوا کر کے رکھا گیا۔ ۲۸ رجنوری اس کا گلا دبا کر، پتھر مار کر قتل کر دیا گیا۔ اس درمیان دس پندرہ لوگوں نے مسلسل اس کو ہوس کا شکار بنایا۔ ان میں پولیس والے بھی تھے۔ لاش مجنوں کے ٹیلے کے پاس ملی تھی۔ میڈیا کو پندرہ برس کی بچی پر ترس آ گیا تھا۔ انجام یہ ہوا کہ کچھ دانشوروں اور وکلا نے مجرموں کے دفاع اور حمایت میں جلوس نکالا۔ ہندوستانی تاریخ کا یہ بالکل نیا صفحہ تھا جب آبروریزی اور عصمت دری کی وکالت کی جا رہی تھی۔ ان میں خواتین بھی شامل تھیں۔ دو تین دن کے اندر پورے ملک میں اس معاملے نے طول پکڑ لیا۔ کینڈل جلوس نکالے گئے۔ سمیرا کے لیے پرارتھنا سبھا کی گئی۔ عالمی سطح پر ہندوستان کا گراف کچھ اور نیچے آ گیا۔ اس بات کا مذاق اڑایا گیا کہ کوئی ملک ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ جہاں عصمت دری کی حمایت میں جلوس نکالا جائے۔ اس جگہ بھی جادوگر کو دیکھا گیا تھا۔ رام لیلا گراؤنڈ، منڈی ہاؤس جیسی جگہوں پر سمیرا کو لے کر احتجاج کرنے والوں کی بھی کمی نہیں تھی۔

کامریڈ فرید جس یوٹیوب چینل کو دیکھتا تھا، اس کا نام وی انڈین تھا۔ وی انڈین کے لیے سبحان علی اور سمیرا کو لے کر میں نے خاص رپورٹ تیار کی۔ میں نے اس بات سے شروعات کی تھی کہ جادوگر کون ہے؟ سبحان علی کے منہ سے آخری لفظ جادوگر ادا کیوں ہوا۔ میڈیا اور چینلز نے سبحان علی کو بچہ چور بنا کر کیوں پیش کیا۔ جبکہ وہ ایک سینئر صحافی تھا۔ ویڈیو کلپنگ ہونے کے باوجود مجرم آزاد کیوں گھوم رہے ہیں۔ میرے پاس ان مجرموں کی ایک طویل فہرست تھی جو جرم اور گناہوں کے بعد بھی رہائی پا گئے تھے اور ان کے خلاف کسی طرح کا جرم ثابت نہیں ہو سکا تھا۔ سمیرا اسی وقت غائب ہوئی جب ہجوم نے سبحان علی پر حملہ کیا تھا۔ پھر سمیرا کی تلاش کے لیے پولیس نے ان لوگوں سے پوچھ تاچھ کیوں نہیں کی۔؟ سمیرا کے گینگ ریپ کے بعد بھی مجرموں کی حمایت کرنے والے کون لوگ ہیں اور ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ کیا آپس کی بڑھتی ہوئی نفرت ۱۹۴۷ کے شعلوں سے بھی آگے نکل چکی ہے۔؟ میں جانتا تھا، ان سوالوں کا جواب کسی کے پاس نہیں ہوگا۔ بی مشن کو پتہ ہے کہ مٹھی بھر لوگوں سے ملک نہیں چلتا۔ اور اس لیے مٹھی بھر لوگوں کا احتجاج وقت گزرنے کے ساتھ دم توڑ دیتا ہے۔ جادوگر زندہ باد، جادوگر کی پرستش کرنی چاہیے۔ جادوگر، جادوگر...'

میں اچانک چونکا.... یہ میں کیا لکھ رہا ہوں۔ مجھے احساس ہوا، رپورٹ کی جگہ میں پورے صفحے پر جادوگر کا نام لکھتا جا رہا ہوں۔ اس وقت ہوا تیز تھی۔ کھڑکی کھلی تھی۔ مجھے احساس ہوا، کوئی سایہ ہے، جو اچانک کھڑکی سے ہٹا ہے۔ میں تیزی سے کھڑکی کی طرف بڑھا.... اور مجھے احساس ہے کہ کوئی تھا جس کے سر پر بڑا سی سی سیاہ کیپ تھی، جس نے جوتے بھی سیاہ پہن رکھے تھے۔ اور لباس بھی سیاہ تھا۔ وہ کسی ویمپائر کی طرح رینگتا ہوا کھڑکی کی دیواروں کے نیچے اتر رہا تھا۔ میرا سر گھوم رہا تھا۔ مجھے چکّر آ رہے تھے۔ میں نے سارہ کو آواز دینا چاہی تو میرے منہ سے سارہ کی جگہ جادوگر کا لفظ نکلا۔ سارہ دوڑتی ہوئی آئی، وہ حیران تھی کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں نے اشارہ کیا، کھڑکی پر کوئی تھا۔ مگر میری زبان سے مسلسل جادوگر کے لفظ کی ادائیگی ہو رہی تھی۔ کچھ دیر کے لیے پاشا مرزا بھی کمرے میں آئے۔ مجھے طنزیہ نظروں سے دیکھا اور چلے گئے۔

سارہ آہستہ سے بولی۔ حادثوں نے تمہیں بیمار کر دیا ہے۔

' وہ ابھی تھا۔ اس کمرے میں....' حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

' یہاں کوئی نہیں ہے۔'

' جادوگر....' میں نے دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ دیوار اچانک اسکرین میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اسکرین پر جادوگر کھڑا تھا۔ کیپ کی

وجہ سے اس کا چہرہ چھپ گیا تھا۔ مجھے یقین ہے، اس نے دس لاکھ کا سوٹ پہن رکھا تھا اور یقیناً اگر وہ اپنے چہرے کو ذرا سا اوپر اٹھاتا تو میں اس کی آنکھوں میں شیطانی چمک آسانی سے محسوس کر سکتا تھا۔

کافی دنوں بعد تارا دیش پانڈے کا فون آیا تھا۔
'کیسے ہو بدنما انسان؟'
میں زور سے ہنسا اور جادوگرنی کہتے کہتے ٹھہر گیا۔
'پورے جانور ہو۔'
'وہ تو ہوں۔'
'نوکری بھی چھوڑ دی۔ کامریڈ بن گئے۔ کیا حقیقت میں اس ملک میں کوئی کامریڈ ہے؟'
'میں'
'تم؟ تم نہیں ہو۔ تم موقع پرست ہو' تارا زور سے ہنسی۔ کافی دن ہو گئے۔ ملنے کی کوشش کرو۔
تارا سے ملاقات کا یہ ایک اچھا موقع تھا۔ میں خود بھی تارا سے ملنا چاہتا تھا۔

◆◆

کامریڈ فرید جب کامریڈ شاستری سے ملنے ان کے گھر گیا تو وہ پریشان نظر آئے۔ ان کا گھر پروفیسر کالونی کے قریب ایک سرکاری فلیٹ میں تھا۔

دو کمرے تھے۔ ایک بیٹی تھی، جس کی شادی ہو چکی تھی۔ شاستری نے ساری زندگی کمیونسٹ پارٹی کے نام کر دی تھی۔ اس وقت وہ کچھ پریشان تھے۔ کامریڈ فرید نے ان کی طرف دیکھا۔ پھر اپنا مدعا بیان کیا....
'منڈی.... ہا....ؤس.... میں....'
'میں نہیں جاؤں گا۔' شاستری ٹہلتے ہوئے ٹھہرے۔ کرسی پر بیٹھ گئے۔
'ک.... کیوں نہیں جائیں گے۔'
'میں بوڑھا ہو رہا ہوں۔'
کامریڈ فرید نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ آپ کے بغیر کیسے.....ہوگا....'
'میرے بغیر دنیا نہیں چلتی۔' کامریڈ شاستری زور سے بولے۔ دیکھ رہے ہو، مغربی بنگال میں کمیونسٹ پارٹی سے نکل کر کچھ ممبر بی مشن میں شامل ہو گئے۔ بہار میں ماؤوادی کیڈر کا ایک لیڈر بی مشن کے لیے کام کر رہا ہے۔ یہ دنیا کچھ کرنے کے لیے چھوٹی پڑ گئی ہے۔'
'کچھ لوگ نراش ہیں۔'
'مجبوری بھی ہو سکتی ہے۔ ستّہ، پاور، طاقت۔ ہم نے کبھی اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔ جن ریاستوں میں ہم تھے وہاں بھی بکھرتے چلے گئے۔'
'تو.... آپ.... نہیں.... جائیں گے۔' کامریڈ فرید مایوس تھا۔

’ ابھی مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔‘ کامریڈ شاستری نے سر جھکا لیا۔

’ ٹھیک ہے، میں چلتا ہوں‘

منڈی ہاؤس میں ۵۰ سے ۶۰ لوگ جمع ہو چکے تھے۔ ان کے ہاتھ میں سمیرا کے نام کے بینر بھی تھے۔ سمیرا کو انصاف دو کے نعرے بھی لگ رہے تھے۔ ان میں کچھ دانشور تھے، کچھ بڑے ادیب، فلمی دنیا کے بھی دو تین لوگ تھے۔ کچھ صحافی تھے۔ کامریڈ رفیق، سعدیہ علی کے ساتھ پہنچا تھا۔ سعدیہ کو بیل مل گئی تھی مگر وہ ابھی بھی اپنے ہوش وحواس میں نہیں تھی۔ پارٹی کی دو خاتون کیڈر سعدیہ علی کے ساتھ تھیں۔ چرن جیت سنگھ بھی تھے۔ جنہوں نے سب سے پہلے سبحان علی کے لیے آواز بلند کی تھی۔ روہن اور نتن اپنے ڈیڈی کے ساتھ آئے تھے۔ کچھ دیر تک شاستری کا انتظار رہا۔ پھر نعرے لگنے لگے۔ سمیرا کی تصویر کئی لوگوں کے ہاتھوں میں تھی۔

میں سعدیہ کو دیکھ رہا تھا۔ ۲۶ر جنوری سے ایک دن قبل کی سعدیہ کوئی اور تھی۔ ایک دن میں وقت تبدیل ہو گیا.... جادوگر.... سبحان علی کے آخری الفاظ مجھے یاد آئے۔ تقریر شروع ہو چکی تھی۔ سب سے پہلے چرن جیت سنگھ نے بولنا شروع کیا۔ مفہوم یہی تھا کہ بڑی جنگ کے لیے سب کو ساتھ مل کر ساتھ آنا ہوگا۔ وہ اس حادثہ کے چشم دید گواہ تھے۔ ۵۰ سے ۶۰ لوگوں پر مشتمل ٹولی پورے ملک کو آواز دے رہی تھی۔ چرن جیت سنگھ کے بعد روہن کھڑا ہوا۔ اس نے بتایا کہ اس کا سم توڑ دیا گیا۔ ویڈیو ڈیلیٹ کر دیا گیا۔ اس کے ڈیڈ نے اس کی پٹائی بھی کی، مگر وہ آج ہمارے ساتھ ہیں۔ روہن کے ڈیڈ نے بتایا۔ پہلے میں اس سسٹم سے ڈر گیا۔ میں نے اپنے بیٹے کو مارا۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ میرا بیٹا غلط کہاں ہے۔ یہ بات میں کئی دنوں سے سوچ رہا تھا کہ کیا ہمارا دھرم یہی ہے۔ یہ ہندو ہونا نہیں ہے۔ برا وقت ہندوؤں کے لیے ہے۔ کیونکہ ہندو دھرم کے نام پر جو کچھ کیا جا رہا ہے، وہ دھرم کو بدنام کرنے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ دھرم کو بچانے کے لیے اب ہمیں اٹھنا ہوگا۔ یہی بات نتن اور نتن کے ڈیڈ نے کہی کہ مسلمانوں اور دلتوں سے زیادہ بڑا خطرہ اب ہندو دھرم کو ہے۔

اشتراکی نظریہ کی حمایت کرنے والے فلم میکر مدھوشانت نے صاف طور پر کہا ’کہ یہ چھوٹے موٹے قتل نہیں ہیں، یہ Holocaust ہے، جس کا مطلب ہے، مکمل جلا دینا۔ دوسری جنگ عظیم کے موقع پر ہم یہودیوں کا قتل عام دیکھ چکے ہیں۔‘ سینئر صحافی رمیش دوانے کہا ’کہ اس احتجاج کا فائدہ بھی بی مشن کو ملے گا۔ ہم جو بھی کر رہے ہیں، میڈیا کے ذریعہ فائدہ بی مشن کو پہنچ رہا ہے۔ اور یہی ہماری سب سے بڑی ناکامی ہے۔ انہوں نے ایسا ماحول بنایا ہے کہ ہمارے حصے میں کچھ بھی نہیں، وہ ہلاک بھی کرتے ہیں تو ان کا ووٹ بینک بڑھ جاتا ہے۔‘

اس کے بعد سعدیہ کو آگے لایا گیا۔ اس کا چہرہ زرد تھا۔ آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ یہ منڈی ہاؤس شری رام آرٹ سینٹر کا وہ حصہ تھا، جہاں ادیب اور فنکار ایک دوسرے سے ملتے بھی تھے اور تبادلۂ خیال بھی کرتے تھے۔ ایک وقت تھا، جب یہاں روز نکڑ ناٹک ہوا کرتے تھے۔ اب یہاں کی فضا بھی بہت حد تک تبدیل ہو چکی تھی۔ جب سعدیہ بولنے کے لیے منچ پر لائی گئی، اسی وقت سڑک کے کنارے دو پولیس جیپ آ کر رُکی۔ کچھ پولیس والے تھے، جو جیپ سے اترے اور آہستہ آہستہ مجمع کی طرف بڑھنے لگے۔ سعدیہ کی آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔ وہ دم بخود مجمع کو دیکھ رہی تھی۔ وہ کچھ دیر تک سسکیاں لیتی رہی، پھر اس نے کہنا شروع کیا۔ ’ہم پرچم لہرا رہے تھے، ہمیں بچہ چور بنا دیا گیا۔ میرے شوہر کو بچہ چوری کے الزام میں مار ڈالا گیا۔ مجھے جیل میں بھیج دیا گیا۔ مجھے تو رونے کا موقع بھی نہیں ملا۔ اب نہ شوہر نہ بیٹی، یہ زندگی لے کر کیا کروں گی..... میری بیٹی کو بے رحمی سے مار ڈالا گیا۔ یہ کیسا ملک ہے.....‘

وہ کہتے کہتے ٹھہر گئی۔

ٹھیک اسی وقت پولیس نے لاٹھی چارج کا اشارہ کیا...کچھ افراد نے مدافعت کی کوشش کی تو پولیس نے بے رحمی سے ان پر ڈنڈے برسائے.....

میں ایک طرف ہوگیا۔ یہ شری رام آرٹ سینٹر کا گیٹ تھا۔ یہاں سے ایک دیوار دور تک چلی گئی تھی۔ میں اس دیوار پر کسی کو کھڑے ہو کر قہقہہ لگاتے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ سر پر سیاہ ہیٹ تھا۔

مجمع چھٹ چکا تھا۔

پولیس نے اس مقام کی گھیرا بندی کر دی تھی۔

(۸)

'ارے کوئی سمجھاؤ۔ کوئی سمجھاؤ اس بڈھے کو۔'

کامریڈ اشونی غصے سے کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ کہہ رہا ہے، بڈھا ہوگیا ہے۔ اب مرنے کی عمر ہے۔ پارٹی کا کام نہیں دیکھے گا۔ چھوڑ دے گا پارٹی۔'

'ایسے کیسے چھوڑ دیں گے۔' پروفیسر بھٹا چاریہ بولے۔

پارٹی میٹنگ تھی۔ کامریڈ شاستری آدھا گھنٹہ تاخیر سے پہنچے تھے۔ اور پہنچنے کے بعد ہی انہوں نے کامریڈ قیوم، کامریڈ فرید، پروفیسر بھٹا چاریہ، ارون چڑجی اور پارٹی کے دوسرے کارکنان سے صاف طور پر کہہ دیا اب انہیں پارٹی سے نجات دلائی جائے۔'

چہ می گوئیوں کے درمیان پروفیسر بھٹا چاریہ کا لہجہ سخت اور تیکھا تھا۔ 'تم بی مشن تو نہیں جا رہا۔'

کامریڈ کرما کرنے پروفیسر بھٹا چاریہ کو آنکھیں دکھائیں۔ آپ کو ہمت کیسے ہوئی، یہ کہنے کی۔'

'پھر کیا بات ہوسکتی ہے۔؟'

'یہی تو ہم شاستری جی سے جاننا چاہتے ہیں۔' کامریڈ اشونی زور سے چلائے۔ ہم سے زیادہ بڈھا ہے؟ میری عمر تجھ سے دس سال زیادہ ہوگی۔ مگر تجربہ تیرے برابر نہیں اور سنگٹھن کے لیے جو تو کرسکتا ہے، وہ ہم میں سے کوئی نہیں کرسکتا۔'

'کچھ غلطیاں ہم سے ہوئیں مانتا ہوں۔ مگر آپ تو سب کو ساتھ لے کر چلتے تھے۔

کامریڈ شاستری کے اندر کشمکش چل رہی تھی۔ میں غور سے ان کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور ہوئی تھی جس نے شاستری جیسے انسان کو پریشان کر دیا تھا۔

'تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو ہمارے کئی فیصلے غلط تھے۔' کامریڈ اٹل اٹھ کر ٹہلنے لگے۔ انہوں نے کامریڈ قیوم اور کامریڈ فرید کی طرف دیکھا۔ 'جب ملک تقسیم ہوا، اس وقت بھی ہم کوئی مناسب لائحۂ عمل تیار نہیں کرسکے۔ برٹش حکومت نے فرقہ پرست نظریات کی بنیاد پر حکومت کو تقسیم کیا۔ ہم کیا کر رہے تھے؟ مخالفت یا حمایت؟ ہم کس کے ساتھ تھے، جناح کے؟ نہرو کے؟ گاندھی کے یا انگریزوں کے؟ ملک تقسیم ہوا مگر ہم کوئی جگہ نہیں بنا پائے۔ آج بھی ہمیں حکومت میں رہنے اور حکومت بنانے کا ہنر نہیں آیا۔'

'یہ ان سب باتوں کا موقع نہیں ہے؟ کامریڈ قیوم نے لقمہ دیا۔

' موقع ہے۔' کامریڈ اشونی آگے آئے۔' معاشی اور سماجی برابری اور انصاف۔ ہم مذہب پرستوں کی طرح ہی ایک کڑی تھے۔ اور دنیا بدل رہی تھی۔'

کامریڈ اتل نے کہا۔' پھر بھی ہم مسلسل انتشار کا شکار رہے۔ ہم ہندوستان کی مین اسٹریم کو نہیں سمجھ سکے۔ قومی سوال پر ہمارا کوئی موقف نہیں تھا۔ نوآبادیات کو لے کر ہماری فکر محدود تھی۔'

' ایسا نہیں ہے۔' کامریڈ اشونی کچھ سوچ رہے تھے..... ' جو ہم تھے، وہ عوام تک نہیں پہنچ سکا۔ سرمایہ داری اور سامراجیت کو لے کر ہماری فکر دیگر سیاسی پارٹیوں سے زیادہ مضبوط تھی۔ لیکن ہم دیگر اقوام اور اقلیتوں کو بھی اپنی طرف نہیں لا پائے۔ مسلمان کبھی کانگریس کے ساتھ ہوئے۔ کبھی دیگر سیکولر سیاسی پارٹیوں کے ساتھ۔ ہم مارکس کی ہڈیاں چباتے رہے۔'

کامریڈ قیوم کا لہجہ کمزور تھا۔' دوسری عالمی جنگ کے بعد ہم اپنے کردار کو مضبوطی سے ادا نہیں کر پائے۔ بین الاقوامی معاملات پر ہماری نظر نہیں تھی۔ قومی سطح پر بھی ہم سب کو ساتھ لے کر نہیں چل سکے۔'

شاستری کے چہرے پر الجھن کے آثار تھے۔ انہوں نے غصے سے سب کی طرف دیکھا۔' پرانے اتہاس کے پنوں کی طرف دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا اس وقت ملک میں اس پارٹی کا مستقبل کہیں نظر آتا ہے؟ یہ بات بھی دو برس قبل ابھر کر سامنے آئی تھی کہ کمیونسٹ کی جگہ' ڈیموکریٹک سوشلسٹ پارٹی' نام کر دیا جائے۔ مگر ہمارا کیا۔ ہم پرانے عقیدے اور نظریے سے چپکے ہوئے لوگ ہیں جو کسی نئی تبدیلی کو برداشت نہیں کرتے۔ ۲۰۰۴ میں بھی ہم نے حکومت میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ ہم خدا تھے۔؟ ایک وقت تھا جب جیوتی بسوو زیراعظم بن سکتے تھے۔ نہیں بن سکے۔ آج مغربی بنگال میں ہم تیسرے چوتھے درجے پر کھڑے ہیں۔ ایک دن کیرالہ اور ملک کے تمام حصوں سے غائب ہو جائیں گے۔ کیوں؟ کیونکہ وہ آ چکا ہے۔ وہ تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔ اور وہ ہمیں ہمارے اصولوں کے ساتھ کھا جائے گا۔'

کامریڈ اشونی تیز آواز میں چیخے۔' تو یہ بات ہے۔ آج جب بی مشن ہندوستان کا چہرہ بدلنے والا ہے، آپ بھی بھیس بدل رہے ہیں۔ سب کے چہرے ایک ایک کر کے کھل رہے ہیں۔ کم از کم آپ تو ایسی باتیں نہ کرتے کامریڈ شاستری۔'

' ہندوتو کی کمیونزم پر فتح۔' کامریڈ اتل نے زور سے قہقہہ لگایا۔

' آپ کچھ بھی بولنے کے لیے آزاد ہیں۔ شاستری نے آہستہ سے کہا۔

' م..... میں..... اتنا جانتا ہوں..... کہ..... ابھی ہم..... مردہ..... نہیں ہیں' کامریڈ رفیق نے کافی دیر بعد بحث میں حصہ لیا۔

اشونی نے پارٹی کے بکھرے ہوئے سامان کی طرف دیکھا۔ دیوار کے قریب دو المیر اتھی، جو پرانی ہو چکی تھی۔ میز پر کاغذات پھیلے ہوئے تھے۔ ایک طرف کچھ رسائل اور کتابیں رکھی ہوئی تھیں..... ' ان سب کو ردی کے بھاؤ بیچ دو۔ مگر یہ مت بھولو کہ کبھی ہم اس ملک میں بڑی سیاسی طاقت بھی تھے۔ آزادی سے قبل بھی ہم میں اختلاف تھا۔ مگر ہم ساتھ مل کر کام کرتے رہے۔ ہندوستان ایک فیوڈل ملک تھا۔ جب ہم نے تحریک چلائی تو کسان اور مزدور بھی ہماری طرف متوجہ ہوئے۔ پرائیویٹائزیشن اور گلوبلائزیشن جیسے نعرے آج آئے ہیں۔ ہماری تحریک کو سب کا ساتھ ملا۔ آزاد بھارت میں کیرالہ میں ہماری پہلی سرکار بنی۔ ایمرجنسی کے بعد ہم دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ کیا ہم فرقہ پرست یا نام نہاد سیکولر پارٹیوں کے ساتھ خود کو ایڈجسٹ کر رہے تھے؟ ہزاروں سوال ہیں، جن کے جواب نہیں ملتے۔'

' اور نہیں ملیں گے۔' کامریڈ شاستری نے غصہ میں کہا۔' جو بھی سامان اس کمرے میں ہے بیچ ڈالو۔ ہم جن یونیورسٹیوں میں زندہ ہیں، وہاں سے بھی غائب ہو جائیں گے۔ ہم نے اپنا تسلط کھو دیا ہے۔'

'یہ آپ کہہ رہے ہیں؟ جبکہ ابھی ہم نئے لیڈر بھی پیدا کر رہے ہیں۔ شاستری تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ یا تم سیاست سے کوئی سودا کرنے والے ہو۔'

'اشونی تم کتے ہو۔'

شاستری غصے میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ کمرے میں اچانک سناٹا چھا گیا۔

اشونی اپنی کرسی پر اچھلے۔ شاستری سے انہیں اس جملے کی امید نہیں تھی۔

'کیا کہا تم نے۔'

'میں نے کچھ نہیں کہا۔ میں جا رہا ہوں۔'

'تم نے مجھے کتا کہا۔'

'میں جا رہا ہوں۔'

شاستری تیز تیز چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ اشونی کرسی پر جھک گئے۔ کمرے میں اس وقت بھیانک خاموشی کی حکومت تھی۔ بھاسکر، کامریڈ اتل کو حیرانی تھی کہ شاستری کو کیا ہوگیا۔

'تم نے سنا، نا، اس نے کیا کہا۔' کامریڈ اشونی نے سر اٹھایا۔ آج تک مجھے یہ گالی کسی نے نہیں دی۔

'و....ہ....ص....صبح سے کچھ پریشان تھے۔' کامریڈ فرید نے کہا۔

'پریشانی میں انسان اپنا آپا کھو دیتا ہے۔ ایڈیٹ۔' اشونی کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

◆◆

اس کے ٹھیک دوسرے دن صبح سات بجے شاستری نے گلے میں رسّی کا پھندہ ڈال کر خودکشی کر لی۔ ان کی میز پر ان کی آخری تحریر پائی گئی، جس پر لکھا تھا..... 'میں اپنی مرضی سے خودکشی کر رہا ہوں۔ میری بیوی کو پریشان نہ کیا جائے۔ اس کے آگے لکھا تھا۔ وہ آچکا ہے...تم لوگ نہیں سمجھو گے۔'

چتا کی تیز لپٹیں اٹھیں اور لکڑیاں ایک دوسرے سے مل کر سلگنے لگیں۔ پنڈت نے منتر پڑھنا شروع کر دیے تھے۔ چتا کے ایک طرف پتھر کی نشستیں تھیں۔ ان میں دو پارٹی عورتوں کے ساتھ وبھا شاستری بھی تھیں۔ آنکھوں میں آنسو کا نام ونشان نہیں۔ اشونی زور زور سے رو رہے تھے۔ کم بخت نے بتایا تو ہوتا کہ کیوں پریشان ہے۔ میں اس کی تمام گالیوں کو برداشت کر جاتا۔ مرنے کی کیا ضرورت تھی۔'

کامریڈ اتل، کامریڈ اشونی کو سہارا دے رہے تھے۔

آگ کی لپٹیں پہلے تیز ہوئیں پھر شعلے ماند پڑ گئے۔

ہمارے درمیان کوئی تھا، جس کا احساس اشونی کو ہوا....وہ اچانک وبھا کی طرف مڑے۔

'تمہارے ساتھ اور کوئی بھی آیا ہے۔؟'

'نہیں۔' وبھا کے ہونٹ آہستہ سے ہلے۔

'تم نے دیکھا اتل؟'

'نہیں۔'

'تمہیں یاد ہے، شاستری نے خودکشی سے پہلے کیا لکھا۔ وہ آچکا ہے۔ کوئی ہے، جو یہاں موجود ہے۔'
'یہاں کوئی نہیں ہے۔' بھاسکر آگے بڑھے۔ آپ کا وہم ہے۔
'وہم نہیں ہے۔ وہم ہوتا تو شاستری خودکشی نہیں کرتا۔'

کامریڈ اشونی زور سے بولتے ہوئے شمشان گیٹ سے آگے نکل گئے۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ شام کے سایے گھنے ہونے لگے تھے۔

میں شمشان سے باہر نکل کر کچھ دیر کھلی ہوا میں رہنا چاہتا تھا۔ شاستری بھگوان کو نہیں مانتے تھے۔ میرے کانوں میں ابھی بھی منتر کے جاپ گونج رہے تھے۔ اوشو نے کہا تھا 'موت ایک جھوٹ ہے۔ جو ہے، وہ ہمیشہ ہے۔ زندگی شکل تبدیل کرتی ہے۔' یہ ساری باتیں اب جھوٹ لگ رہی تھیں۔ موت آدم خور درختوں کی طرح اپنی شاخیں پھیلائے تھی اور اس کی جڑیں پھیلتی جاتی تھیں۔ موت جو کھلی آنکھ کا تماشہ تھی اور جس کی شاخیں جسم میں کچھ ایسے پیوست ہوگئی تھیں کہ زندہ ہوتے ہوئے بھی موت کا گمان ہوتا تھا۔ موت کے تصورات اندیکھی شکلوں میں تبدیل ہوگئے تھے۔ سبحان علی نے جادوگر کا نام لیا تھا اور مرنے سے پہلے شاستری کے الفاظ تھے، وہ آچکا ہے.... تم لوگ نہیں سمجھو گے۔

◆◆

کامریڈ اتل نے شاستری کی جگہ لے لی تھی۔ تیسرے دن بھی پارٹی آفس میں اداسی پھیلی تھی۔
کامریڈ اتل نے سوال کیا، کوئی بتا سکتا ہے کہ شاستری کیا کہنا چاہتے تھے؟
'ممکن ہے ان پر کوئی دباؤ ہو۔' پروفیسر بھٹا چاریہ کہتے کہتے رُک گئے۔
'دباؤ؟'
'کس طرح کا دباؤ؟' کامریڈ قیوم نے بھی حیرت کا اظہار کیا۔
'ہوسکتا ہے انہیں خریدنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔'
'نہیں۔' اتل نے سر ہلایا۔ مردہ کامریڈوں پر کون اپنا پیسہ ضائع کرے گا۔ کس سیاسی پارٹی کو پڑی ہے کہ مردوں کو گود لے۔ اور ہمارے لکھنے لکھانے سے انہیں کوئی فرق بھی نہیں پڑتا۔ پھر کیا بات ہوسکتی ہے۔؟'
'وہ پریشانی میں تو تھے۔' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ شاستری پریشان ہونے والوں میں سے نہیں تھے۔ کچھ ضرور ہے، جسے وہ اپنے ساتھ ہی لے گئے۔'
'انہوں نے کچھ نہ کچھ دیکھا ضرور تھا' موت شکلیں بدل کر عقاب کی طرح ہم پر جھپٹ رہی ہے۔ شاستری اتنے کمزور نہیں تھے۔'
'تو بہادر بھی نہیں تھے۔' اتل نے آہستہ سے کہا۔ لیکن یہ بات سچ ہے کہ موت تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہی ہے۔ دادا نے ہم سے کچھ تو چھپایا۔ نہیں چھپانا چاہیے تھا۔'

مجھے سارہ کی بات یاد آرہی تھی۔ کمرے میں کوئی ہے؟ یہ حادثہ تین بار ہو چکا تھا۔ کوئی ہے جو ہمارے آس پاس ہے اور اب ہمارے گھروں تک آگیا ہے۔

(۹)

ہم جاگتے ہوئے بھی نیند میں ہوتے ہیں۔ جb نیند میں ہوتے ہیں تو ہم زیادہ جاگتے ہیں۔ جیسے آنکھوں کے آگے دور تک پھیلی ہوئی نہ ختم ہونے والی دھند ہوتی ہے۔ یہ دھند ہمیں گلیشیئر پر تیرتے خواب سے برآمد کرتی ہے... یا گلیشیئر میں تیرتے خواب، دھند سے ہمیں دریافت کر لیتے ہیں۔

دھند میں سارے ملک ایک جیسے ہوتے ہیں۔ میں ابھی پچھلے حادثوں سے نکلا نہیں تھا۔ اور مجھے شدت سے اس بات کا احساس تھا کہ کچھ بہت تیزی سے بدل رہا ہے۔ اور میں کسی بڑی مصیبت میں گرفتار ہونے والا ہوں۔

اس دن گلیشیئر ٹوٹ رہے تھے اور میں خواب کی زمین پر چل رہا تھا۔ مگر اصل واقعہ یوں ہے کہ سورج کی شعاعوں کے کمرے میں داخل ہوتے ہی جب میں بستر سے اٹھا اور پاؤں زمین پر رکھے تو دھم سے آواز ہوئی اور میں اوندھے منہ زمین پر گر پڑا۔ مسلسل دو تین بار گرنے کے اس عمل کے بعد میرا حیران ہونا واجب تھا کہ اچانک ایک رات سات آٹھ گھنٹے کی مختصر بیداری یا نیند کے دوران میرے پاؤں میں کچھ گڑبڑی آ گئی تھی۔ اور یہ گڑبڑی کفکا کے میٹا مارفوسس سے کہیں الگ تھی۔ یہ یقین کرنا مشکل تھا، مگر آئینہ میں خود کے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے اس بات کا شدت سے احساس ہو گیا کہ رات ہی رات میرا ایک پیر، دوسرے سے بڑا، یا دوسرا پیر پہلے سے کہیں چھوٹا ہو گیا ہے۔ اور اسی لیے جسم کا توازن بگڑ چکا ہے۔ یہ حادثہ میرے ساتھ پہلے بھی دو بار ہو چکا تھا۔ جسم کے توازن کو قائم رکھنے کے لیے کسی لاٹھی، ڈنڈے، اسٹک، ہاکی یا دیوار کا سہارا لینا ضروری تھا۔ اپنی صبح کی تمام ضروریات سے فارغ ہونے کے لیے مجھے مسلسل سہارے کی ضرورت تھی۔ دوبارہ گرنے کا خوف ایسا تھا کہ میں نے خاموشی سے جسم کو سمیٹا۔ ہاتھوں کو دیوار پر رکھا اور اچک کر بستر پر بیٹھ گیا۔ دراصل میں اس بات کا یقین کرنا چاہتا تھا کہ اب بھی میں کسی خواب میں قید ہوں۔ گلیشیئر پر چل رہا ہوں... یا گلیشیئر میرے پاؤں کے وزن سے ٹوٹ رہے ہیں۔ اور یہ سارہ عمل خواب میں وقوع پزیر ہو رہا ہے۔ یہ یقین کرنے میں مجھے کافی وقت لگا کہ یہ خواب نہیں ہے، اور اچانک برسوں کی طویل مسافت کے بعد یہ حادثہ میرے ساتھ رونما ہو چکا ہے کہ میرا ایک پاؤں دوسرے سے چھوٹا یا دوسرا اچانک پہلے سے بڑا ہو گیا ہے۔ اس رات میری چھٹی حس نے مجھے یاد دلا دیا کہ نیند میں کچھ لوگوں نے جادوگر کا قتل کر دیا ہے۔

کیا میں بھی ان میں سے ایک تھا؟ ایسے سوال اور جواب دونوں دھند کی آغوش میں ہیں۔ بتایا گیا تھا کہ جادوگر کا ایک پریشان کن ماضی تھا۔ بچپن میں وہ بوٹ پالش کرتا تھا۔ جادو کے نئے نئے تماشے دیکھ کر اسے بھی جادوگر بننے کا شوق پیدا ہوا۔ لیکن اس میں اور دوسرے جادوگروں میں فرق تھا۔ جب اسے جادو کے کئی چھوٹے موٹے تماشے دکھانے آ گئے تو اپنی محنت سے وہ اس مقام پر پہنچا جہاں اس نے جادوگری میں کمال کی مہارت حاصل کر لی۔ اس کے ایک اشارے پر گاؤں کے گاؤں جل جاتے تھے۔ اس کے ایک اشارے پر لوگوں کی جیب سے نوٹ اور سکّے غائب ہو جاتے تھے بلکہ کہتے ہیں کہ ایک دن ایک بینک کے قریب سے اس کا گزر ہوا تو بینک میں بھگدڑ مچ گئی۔ بینک کا سارہ کیش غائب تھا۔ رجسٹر، فائلیں ہوا میں اڑ رہے تھے اور جل رہے تھے۔ جادوگر کے اس نئے تماشے سے لوگ اب بھی ناواقف تھے۔ بلکہ ایک دن تو اس کے تماشے پر سونے کے شوقین مرد اور زیورات پر جان دینے والی عورتیں حیران رہ گئیں۔ ایک بڑا سا ہال تھا۔ کھچا کھچ لوگ جمع تھے۔ ہال میں اندھیرا تھا۔ اسٹیج پر روشنی کے دائرے میں بڑا سا گول ہیٹ لگائے جادوگر مسکرا رہا تھا۔ روشنی

کے دائرے میں اس کا ہاتھ چمکا....تاریکی میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے ہوش اڑ گئے۔ یہ اس کے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی تھی۔روشنی کے دائرے میں اس کی ہتھیلی سے سرخ خون نکل رہا تھا۔جادوگر کا ایک اسسٹنٹ ایک پلاسٹک کی بالٹی لے آیا۔شو کو کامیاب بنانے کے لیے جادوگر نے خوف زدہ، پراسرار آوازوں، چیخ اور سسکیوں کا سہارا لیا تھا۔کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگ پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔اس نے قہقہہ لگایا اور ہتھیلیوں سے نکلنے والی خون کی دھار سے بالٹی بھرنے لگی۔ پھر بالٹی لبالب بھرگئی....اور پھر یوں ہوا کہ بالٹی سے اچھل اچھل کر خون اسٹیج پر بہنے لگا۔اور خون کی دھار صرف اسٹیج تک نہیں رُکی بلکہ اس وقت لوگوں کی چیخ نکل گئی جب ہال میں جمع تمام لوگوں نے محسوس کیا کہ سرخ خون کی لہریں اسٹیج سے ہوکر اب آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ دیکھنے والوں کے ہوش ٹھکانے ل نہ رہے۔افراتفری مچ گئی۔جس کسی کو جہاں کوئی دروازہ نظر آیا، گرتے پڑتے اسی دروازے کی طرف دوڑ لگائی۔ جب وہ باہر آئے تو باہر کی کھلی فضا میں بھی جادوگر کے قہقہے ان کا پیچھا کر رہے تھے۔ پھر ایک آواز آئی۔ جاتے جاتے اپنی جیبوں کی تلاشی لے لیجیے۔ آپ گھڑی پہنتے ہیں تو تو وقت دیکھ لیجیے۔عورتوں کے گلے میں زیور ہو تو وہ پہلے اطمینان کرلیں کہ یہ زیور اب بھی موجود ہیں یا نہیں۔ تلاشی لی گئی اور جیسا کہ جادوگر نے کہا تھا، کچھ بھی محفوظ نہیں تھا۔سونے اور چاندی کے زیورات گم تھے۔ یہاں تک کہ ہاتھوں کی انگوٹھیاں بھی غائب تھیں۔ جیب میں پڑے ہوئے چھوٹے بڑے روپے اور سکے غائب تھے۔...تماشہ یہ کہ ان سب کی نظروں کے سامنے جادوگر ہال سے باہر آیا۔اس وقت اس کے بدن پر کافی مہنگا لباس تھا۔وہ مہنگی گاڑی میں بیٹھا اور اُڑن چھو ہو گیا۔

’یہ کیسا تماشہ ہے؟‘

بہت تھوڑے لوگوں کی ناراضی کے باوجود سڑک پر اس وقت ایک ہجوم ایسا بھی تھا جو جادوگر کی شان، محبت اور حمایت میں نعرے لگا رہا تھا۔

کسی نے کہا۔ ہماری جیب کٹ گئی۔

ایک خاتون کی آواز آئی۔میرے زیورات بہت قیمتی تھے

ہجوم خاصا ناراض تھا۔سب قربان کر دیجیے جادوگر پر۔اور بتایئے، کیا آپ میں سے کسی نے اس سے قبل جادو کا ایسا کوئی تماشہ دیکھا تھا؟‘

یہ جادوگر کے بھکت تھے۔اور کسی میں بھی لٹنے اور ٹھگے جانے کے باوجود یہ ہمت نہیں تھی کہ جادوگر کے خلاف ایک لفظ بھی زبان پر لاسکیں۔

دیکھنے والے دم بخود تھے۔اچانک ان میں سے ایک شخص آگے بڑھا۔ وہ کچھ جادوگر کے بارے میں کہنا چاہتا تھا مگر یہ دیکھ کر ہجوم میں خوف سرایت کر گیا کہ جادوگر کے ایک بھکت نے ایک جھٹکے سے اس کی زبان کھینچ لی تھی۔کٹی ہوئی زبان زمین پر کسی مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ کچھ عورتوں کی چیخ نکل گئی۔ایک شخص آگے بڑھا۔ میں اسے پہچانتا تھا۔ وہ ایک اخبار میں صحافی کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔اس نے اس حادثہ کو محفوظ کرنے کے لیے موبائل نکالا تو ایک بھکت نے اس کا موبائل جھپٹ لیا۔دوسرے ہی لمحے وہ اپنے ہاتھوں سے محروم تھا۔

دونوں ہاتھ کاٹ ڈالے گئے تھے۔

’کیا یہاں پولیس آئے گی؟‘

میرے لیے یہ سوچنا مشکل تھا، کیونکہ اسی لمحہ جادوگر اپنی قیمتی گاڑی میں لوٹ آیا۔ وہ شاہانہ شان سے گاڑی سے اترا۔ گاڑی سے اترتے ہی کچھ بھکتوں نے قومی ترانہ چھیڑ دیا۔ ہیبت اور خوف میں ڈوبے ہوئے لوگ اپنی جگہ منجمد ہو گئے۔ اب سب مل کر قومی ترانہ گا رہے تھے....

◆◆

میں نے یہ تمام مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے بلکہ میں ان لوگوں میں شامل تھا جو تماشہ دیکھنے ہال میں جمع ہوئے تھے۔ خون کی بڑی بڑی تیز اور موٹی دھار کو اچھل اچھل کر اپنی طرف بڑھتے ہوئے میں نے بھی دیکھا تھا۔ اور یہ کوئی خواب یا وہم نہیں تھا، میرے کپڑے اس وقت بھی بھیگے ہوئے تھے اور سرخ تھے۔ میں ان کچھ لوگوں میں سے ایک تھا، جو اس وقت جادوگر سے شدید قسم کی نفرت محسوس کر رہے تھے۔ یہ لوگ خوفزدہ تھے اور اس بات سے ڈرے ہوئے بھی کہ جادوگر کہیں بھی ہو، ان کی آنکھوں میں اتری ہوئی نفرت کو محسوس کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جادوگر کا تماشہ اور کھیل کے باوجود جو نقصان ہونا تھا، وہ ہو چکا تھا۔ اس لیے میں ان بہت تھوڑے لوگوں میں سے ایک تھا، جنھیں یہ خیال آیا تھا کہ جادوگر کا قتل ضروری ہے۔ ورنہ خون کی یہ دھار پھیلتے پھیلتے کہاں تک پھیل جائے گی، کہنا مشکل ہے۔ اور یہ سوچ بھی غلط نہیں تھی کہ جادوگر اپنے عزائم سے اپنے تمام باغیوں کو کنگال بنا سکتا ہے۔ مثال کے لیے، جیسے آج ہی عورتوں کے زیورات گم ہو گئے۔ مردوں کے چاندی کے سکے کھو گئے۔

میں تماشہ گاہ سے نکل کر گھر آیا تو گھر کا ماحول بدلا ہوا تھا۔ ڈرائنگ روم میں وقت بتانے والی گھڑی بند تھی۔ بلکہ یہ دیوار گھڑی پچھلے تین برس سے بند تھی۔ اور دن تاریخ کے یاد رکھنے کی وجہ یہ تھی کہ اسی دن اسی تاریخ میں جادوگر اپنے نئے تماشوں سے گفتگو کا موضوع بنا تھا۔ میں نے یہ بات گھر میں کئی بار دہرائی کہ بند گھڑی کو گھر میں رکھنا مناسب نہیں۔ اس سے نقصان یہ ہوتا ہے کہ انسان کا چلتا ہوا وقت رک جاتا ہے۔

میں نے پہلی بار سارہ کو غصہ میں دیکھا تھا۔ وہ چیخ رہی تھی۔ 'سُنا تم نے۔ دیوار گھڑی کو باہر پھینک آؤ۔'

'مگر کیوں۔'

جواب میرے باپ نے دیا۔' کیونکہ وقت ٹھہر گیا ہے۔ کلینڈر سے مہینے غائب ہو گئے۔ اب گھڑیال کے گھنٹوں اور گھڑیوں کی ضرورت نہیں۔'

میرا بیٹا اداس تھا۔ اس نے وجہ بتائی۔ اس نے بڑی محنت سے کچھ سکے اور روپے جمع کیے تھے۔

'پھر؟'

'غائب ہو گئے۔'

سارہ نے بتایا۔ وہ آج بینک گئی تھی۔ کچھ زیورات اس نے اپنی بہو کے لیے تیار کیے تھے وہ بینک کے لاکر میں زیورات جمع کر رہی تھی۔'

یہ بات سارے گھر کو پتہ تھی۔ سارہ کو زیورات پسند نہیں تھے مگر وہ پاشا مرزا کی شادی کے لیے زیورات بنوا رہی تھی اور زیورات گھر میں نہیں رکھتی تھی۔ اس نے لاکر لے رکھا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح بینک جاتی۔ اپنا لاکر کھولتی۔ اور زیورات رکھ دیتی۔

میں نے اداسی سے پوچھا۔ پھر کیا ہوا۔

'لاکر خالی تھا۔ وہاں بھیڑ جمع تھی۔ بینک کے سارے لاکر خالی تھے۔ سونے اور چاندی کے تمام زیورات غائب تھے۔'

میرے باپ نے سیاہ چائے کا آخری گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔' اور سنو۔ یہاں بیگ سے میرے سارے روپے غائب ہیں۔ میں بینک بھی گیا تھا۔ لمبی قطار تھی۔ جب قطار پار کرتا ہوا میں اپنا پیسہ نکالنے گیا تو معلوم ہوا، میرا نام بینک کے اکاؤنٹ، رجسٹر، کمپیوٹر، آن لائن ریکارڈ کہیں بھی شامل نہیں ہے....'

باپ کی آواز دم توڑتی ہوئی اور کمزور تھی۔ سناتم نے۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

میں دھّم سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ سارہ گھر اس وقت مجھے گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ یہ سب یقیناً جادوگر کا کیا دھرا تھا۔ مگر تعجب یہ کہ گھر میں بھی کوئی جادوگر کا نام لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

میں نے دیکھا، باپ خاصے اداس تھے۔ ان کے چہرے پر اچانک جھرّیوں کا جال پھیل گیا تھا۔ وہ اٹک اٹک کر بول رہے تھے۔ ان کا لب ولہجہ بھاری اور زندگی سے بےزار تھا۔

میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ آپ کیوں فکر کرتے ہیں۔ پیسے اور گہنے غائب ہوگئے تو کیا ہوا، سنگاپور، نارتھ کوریا، گھانا، فجی، فلپائن.... یہ دنیا گھومتے گھومتے کیش لیس تہذیب میں داخل ہوگئی ہے۔

میں نے باپ کو اتنے غصے میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ غصے میں اٹھے اور میز پر پڑا ہوا پیپر ویٹ زمین کی طرف اچھال دیا۔' کیش لیس تہذیب کے لیے کیش تو ہونا چاہیے نا....'

◆◆

یہی وہ لمحہ تھا جب پیپر ویٹ زمین سے اچھل کر میرے سر پر لگا۔ سر سے ٹکرانے کے بعد، زمین پر گرنے سے آواز ہوئی اور اس آواز سے میں بیدار ہوا تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب میں نے دیکھا کہ سورج کی شعاعیں میرے کمرے میں داخل ہو چکی ہیں اور بستر سے اٹھنے کی کوشش میں، میں نے محسوس کیا تھا کہ میرا ایک پیر دوسرے پیر سے چھوٹا ہو گیا ہے۔ میں نے دوبارہ اٹھنے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ اس وقت تک ڈائننگ ٹیبل پر ناشتہ لگ چکا ہوتا ہے۔ اور میرے باپ کو یہ بات بالکل بھی پسند نہیں کہ ناشتہ کے لیے بار بار آواز دی جائے۔ ۔ دوبار آواز آچکی تھی۔ خود کو بحال کرتے ہوئے میں نے جواب دیا تھا۔ بس پانچ منٹ میں آ رہا ہوں....لیکن سوال تھا کہ اس طرح لڑکھڑاتے ہوئے میں گھر والوں کا سامنا کیسے کروں گا۔ میں نے پانچ منٹ فریش ہونے میں لگائے۔ اس درمیان ایسا کئی بار ہوا جب میں گرتے گرتے بچا۔ دیوار، دروازے کا سہارا لیتے ہوئے میں اپنا جوتا تلاش کر رہا تھا۔ جوتے میں کپڑے کی ایک موٹی تہہ چڑھانے کے بعد میں نے پیر ڈالے تو یہ سوچ کر خوش ہوا کہ جسم کا توازن قائم ہو چکا ہے۔ ہاں جوتے کے تلّے میں کپڑے کی موٹی تہہ ہونے کی وجہ سے مجھے چلنے میں تھوڑی پریشانی ہو رہی تھی۔ مگر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں اس پریشانی کو اس وقت قبول کرلوں۔

میں ناشتہ کی میز پر آیا تو گھر والے ناشتہ شروع کر چکے تھے۔ میں نے باپ کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر گہری اداسی پسری ہوئی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے انہوں نے میری طرف دیکھا۔ پھر پوچھا

'تم نے اخبار دیکھا؟'

'نہیں۔'

'کل کچھ لوگوں کو گرفتار کیا گیا ہے۔'

'کس جرم میں۔'

باپ نے ایک نوالہ روٹی کا توڑا۔ منہ میں رکھا۔' کچھ باغی نیند میں جادوگر کو قتل کرنا چاہتے تھے.....'

'نیند میں؟'

باپ میری طرف دیکھ کر ہنسے..... ' کیا تم اسے چھوٹی بات سمجھتے ہو، ان کا لہجہ سنجیدہ تھا۔ 'قتل، قتل ہے۔ حقیقت میں کیا جائے یا خواب میں۔'

◆◆

میرے لیے یہ تمام مکالمے بوجھل تھے۔ یہ تمام تفصیلات تھکا دینے والی تھیں۔ اب میں ایک نئے سفر پر نکلنے والا تھا۔ مجھے ان خوفناک، خوفزدہ، سہمے ہوئے ماحول سے خود کو باہر نکالنا تھا لیکن کیا یہ ممکن تھا۔ ممکن نہیں تھا۔ لیکن مجھے ممکن بنانا تھا۔ چہرے سے سنجیدگی کی گرد ہٹانی تھی۔ اور اس کی جگہ رومانیت کے تصور کو دینی تھی۔ میرے سامنے تارا دیش پانڈے تھی۔ اسے ہمیشہ اس بات کی شکایت تھی کہ میں کبھی وقت پر نہیں آتا۔ وہ ہمیشہ میرے ہاتھوں کو تھام کر کہتی تھی۔ کیسے محبوب ہو کہ ہمیشہ تاخیر ہو جاتی ہے۔ مجھے ہی انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اس نے دھمکی بھی دی تھی کہ آئندہ تاخیر ہوئی تو وہ بریک اپ کر لے گی۔ محبت کے لمحوں میں محبت کے سوا کوئی بھی دوسری بات تارا کو گوارہ نہیں تھی۔ اور وہ اس بات پر خوش ہوتی تھی کہ میں محبت کرنا جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ محبوبہ پر رومانی باتوں سے کیسے جادو کیا جا سکتا ہے۔

تارا سے ملنے سے قبل پہلا مسئلہ یہ تھا کہ مجھے اپنے حلیہ کو درست کرنا تھا۔ تارا کو اچھے لباس پسند تھے۔ چھینک، کھانسی، زکام، لنگڑانا اسے بالکل پسند نہیں۔ ناشتہ سے فارغ ہونے کے بعد میں نے اپنے کمرے تک آنے کے لیے سیڑھیوں کا سہارا لیا تو ایک بار پھر چونک گیا۔ بائیں پیر کے جوتے کے تلے میں رکھا کپڑا نکل گیا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ یہ کپڑا تارا کے سامنے بھی نکل سکتا تھا۔ اس لیے تارا کی ناراضی کو دیکھتے ہوئے مجھے اپنے پاؤں کے لیے کچھ بہتر انتظام کرنے تھے۔ اس بہتر انتظام کے لیے ضروری تھا کہ میں سڑک کے اس پار فٹ پاتھ پر جو موچی بیٹھتا ہے، اس سے مشورہ کروں۔

مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس وقت موچی کے جوتا بنانے والی جگہ کے پاس ایک لمبی قطار تھی۔ میں نے ایسی کوئی قطار اس سے قبل موچی کے پاس دو ایک بار دیکھی تھی۔ قطار میں کھڑے لوگوں کے پاس ایک ہی موضوع تھا، یہ لوگ ان باغیوں کو کوس رہے تھے جو نیند میں جادوگر کا قتل کرنا چاہتے تھے۔۔ دھول، گرد، بدبو کا سامنا کرتے ہوئے ایک گھنٹے کے بعد میرا نمبر آیا۔ اس سے قبل کہ میں چھوٹے بڑے پیر کے بارے میں بتاؤں، موچی نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔

وہ زور سے ہنسا۔' آج امید سے کہیں زیادہ کسٹمر آئے ہیں۔ دیکھیے، آپ کے پیچھے بھی لمبی قطار ہے۔'

'ہاں۔'

'سب کا ایک ہی مسئلہ ہے۔ گھبرائیں نہیں۔'

'پھر آپ کیا کریں گے۔'

'میں جوتے کے تلّے میں چمڑے کی موٹی تہہ بٹھا دوں گا۔ پھر آپ کو چلنے میں پریشانی نہیں ہوگی۔'

◆◆

کافی ہاؤس جب میں تارا کے پاس پہنچا تو وہ جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ میرے کافی منانے کے باوجود بھی وہ ایک منٹ ٹھہرنے کو راضی نہیں تھی۔ مگر یہ کرشمہ تھا کہ موسم کا حال سنانے پر وہ دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔

'ہاں بہت برا موسم ہے۔'

'امید سے کہیں زیادہ بُرا۔'

تارا نے دو کافی کا آرڈر دیتے ہوئے غور سے میری طرف دیکھا۔'اچھا سُنو۔ جب تم میری طرف آرہے تھے، اگر میں غلط نہیں ہوں تو تم تھوڑا سا لنگڑا رہے تھے....'

'موسم بہت بُرا ہے۔' میں نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

'ہاں بُرا ہے۔ مگر تم لنگڑا رہے تھے۔'

'خنکی بڑھ گئی ہے۔'

'ہاں بڑھ گئی ہے۔ مگر تم لنگڑا رہے تھے۔'

'میری بات چھوڑو تارا۔ دیکھو کافی آ گئی۔ کافی پیو۔ بتاؤ کافی کیسی ہے....تارا نے کافی کا پہلا گھونٹ لیا۔ اس کے لہجے میں ناراضی تھی۔ کافی اچھی ہے۔ مگر تم....'

اس کی بات سے پتہ نہیں مجھے کیا ہوا کہ میں زور سے چیخا۔'ٹھگنی عورت۔ ہاں میں لنگڑا رہا تھا۔ آج سبھی لنگرا رہے ہیں۔ تم بھی بہت جلد لنگڑا کر چلوگی۔ اور ذرا مجھ پر اعتراض کرنے سے قبل اپنے دانتوں کا جائزہ لو۔ دانت پیلے پڑ چکے ہیں۔ اور ہاں میرا خیال ہے کہ تمہیں اینمیا ہے۔ تمہارے جسم میں خون کا قطرہ دکھائی نہیں دیتا۔ تم جب بولتی ہو تو بدبو کا ریلا اٹھتا ہے۔'

میں کچھ اور بھی کہتا، لیکن اچانک دیکھا، تارا اپنی جگہ سے اٹھ گئی تھی۔ وہ کافی غصے میں تھی۔ میں نے اسے تیز تیز پاؤں پٹختے ہوئے کافی ہاؤس کے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ میں حیران تھا۔ یہ اچانک مجھے کیا ہو گیا تھا۔ محبت کے ان حسین لمحوں میں یہ کون تھا، جو میرے اندر آ گیا تھا۔ میری روح کی چھال میں۔ میرے جسم کی کینچلی میں۔ میرے منہ کی بدبو میں۔ کیا یہ الفاظ میرے تھے؟ تارا تو میرے محبت بھرے مکالموں کی دیوانی تھی... پھر میری جگہ یہ کون تھا..؟'

◆◆

ہم جاگتے ہوئے بھی نیند میں ہوتے ہیں۔ جیسے نیند میں ہوتے ہیں تو زیادہ جاگتے ہیں... جیسے آنکھوں کے آگے دور تک پھیلی ہوئی، نہ ختم ہونے والی دھند ہوتی ہے۔ یہ دھند ہمیں گلیشیئرس میں تیرتے خوابوں سے برآمد کرتی ہے...

اچانک کچھ لوگوں کے چیخنے کی صدا آئی۔

'باہر بھاگو۔ بھیانک طوفان ہے۔'

میں اس اچانک حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ لیکن ابھی تو موسم میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ آسمان اچانک زرد اور سیاہ ہو گیا تھا۔ تیز ہوا گرج کے ساتھ موسم کے بدل جانے کی اطلاع دے رہی تھی۔ کافی ہاؤس خالی ہو گیا۔ میں لڑکھڑاتے ہوئے گرتا پڑتا کافی ہاؤس سے باہر آیا۔ تیز طوفان کی وجہ سے اچانک سڑکوں پر گاڑیاں رُک گئی تھیں۔ ہوا کی شدّت اتنی زیادہ تھی کہ کچھ لوگ سڑک پر گرے ہوئے نظر آئے۔ میں نے غبار سے بچنے کے لیے دیوار کا سہارا لیا۔ وہاں بابا سیمنٹ کا ایک بورڈ پڑا تھا۔ میں نے

بورڈ کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ سڑک پر شور اور ہنگامہ بر پا تھا۔ اس ہنگامے میں ٹھہر ٹھہر کر جادوگر کا نام بھی لیا جا رہا تھا۔ ٹھیک اسی وقت دو پولیس والوں کو وردی میں، میں نے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ ان سے بچنے کے لیے ایک ہی راستہ تھا کہ میں خود کو بابا سیمنٹ کے بورڈ کے پیچھے چھپا لوں، میں نے ایسا ہی کیا اور طوفان کے رُکنے کا انتظار کیا... لیکن جلد ہی مجھے اس بات کا احساس ہو گیا کہ یہ طوفان جلد رُکنے والا نہیں ہے۔ بھیانک طوفان ہے اور یہ کہنا مشکل ہے کہ طوفان کا اثر کب ختم ہو گا۔

سڑکوں پر افراتفری کا ماحول تھا۔ جسے دیکھو بھاگا جا رہا ہے۔ میں نے کچھ چھوٹی گاڑیوں کو ہوا میں تیرتے اور اڑتے ہوئے دیکھا۔ یہاں سے چلنے اور آگے بڑھنے کی کوشش کی تو جوتا پاؤں سے نکل گیا۔ میں نے ہوا میں اپنے جوتوں کو اُڑتے ہوئے دیکھا۔ لنگڑاتے ہوئے میں جوتوں کو پکڑنے کے لیے دوڑا۔ جوتے اُڑتے ہوئے سامنے والے پٹرول پمپ کی دیواروں سے ٹکرائے تھے۔ مگر پٹرول پمپ کی دیوار تک پہنچنا آسان نہیں تھا۔ گاڑیاں رموٹر سائیکل اب بھی تیز طوفانی ہوا میں اچھل اچھل کر ادھر اُدھر گر رہے تھے۔ ان کے گرنے سے دھماکہ ہوتا۔ کچھ گاڑیاں ایسی بھی تھیں، جو ایک دھماکہ کے ساتھ گرتیں اور پھر ان گاڑیوں سے شعلے اٹھتے ہوئے نظر آتے.... گرتے پڑتے، توازن کو قائم رکھتے ہوئے، میں کسی طرح پٹرول پمپ تک آچکا تھا۔ مگر یہاں جوتے نہیں تھے۔ جوتے غائب تھے۔ پٹرول پمپ سے بینک تک جانے والی قطار بھی طوفانی ہوا کا شکار ہو گئی تھی۔ اندھیرے کے باوجود پٹرول پمپ کے اندر بنے کمرے میں مجھے روشنی نظر آ رہی تھی۔ دھند اور دھیرے دھیرے پھیلتے اندھیرے کے باوجود میں اندر بنے کمرے میں ٹہلتے ہوئے کچھ لوگوں کو دیکھ سکتا تھا۔ وہ سب ٹائی اور سوٹ میں تھے.... انہیں طوفانی ہوا، جھکڑ، آسمانی آفت کی ذرا بھی پرواہ نہیں تھی۔ میں اچانک چونک گیا۔ ایک بار پھر وہ دونوں پولیس والے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ اب ان پولیس والوں سے بچنا ضروری ہو گیا تھا۔ ان میں ایک خفیہ افسر بھی تھا۔

لڑکھڑاتے ہوئے تیزی کے ساتھ میں نے وہاں سے بھی بھاگنا شروع کیا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ اس بُرے موسم میں، مجھے گھر پہنچنے میں کامیابی ملے گی۔.سڑکوں کا برا حال تھا۔ کمزور اور کچے گھر طوفان میں گر گئے تھے۔ سڑکوں پر جابجا ٹوٹے ہوئے گھروں کا ملبہ پڑا تھا۔ یقیناً ان میں انسان بھی دبے ہوں گے۔ سڑک پر اب بھی چیخ پکار کا عالم تھا۔ میں جب گھر میں داخل ہوا تو یقین کرنا مشکل تھا کہ میں اس خوفناک طوفان سے زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہوا ہوں..... گھر والوں کو میری آمد سے زیادہ فرق نہیں پڑا تھا۔

'طوفان تیز ہے۔ دروازہ بند کر دو۔'

باپ کا لہجہ سرد تھا۔

میں نے دروازہ بند کیا۔ طوفان کا شور اس قدر زیادہ تھا کہ کان کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

میرے باپ نے دوبارہ کہا۔ طوفان کے تھمنے کے آثار نہیں ہیں۔

'ہاں۔'

'کافی تباہی ہوئی ہے۔ آگے بھی ہو گی۔'

باپ پریشانی کے عالم میں کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیتے تھے۔ اس وقت بھی وہ ٹہل رہے تھے.... وہ اچانک میری طرف مڑے۔

'کیا جادوگر کی کوئی خبر ملی۔؟'

'نہیں۔'

' مجھے بھی نہیں ملی۔'انہوں نے ٹہلنا جاری رکھا۔پھر میری طرف دیکھا۔'ہاں تمہیں بتانا بھول گیا۔تمہاری تلاش میں دو پولیس والے آئے تھے۔'

'پولیس والے....'

'ہاں۔'وہ تمہارے پاؤں کے بارے میں پوچھ رہے تھے...'میں اپنی جگہ پر تیزی سے اچھلا۔مگر کیوں....

'تفتیش چل رہی ہے۔کچھ باغی اور بھی ہیں جو نیند میں جادوگر کو قتل کرنا چاہتے تھے۔رات ہی رات ایسے باغیوں کے پیر چھوٹے بڑے ہوگئے۔'وہ ہنس رہے تھے۔کیا یہ ممکن ہے؟'

ٹھیک اسی وقت پڑوس کے گھر سے تیز آواز آئی۔وہاں ٹین کی چھت تیز ہوا میں اڑ گئی تھی....

'طوفان تیز ہے۔'

ہاں۔مجھے احساس ہوا۔باپ ٹہلتے ہوئے رُک گئے۔ان کی آنکھیں غور سے میرے ننگے پاؤں کا جائزہ لے رہی تھیں۔وہ کچھ بولے نہیں،مگر ایسا احساس ہوا، جیسے وہ پوچھنا چاہتے ہوں کہ میرا جوتا کہاں ہے؟ وہ شک سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

اسی درمیان دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔

باپ کی آواز میں تلخی آ گئی تھی۔'لگتا ہے وہ پھر سے آ گئے ہیں۔'

سارہ نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔دروازے پر خفیہ افسر کے ساتھ ایک پولیس والا کھڑا تھا۔خفیہ انسپکٹر بلا جھجک اندر آ گیا۔سارہ اور میرے باپ کو غور سے دیکھا۔پھر میری طرف دیکھا۔اس کے بعد اس نے زور کا قہقہہ لگایا۔

' تمہارا نمبر آنے والا ہے۔'

' کیسا نمبر۔'

' تمہارے کھانے پینے کا ریکارڈ اچھا نہیں ہے۔اور تم بلا وجہ کے کاموں میں زیادہ رہتے ہو۔'

' میں تو محض ڈیوٹی کرتا ہوں۔'

اس نے ایک چبھتی ہوئی نظر مجھ پر ڈالی۔

' تم سے جلد ملنے آؤں گا۔'اس کے بعد وہ ٹھہرا نہیں۔پولیس والے کے ساتھ باہر نکل گیا۔

' اس کے جانے کے بعد میرے باپ نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔یہاں کا موسم خراب ہے اور میں زیادہ دن یہاں رُک نہیں سکتا۔'

' سارہ میرے لیے ہارلکس لے کر آئی تھی۔'خود کو سنبھالو.....خود کو مصیبت میں نہ ڈالو۔'

میں کہنا چاہتا تھا، یہاں کون کس کو مصیبت میں ڈالنا چاہتا ہے۔مگر جو کچھ ہو رہا ہے، وہ ہمیں تباہ کر دے گا۔اب وہ سامنے ہے اور نظر بھی آنے لگا ہے۔اب تک ہم صرف اس کی باتیں سن رہے تھے۔'

مجھے یقین تھا کہ باہر طوفان کا خطرہ کم ہو گیا ہے۔مگر اس بات کا احساس بھی تھا کہ طوفان دوبارہ بھی آ سکتا ہے۔

(۱۰)

کیا یہ کوئی خوفناک خواب ہے یا حقیقت یا ہم خوفناک خوابوں اور حقیقت کے درمیان ایک ایسے راستے کے مسافر بن گئے ہیں جس کے بعد ایک آہنی دروازہ آتا ہے اور زندگی مقفل لگتی ہے۔ جیسے کوئی ہے جو خاموشی سے ہمارے جسم کا سائز لے رہا ہے، آہنی دروازوں کے پیچھے اچھالنے کے لیے۔ جیسے کچھ لوگ ابھی بھی جادوگر کی موجودگی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے اور اسے میرا واہمہ قرار دے رہے تھے۔ مگر کوئی تھا جو مجھے مسلسل ہوا میں اچھال رہا تھا۔ اس وقت میں ایک چھوٹے سے کانچ کے بنے پیپرویٹ میں تبدیل تھا جسے اچھال کر دوبارہ مٹھی میں قید کیا جاسکتا تھا اور مٹھی میں قید نہ ہونے کی صورت میں پیپرویٹ کے زمین پر گرنے اور چور چور ہونے کا خطرہ بھی لاحق تھا۔

نیند میں بند آنکھیں چلتی ہیں۔ کبھی کبھی اڑن طشتری کی طرح کائنات کی سیر بھی کراتی ہیں۔ نیم شب کی سیاہی سے صبح کے نور تک ان آنکھوں میں کتنا کچھ ہوتا ہے۔ نیند کی لمبی مسافت کے بعد آنکھیں تھک گئی تھیں۔ میں نے سارہ کو قریب دیکھا۔ اس نے میرا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔

'ابھی آندھی آئی تھی نا...'

'ہاں...'

'شٹر اڑ رہے تھے۔ گاڑیاں اڑ رہی تھیں۔'

'ہاں، بھیانک طوفان تھا۔'

'اور وہ خفیہ افسر...؟'

'وہ چلا گیا...'

'میرا بیٹا پاشا...'

'وہ مزے میں ہے اور تمہارے لیے متفکر ہے۔'

'ہاں۔ اسے ہونا چاہیے...' میں نے آہستہ سے کہا۔ تم کو کیا لگتا ہے، یہ سب......فریب ہے...'

'بالکل بھی نہیں۔'

'ہاں۔ میں اسی لیے خوفزدہ ہوں۔ اور شاید اسی لیے بیمار ہو گیا ہوں۔'

'تمہیں ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔'

'ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے بہت پیسوں کی ضرورت ہے، جو میرے پاس نہیں ہیں۔'

'تمہارے اندر کا طوفان گزر ا یا نہیں؟' سارہ محبت سے پوچھ رہی تھی۔

'طوفان پھر سے آنے والا ہے۔'

'اور محبت؟' سارہ میرے ہونٹوں پر جھک گئی تھی۔

'وہ ہے نا۔ میرے قریب....بہت قریب۔'

' محبت طوفانوں کو روک دیتی ہے۔'

' کبھی کبھی بہا بھی لے جاتی ہے۔'

' نہیں۔ طوفانوں میں اتنی طاقت نہیں۔'

' دریا بھر گئے ہیں۔ سمندر کی لہروں میں اچھال ہے اور کوئی ہمارے آس پاس ہے۔'

' اس وقت تو میں تمہارے پاس ہوں۔'

◆◆

۱۲ بجے بیل بجی تو دروازے پر کامریڈ اتل کھڑے تھے۔ میں چونک گیا۔ انہیں لے کر ڈرائنگ روم میں آیا۔ کامریڈ اتل پہلی بار میرے گھر آئے تھے اور پارٹی کے پرانے کارکن تھے۔ انہوں نے غور سے میرے چہرے کو دیکھا۔

' علامہ اقبال یاد ہیں آپ کو۔'

' ہاں کیوں۔'

اتل مسکرائے۔ 'ان کا یہ شعر پڑھیے:

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

' واہ'

' اقبال کو میں نے بہت پڑھا ہے۔ غالب کو بھی۔ میر کو بھی۔ اقبال کو پڑھنے سے طاقت ملتی ہے۔ کیا بحرظلمات میں گھوڑے دوڑانے والے آج مر چکے ہیں۔؟'

' بحرظلمات۔' میں نے آہستہ سے اس لفظ کو دہرایا۔

میں نے سارہ کو چائے بنانے کے لیے کہا۔ سارہ چائے اور کچھ سینڈوچ بسکٹ وغیرہ لے کر حاضر ہوگئی۔ اس نے اتل کو دیکھ کر ہاتھ جوڑے۔ پھر پوچھا۔ کیا میں بھی یہاں بیٹھ سکتی ہوں۔

اتل مسکرائے۔ ' کیوں نہیں بھابھی۔ میں اس بزدل کے لیے نہیں آیا۔ آپ سے ملنے آیا ہوں۔ یہ تو بات بات میں ڈر جاتا ہے۔ سبحان علی کی موت سے ڈر گیا۔ کامریڈ شاستری کی موت سے خوفزدہ ہوگیا۔ کامریڈ ہو میاں۔ کامریڈ ہو تو سر سے کفن باندھ لو۔'

' یہی بات تو میں سمجھاتی ہوں بھائی صاحب۔'

' کامریڈ اتل نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ سبحان علی کا معاملہ کورٹ میں ہے۔ ویڈیو کا پہلا ایویڈنس غائب ہے۔ کاپی کی گئی ویڈیو کو کورٹ ایویڈنس نہیں مانتا۔ چار ملزم گرفتار ہوئے لیکن مجھے یقین ہے، بے قصور ثابت ہوں گے۔ کیونکہ پولیس ٹیم اہم ثبوت کو ہمیشہ کی طرح چھپالے گی۔ پہلا کام تھا، سبحان علی کی موت کو میڈیا کا حصہ بنانا۔ اس لیے پہلی جیت تو ہماری ہوئی۔ اس لیے کل کیا فیصلہ ہوگا، یہ جاننا ضروری نہیں ہے۔ کیونکہ فیصلے سے ہم سب آگاہ ہیں۔ حکومت بی مشن کی۔ ساری تنظیمیں ان کی۔ ہمارے پاس کیا ہے۔ لیکن ہم لڑ تو رہے ہیں۔'

' سمیرا کا کیا ہوا بھائی صاحب۔'

' ابھی وقت لگے گا۔ لیکن ایک بات ہے۔ جہانگیر مرزا۔ عام لوگوں تک یہ میسیج تو جا رہا ہے کہ اس وقت سب کچھ غلط ہو رہا ہے۔ ملک میں نوکریاں نہیں ہیں اور ایک مخصوص طبقے کو ہلاک کیا جا رہا ہے۔ انقلاب اچانک تو نہیں آتا۔ آہستہ آہستہ آتا ہے۔ اس دن پارٹی

کے بارے میں بہت سے سوال اٹھائے گئے۔ ارے میاں، سیاسی پارٹی ہے۔ کس پارٹی میں کمی نہیں۔ کبھی ہم بھی عروج پر تھے۔ آج نہیں ہیں۔ تو کیا پارٹی کو مرنے کے لیے چھوڑ دیں۔ شاستری اپنا کام کر گئے۔ اب ذمہ داری مجھ پر ہے۔ بڑے کام کے لیے ہمیں فنڈ کی ضرورت پڑے گی۔ اتل نے قہقہہ لگایا۔ بھابھی تم سے زیادہ سمجھدار ہیں۔

' اس میں کوئی شک نہیں۔' میں نے اتل کے چہرے کا جائزہ لیا۔ سرخ چیونٹیاں، زرد آندھی، چھوٹے بڑے پاؤں....'

' میرا ایک پاؤں دوسرے چھوٹا ہے۔ میرا خیال ہے، سارے بنگالیوں کے پاؤں ایسے ہی ہیں۔' اتل زور سے ہنسا۔' وحشت کو نکالو۔ وحشت کو اپنے دل میں جگہ مت دو۔'

' لیکن جو کچھ ہو رہا ہے، نشانہ ہم ہیں۔'

ہم بھی ہیں نشانہ۔ شاستری نے کیا خودکشی کی؟ میں اس حادثہ کو قتل کہتا ہوں۔ ہمارے کتنے لوگ ہلاک ہوئے۔ تم ٹارگیٹ ہو، لیکن وہ لوگ بھی ٹارگیٹ ہیں جو ان کے مخالف ہیں۔

' حالات بدلیں گے۔ میں انہیں یہی سمجھاتی ہوں۔'

میں نے سارہ کی طرف دیکھا۔' اور مجھے لگتا ہے حالات اور سنگین ہوتے جائیں گے۔'

' ہم مقابلہ کریں گے۔ اتل کی آواز میں گرمجوشی تھی۔ جو کچھ تم کہہ رہے ہو سچ ہے۔ مگر یہ نازیوں کا زمانہ نہیں ہے۔ ہماری غلطی یہ تھی کہ ہم وقت کے ساتھ نہیں چلے۔ اب چلیں گے۔ پریشان کیوں ہوتے ہو۔'

' کیا پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے؟' میں نے اتل دا کی طرف دیکھا۔

کامریڈ اتل کے چہرے پر اس وقت مجھے ڈھیر ساری جھریاں نظر آ رہی تھیں۔

' سرخ چیونٹیاں، انکاؤنٹر، جھوٹے مقدمے، چاروں طرف سے منڈلاتی ہوئی موت اور ریت میں دبی ہوئی خاموشی۔'

کامریڈ اتل خاموش رہے۔

' کوئی ہے جو بہت تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔ جس کی نظر ہمارے لباس پر ہے۔ ہمارے کھانے پینے پر ہے۔ ہماری زندگی کے طریقوں پر ہے۔ ہمارے بچوں پر ہے۔ سیاہ بادلوں کے درمیان بھی اس کا چہرہ ہر شخص دیکھ رہا ہے۔ مگر سب کے ہونٹ سلے ہوئے ہیں۔'

' وہ یہی چاہتے ہیں، جو تم کہہ رہے ہو اور اس وقت وہی ہو رہا ہے، جو وہ چاہتا ہے۔ اتل دا مضبوط آواز میں بولے۔

' جادوگر.....' میں نے آہستہ سے اس لفظ کی ادائیگی کی۔ اس موقع پر اتل دا کا چہرہ دیکھا۔ اچانک خوف ان کے چہرے پر سرایت کر گیا تھا۔ وہ گہری نیند میں نظر آ رہے تھے۔ یا نیند کی لمبی مسافت کے بعد تھکے ہوئے دکھ رہے تھے۔ اس کے بعد وہ زیادہ دیر تک رُکے نہیں۔ پارٹی کے کام کا بہانہ بنا کر واپس لوٹ گئے۔

میں نے تارادیش پانڈے کو فون کیا۔ کئی بار کوشش کے بعد آخر اس نے فون اٹھایا۔ اس کے لہجے میں ناراضی تھی۔

' اب بھی لڑکھڑا رہے ہو....' اس کا لہجہ اکھڑا ہوا تھا۔

' خدا کا شکر ہے تم نے میری بات کا برا نہیں مانا۔'

' اوہ۔ چھوڑو اس بات کو۔ میں نے بھی زیادتی کی تھی۔' اس کے لہجے میں دوبارہ جوش بھرا تھا۔' مگر خدا کے لیے..... پہلے جیسے ہو جاؤ۔'

' میں پہلے جیسا ہی ہوں۔'

'نہیں ہو۔ تم نے بی مشن چھوڑ کر اچھا نہیں کیا۔ تم ان لوگوں کو نہیں جانتے۔'
'میں جانتا ہوں تارا۔ مگر ذرا سوچو۔ وہاں چار قتل ہوئے اور یہ تمام قتل دبا دیے گئے۔'
'پانچواں نمبر تمہارا بھی ہو سکتا تھا۔'
'وہ اب بھی ہو سکتا ہے۔ اور تم نے یہ بھی دیکھا کہ چاروں قتل پولیس فائلوں میں دبا دیے گئے۔'
'جبکہ وہ ان کے قریبی تھے۔'
'انہیں اتنا قریب نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ کسی کو زیادہ قریب نہیں آنے دیتے۔ تمہاری خوش قسمتی کہ تم ان کے زیادہ قریب نہیں گئے۔ یہ میں جانتی تھی۔'
'تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'
'یہ تو نہیں جانتے کہ تم بھی ہٹ لسٹ میں ہو' تارا دوبارہ ہنسی۔ موت کے دستاویز تیار ہو رہے ہیں جہانگیر مرزا۔ اپنا خیال رکھو۔ تمہاری دیوانگی دیکھنے کے لیے کوئی اور دن رکھتی ہوں۔
'موت کے دستاویز.....'
'زیادہ مت سوچو۔ جب تک زندگی ہے، خوش ہو کر گزارو۔'
تارا دیش پانڈے نے فون کاٹ دیا۔ میں دیر تک موت کے دستاویز کو لے کر الجھا رہا۔

(۱۱)

جب گائیں سڑک پر گربا رقص کر رہی تھیں، انتظامیہ نے ۱۵۰ لوگوں کو حراست میں لیا تھا اور ان سے موت کے دستاویز پر دستخط کرائے گئے تھے۔ ان سے باضابطہ سوال کیا گیا تھا کہ آپ کب مرنا چاہتے ہیں۔ ان سب کو دیش دروہی اور مجرم قرار دیا گیا تھا۔ اس دن دھوپ شدید تھی۔ سورج آگ اگل رہا تھا۔ فروری مہینے کی شروعات ہوگئی تھی۔ صبح میں ۸ بجے تک موسم خوشگوار رہتا پھر آہستہ آہستہ دھوپ کی شدت سے شدید گرمی کا احساس ہوتا۔
میں پارٹی دفتر کے لیے نکلا تو راستے جام تھے۔ چاروں طرف گائیں نظر آرہی تھیں۔ پارٹی دفتر جانے کے لیے کوئی آٹو تیار نہیں ہوا۔ کوئی بھی آٹو گایوں سے گزر کر جانا نہیں چاہتا تھا۔
تنگ گلیوں کا سامنا کرنا کسی عذاب سے کم نہیں تھا۔ کچھ دیر میں چھپ کر جوش سے بھری گایوں کو دیکھتا رہا۔ وہ کتنی تعداد میں تھیں، کہنا مشکل تھا۔ ممکن ہے، وہ ہزاروں کی تعداد میں ہوں۔ مگر وہ رقص کر رہی تھیں۔ ان کے درمیان زعفرانی لباس میں کچھ لوگ تھے جو مذہبی نعرے لگا رہے تھے۔ ڈھول مجیرے بج رہے تھے۔ درمیان میں شنکھ پھونکنے کی آواز بھی سنائی دیتی۔ خفیہ افسر اور پولیس والے کو آتے دیکھا تو میں ایک بجلی کے پول سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت میں ان دونوں کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میرا ذاتی خیال تھا کہ گایوں کے گزرنے میں دو گھنٹے سے زیادہ کا وقت لگ جائے گا۔ میں گھر جانے کے لیے مڑا تو ناگارجن نے مجھے روک لیا۔ زور سے جے شری رام کہہ کر مجھے مخاطب کیا۔ میں نے آہستہ سے آداب کہا۔
'آج کا دن گایوں کا دن ہے۔ آپ نے دیکھا۔'
'ہر دن گایوں کا دن ہے۔'

’ بے شک۔‘ ناگارجن مسکرائے۔’ ہم یہی تو چاہتے ہیں کہ آپ ہماری سنسکرتی میں رچ بس جائیں۔
’ ہم تو پہلے سے ہی اس سنسکرتی کا حصہ ہیں۔‘
’ ایسا نہیں ہے۔ایسا ہوتا تو آپ کو بتانے اور سمجھانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔‘
’ آج گایوں کے نرتیہ کا دن ہے۔اس لیے آج ہم آپ سے کوئی بحث نہیں کریں گے۔جے گئو ماتا۔‘
ناگارجن نے زور سے کہا۔اس کے بعد اٹھ کر وہ اپنے گھر کی طرف چل دیے۔سڑک کے کنارے بی مشن کے کچھ کارکن رسیدیں کاٹ رہے تھے۔میں ابھی گھر جانا نہیں چاہتا تھا۔ایک ساتھ بہت ساری گایوں کے رمبھانے کی گونج یہاں تک سنائی دے رہی تھی۔

میں نے کامریڈ اتل کو بتا دیا کہ سارے راستے بلاک ہیں۔انہوں نے کہا کہ آنے کی ضرورت نہیں ہے۔انہوں نے ساتھ میں یہ بھی کہا کہ موت کے دستاویز والی خبر صحیح ہے۔کچھ لوگوں سے دریافت کیا جا رہا ہے کہ وہ کب ہلاک ہونا چاہیں گے۔مشن کے اس نرم رویہ کا سواگت کیا گیا ہے۔

گایوں کے گزرنے کے بعد ان کے پیچھے سادھوؤں کا ایک لمبا قافلہ تھا۔ان میں ناگا سادھوؤں کی ایک بڑی جماعت تھی جو جسم کو لباس سے بے نیاز رکھتے ہیں۔یہ شور کرتے اور کچھ مذہبی نعرے لگاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔مجھے یاد آیا، سارہ نے کہا تھا، واپسی میں ذرا سی شاپنگ کر لینا۔دودھ کا پیکٹ، انڈے، بریڈ خریدنے کے بعد میں آگے بڑھا تو خفیہ افسر نے میرا راستہ روک لیا۔
’ تم بیمار لگ رہے ہو۔‘
’ یہ تو تمہارے لیے خوشخبری ہے۔‘
’ ہے۔مگر میں چاہتا ہوں کہ تم بیمار رہو۔‘ وہ زور سے ہنسا۔
’ کیوں۔‘
’ وہ طنزاً مسکرایا۔’ ابھی تمہیں ہماری دنیا کو دیکھنا باقی ہے۔‘
’ تو کیا اب تک کی دنیا تمہاری نہیں تھی۔‘
’ بالکل بھی نہیں۔‘ اس نے چیونگم چبانا شروع کیا۔اب دیکھو۔چاروں طرف ہم اور.....‘ وہ زور زور سے ہنسا....تم بیمار ہو رہے ہو۔ تم سارے کے سارے بیمار ہو رہے ہو۔‘
’ تم بیمار ہوتے تو میں خوش نہیں ہوتا۔‘
’ خوش ہونے کا سب کا اپنا اپنا مزاج ہے۔گایوں کا گربا دیکھا۔گایوں کا بھجن سنو۔گایوں کا رتبہ دیکھو۔تم ہماری پوتر گایوں سے بھی رتبے میں گر گئے ہو۔‘
’ مگر یہ گڑھا....؟ میں کہتے کہتے رُک گیا۔
’ گڑھے ابھی کھودے کہاں گئے ہیں۔‘ وہ سنجیدہ تھا۔پہلے تمہارا سائز لیں گے پھر گڑھے کھودیں گے۔‘
’ گڑھے تو آپ لگاتار کھود رہے ہیں۔‘ میرے ہونٹوں پر کمزور سی مسکراہٹ تھی۔
’ اور تم اچھل رہے ہو...وہ سمیرا کا کیا ہوا؟ اچھل کود کا کوئی نتیجہ نکلا۔‘
’ ہاں نکلا کیوں نہیں۔‘ میں نے خفیہ افسر کی طرف دیکھا۔تفتیش شروع ہوئی۔حقائق سامنے آئے۔تمہاری پولیس کی قلعی بھی کھلی۔ یہ بھی سامنے آیا کہ ملزمان نے تفتیشی ٹیم کو دو لاکھ کی رشوت بھی دی۔قتل کے آٹھ ملزم کے خلاف فرد جرم بھی داخل کی گئی۔یہ کوئی چھوٹی بات تو نہیں۔‘

' بڑی بات بھی نہیں۔ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور،' خفیہ افسر زور سے ہنسا۔ دیکھا ہمارے لوگوں نے جرم کی حمایت کی۔ یہ بھی پہلی بار اتہاس میں ہوا۔ آٹھ لوگوں نے عصمت دری کی۔ نتیجہ کیا ہوا، تفتیشی ٹیم کا افسر بھی ملزموں کے ساتھ مل گیا۔ سب چھوٹ جائیں گے اور پولیس کی طرف سے بیان آجائے گا کہ پولیس نے اپنا کام قانون کی روشنی میں کیا ہے۔'

وہ زور سے ہنسا۔ اس بار اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ چیونٹی کے برابر بھی معاملہ ہو تو تم سالے بھونکنے لگتے ہو۔ اب ہمارا کھیل دیکھنا۔ ہم بہت جلد تمہارے گھر آئیں گے۔

مجھے یاد آیا، سبحان علی کا معاملہ بھی ثبوت کی عدم موجودگی میں کمزور ثابت ہوا تھا۔ اب ان معاملات میں عدالت سے زیادہ اختیار بی مشن نے اپنے پاس رکھا تھا۔ مٹن سے بیف بن جانے والا معاملہ بھی ملزموں کے حق میں گیا۔ گھر سے باہر نکلیے تو زعفرانی پوسٹر۔ دیواریں زعفرانی رنگوں سے رنگی ہوئی۔ سڑکوں پر گایوں کا گربا اور ناگا سادھوؤں کا تانڈو۔ کوئی میرے اندر چیخ رہا تھا۔ تم اجنبی ہو۔ تم اس ملک میں کہیں نہیں ہو۔ تمہارے نام ونشان مٹا دیے گئے۔

میں گھر آیا اور آئینہ میں چہرہ دیکھا تو میرا چہرہ حقیقت میں گم تھا۔ اور اس وقت بھی سنگار میز کو میں نے ہلتے ہوئے محسوس کیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ کوئی نہ کوئی ضرور ہے، جو میرے گھر آ چکا ہے۔

(۱۲)

' جو نہیں دیکھتے/ جو نہیں بولتے/ جو نہیں سوچتے/ وہ مر جاتے ہیں...'

نیند کی لمبی مسافت کے درمیان اس سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ میں اس سے واقف نہیں تھا۔ لیکن اس نے مجھے یہ اشارہ ضرور دیا کہ تم خطرے میں ہو اور تمہارا بیٹا بھی۔

یہ میری اس سے پانچویں ملاقات تھی۔ لیکن ان ملاقاتوں کے باوجود ہمارے درمیان اجنبیت برقرار تھی۔ ہم ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے۔ یہ کہنا زیادہ بہتر ہے کہ ہمیں ایک دوسرے کو جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی شکل وصورت میں بھی کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ اسے یاد رکھا جائے۔ مگر اس کے تعلق سے یکے بعد دیگرے جو واقعات سامنے آئے، کہیں نہ کہیں میں خود کو بھی ان واقعات و حادثات کا ایک حصہ تصور کر رہا تھا۔ ان دنوں بہت کچھ ایسا ہوا تھا، جس کی تفصیل بتا دینا ضروری ہے۔ یہ انہی دنوں کا تذکرہ ہے جب اچانک ہماری گول گول دنیا میں بہت کچھ الٹا سیدھا ہونے لگا تھا۔ مثال کے لیے ہماری کالونی کے ایک بچے نے کچھ شرارتی بچوں کے ساتھ یہ کہہ کر شور مچایا کہ وہ جس چھوٹی سی بال سے کھیل رہا تھا، وہ اچانک بڑی ہو کر غبارے کی طرح پھول گئی اور اب اس غبارے سے عجیب وغریب آوازیں آ رہی ہیں۔ ظاہر ہے بچوں کی ان باتوں پر دھیان دینے کی ضرورت کسی نے بھی محسوس نہیں کی۔ میرے ایک پڑوسی کا ڈیری فارم کا بزنس تھا۔ اسے شکایت تھی کہ اچانک گایوں نے دودھ دینا بند کر دیا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی مگر گایوں کو لے کر اس کی تین شکایتیں ایسی تھیں، جس پر یقین کرنا مشکل تھا۔ اس نے بتایا کہ گائیں اچانک انسانوں کی طرح پوجا پاٹھ کرنے لگی ہیں۔ دوسری شکایت یہ کہ گایوں کی آنکھیں اچانک سرخ ہوگئی ہیں، جیسے ان میں خون اتر آیا ہو۔ تیسری شکایت یہ تھی کہ اچانک گایوں کے جسم میں انگنت سینگ نمودار ہو گئے ہیں۔ پڑوسی پر پہلے بھی پاگل پن کا دورہ پڑ چکا تھا اس لیے اس کی دیوانگی بھری باتوں پر توجہ دینا میں نے

ضروری نہیں سمجھا۔ لیکن اس رات اچانک یہ بتا کر اس نے حیران کر دیا کہ گائیں اچانک ڈیری سے غائب ہو گئیں۔
'غائب ہو گئیں یا رسی توڑ کر بھاگ گئیں۔؟'
'نہیں رسیاں تو انھوں نے پہلے ہی کھول لی تھیں۔ کیونکہ پوجا پاٹھ میں پریشانی ہوتی تھی۔'
'یعنی گائیں کھونٹوں سے بندھی ہوئی نہیں تھیں؟'
'بالکل بھی نہیں۔ انہوں نے اپنی مرضی سے دودھ دینا بند کر دیا اور پھر کھونٹوں سے خود کو آزاد کر لیا۔'
'ایسا کیسے ممکن ہے؟'
''مجھے معلوم ہے کہ کوئی یقین نہیں کرے گا۔ مگر سچ یہی ہے۔' پڑوسی نے رازدارانہ انداز میں بتایا۔ 'میرے کئی دوست جو ڈیری فارم کے مالک ہیں ان کے یہاں بھی اسی سے ملتے جلتے واقعات پیش آئے ہیں۔' جاتے جاتے وہ اچانک ٹھہر گیا۔ میری طرف غور سے دیکھا۔ پھر کہا۔ ' آپ نہ مانیں مگر.. گایوں کے اچھے دن شروع ہو گئے ہیں۔ جیسے ہمارے بُرے دن.... گائیں اب گربا کرنے لگی ہیں تو آپ کو حیرت نہیں کرنا چاہیے۔'
اس کے بعد وہ رُکا نہیں، دروازے سے اوجھل ہو گیا۔ ٹھیک یہی وقت تھا، جب میں نے سارہ کی آواز سنی۔
'فریج میں تو مٹن پڑا ہے۔ تم تو چکن لینے گئے تھے۔؟
'میں چکن لایا تھا۔'
'تو فریج میں جا کر چکن مٹن ہو گیا؟ یہ دیکھو۔'
میں جو کچھ دیکھ رہا تھا، اس پر یقین کرنا مشکل تھا۔ مگر اس بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں تھی کہ میں چکن ہی لایا تھا۔ اور صبح جب سارہ نے چکن لانے کی فرمائش کی تو میں چکن مارکیٹ میں ہی گیا، جہاں صرف چکن کا ہی گوشت ملتا ہے۔ افغانی چکن، لالی پاپ چکن، ہاف فرائی چکن، اطالوی چکن، کڑھائی چکن، بون لیس چکن۔ میری آواز کانپ رہی تھی... 'میں چکن ہی لایا تھا۔'
'تم آج کل بھولتے جا رہے ہو۔'
'نہیں بالکل بھی نہیں۔ اچھا ٹھہرو۔ صبح تم نے مجھے کتنے پیسے دیے تھے؟'
'ہاں میں نے گن کر دیے تھے۔'
'وہی تو۔'
'تم نے اپنے پاس سے لگائے ہوں گے۔' سارہ پیار سے بولی اور تم یہ بھی بھول گئے کہ محض اس بات پر پورے گھر کو جیل ہو سکتی ہے۔'

میں ایک لمحہ کے لیے چونک گیا۔ لیکن سارہ نے جو کہا، وہ صداقت پر مبنی تھا۔ حکومت کی طرف سے انسانی صحت و سلامتی اور تحفظ کے لیے جو ہدایات جاری ہوئی تھیں، ان پر عمل کرنا ضروری تھا۔ ان ہدایات کو باضابطہ پارلیمنٹ میں، قانونی شکل میں منظوری مل گئی تھی۔ ان ہدایات کے مطابق صبح سویرے آپ کو آن لائن ایک فارم بھرنا ہوتا تھا، جس میں کئی باتوں کی تفصیلات دینی ہوتی تھیں۔ مثلاً آج آپ کیا کر رہے ہیں؟ کہاں جا رہے ہیں؟ اور گھر میں بریک فاسٹ، لنچ اور ڈنر میں کیا کھانے کا پروگرام ہے۔ ان کے کل اخراجات کتنے ہوں گے....؟ ان ہدایات کا پابند ہر شہری تھا۔ سارہ ایک ذمہ دار شہری کی حیثیت سے غصہ کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ 'صبح فارم میں، میں نے چکن بھرا تھا۔ اب ہدایت والے فارم میں آن لائن جا کر دوبارہ یہ لکھنا ہوگا کہ ہم ڈنر میں مٹن کھانے جا رہے ہیں۔'

'کیاانتظامیہ اس بات کوتسلیم کرلے گا؟'

'کہانہیں جاسکتا۔'

'کیانہیں یہ دلیل نہیں دی جاسکتی کہ چکن اچانک فریج میں آکر مٹن بن گیا۔'

'بالکل دی جاسکتی ہے۔' سارہ نے پیار سے میری طرف دیکھا۔'وہ گھر کوجیل بنادیں گے۔دلیل دیں گے کہ چکن مٹن ہوسکتا ہے تو گھر جیل کیوں نہیں؟ اب اس کے ہونٹوں پر کافی دیر بعد ذراسی مسکراہٹ آئی تھی۔' گھر میں پاشا ہے۔پاشا بھی ہدایات پر عمل کررہا ہے۔اور ہاں سن لیجیے۔ہم ان ہدایات کے خلاف نہیں جاسکتے۔'

'پاشا کہاں ہیں۔'

'اپنے کمرے میں ہوگا، کچھ کررہا ہوگا۔'

میں پاشا مرزا کے کمرے میں آیا تو ایک بار پھر دنیا کے تیزی سے بدلنے کا انکشاف ہوا۔ مجھے خود پر حیرانی تھی۔ میں آخر سرکاری ہدایات پر عمل کرنا کیسے بھول گیا۔؟ ایک معمولی سی غلطی بھی ہمارے لیےنقصان دہ ثابت ہوسکتی ہے۔ پاشا سوچکا تھا۔مگر یہ کیا۔پاشا کی میز خالی تھی۔کہیں آس پاس کوئی کتاب نظرنہیں آرہی تھی۔ مجھے یادآیا۔کبھی بچوں کے بیگ ہوا کرتے تھے۔بیگ بھی ندارد تھے۔کتابوں کے بغیر پاشا نے کیا پڑھائی کی ہوگی؟ میں دوبارہ سارہ کے پاس آیا اور پاشا کی کتابوں کے بارے میں دریافت کیا تو اس بار وہ آتش فشاں کی طرح پھٹ گئی۔

'پاگل ہوگئے ہو یایادداشت چلی گئی ہے۔'

'کیوں۔؟'

'تمہیں پتہ نہیں کہ پاشا اسمارٹ فون سے پڑھتا ہے،فیس بک پرفرینڈس بناتا ہےاور پےٹی ایم سے پزا، برگراورآئس کریم خریدتا ہے۔'

'لیکن ابھی کچھ دن پہلے تک......'

سارہ کا لہجہ پیار بھرا تھا۔'تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔اس بار پریشان کیاتو میں آن لائن تمہاری شکایت کردوں گی۔'

مجھے یقین تھا۔سارہ اب ایسا کرسکتی ہے۔کیوں کہ اس بدلی بدلی ہوئی دنیا میں احکام وہدایات کی پابندی نے سب کوالگ الگ اکائی میں تبدیل کردیا تھا۔یہاں خاندان کا فرسودہ اورروایتی نظام کب کاختم کیا جاچکا تھا۔گھر کا تصور باقی ضرورتھا مگراس تصور میں ہرکوئی ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھا.....فرصت کس کوتھی۔گھر میں الگ موبائل اسکرین پرالگ الگ دنیائیں آبادتھیں۔لیکن یہ بات سب کو پتہ تھی کہ اس کی دنیا پرنظر رکھی جارہی ہے۔اس کی ایک مثال تو اسی وقت سامنے آگئی جب اچانک بیل بجنے کی آوازسن کر میں نے دروازہ کھولا......

یہ میرادوسراپڑوسی تھا۔خفیہ افسر۔اس کی بیوی ایک نوجوان کے ساتھ بھاگ گئی تھی اوروہ مزے لے لے کراس بات کا تذکرہ کرتا تھا کہ وہ اس حقیقت سے واقف تھا۔ بلکہ سوبار سے زیادہ گھر کے خفیہ سی سی ٹی وی کیمرے پر وہ اپنی بیوی اوراس کے بوائے فرینڈ کی فوٹیج سے لطف اندوز ہوچکا تھا۔

خفیہ افسر ہنستا ہواڈرائنگ روم کے صوفہ پرآکر دھنس گیا۔میری طرف دیکھ کرقہقہہ لگایا۔

'تو آج چکن،مٹن بن گیا۔'

میں اچانک چونک گیا۔ 'کیا میری سارہ نے فارم پر آن لائن انتظامیہ کو چکن کی جگہ مٹن بنانے کی اطلاع دے دی ہے؟' اگر ایسا نہیں ہے تو یہ خفیہ افسر کیسے جانتا ہے اور اگر ایسا کیا ہے تو انتظامیہ آئندہ ہمارے لیے سخت رویہ اپنا سکتا ہے۔'

'ہا... ہا... کیا سوچنے لگے' خفیہ افسر ہنس رہا تھا۔

'تمہیں کیسے پتہ چلا؟'

'ہمیں سب پتہ ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں سب کی آواز کا ریکارڈ ہوتا ہے۔'

'فون ٹیپنگ؟' (میں نے اس لیے پوچھا کہ ان دنوں جاسوسی اور فون ٹیپنگ کے واقعات بہت سننے کو مل رہے تھے۔)

اس نے پلٹ کر پوچھا... 'کیا یہ خبر تم نے کسی کو فون پر بتائی؟'

'نہیں.....' بالکل نہیں۔'

مگر ہمارے پاس ریکارڈ میں ہے۔

' کیسے؟' اب چونکنے کی باری میری تھی۔

خفیہ افسر ہنس رہا تھا۔ ہمارے محکمے نے ہر عورت کے پیچھے ایک سایہ لگا رکھا ہے۔'

'یعنی جاسوسی۔؟'

'ہاں۔'

مرد کے پیچھے کیوں نہیں۔'

وہ زور سے ہنسا۔ مرد کے پاس راز کہاں ہوتا ہے۔ مرد سارہ راز عورتوں میں منتقل کر دیتے ہیں۔'

وہ ٹیبل پر طشت میں رکھے پھلوں میں سے ایک کیلا اٹھا کر اس کے چھلکے اتار رہا تھا۔ 'کسی کی کوئی بھی حرکت ہم سے پوشیدہ نہیں ہے اور سنو' جاتے ہوئے اس نے ٹھہر کر کہا۔ 'کیلا میٹھا نہیں ہے۔ اس کی آن لائن شکایت کر دینا اور ہاں آئندہ خیال رہے۔ چکن مٹن نہ ہو جائے۔ ورنہ پڑوسی ہونے کا خیال نہیں کروں گا۔'

◆◆

یہ ان بہت سارے واقعات میں سے تھوڑی بہت تفصیل ہے، جو میں نے جمع کی ہے اور جمع اس لیے کی ہے کہ ان کا تعلق اس کہانی سے ہے، جو آگے میں آپ کو سنانے جا رہا ہوں۔ ایک مہذب دنیا میں ہم پابندیوں اور ہدایات سے بندھے ہوتے ہیں۔ تاریخ کی کتابیں جنگ عظیم کے تذکروں سے بھری پڑی ہیں۔ جب جنگیں اس لیے ناگزیر ہوئیں کہ ہماری حسین دنیا تھکی تھکی اور سوئی سوئی لگ رہی تھی۔ تھکنے اور سونے کا عمل ایسا ہے کہ دنیاوی حسن غارت ہو جاتا ہے اور حسن کے معیار کو قائم رکھنے کے لئے، دوسری صورت میں سجانے، سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جنگوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ بعض حکومتیں اس کے لیے سخت گیری کا مظاہرہ کرتی ہیں جو ان کا حق ہوتا ہے اور اس کے لیے وہ خواص اور عوام کے لیے الگ الگ ہدایات جاری کرتی ہیں اور اس میں حیرت کرنے جیسی کوئی بات نہیں کہ ہماری یہ دنیا ابھی بھی خواص اور عوام کے درمیان تقسیم ہے...... مثال کے لیے سکوں اور نوٹوں کو ہی لیجیے تو بڑے سکے اور نوٹ خواص کے لیے اور چھوٹے سکے عوام کے لیے رائج کیے گئے۔ ممکن ہے تاریخ اس بات کو بھی یاد رکھے کہ کبھی ان چھوٹے بڑے سکوں کے لیے بھی غیر علانیہ طور پر جنگوں کا اعلان ہوا تھا اور جیسا کہ ہر جنگ میں ہوتا ہے کہ کچھ لوگ مارے جاتے ہیں۔ حقیقت کی دنیا میں آئیے تو کچھ لوگ

یہاں بھی مارے گئے۔ دنیا کو حسین اور خوبصورت بنائے رکھنے کے لیے ایسی قربانیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب یہاں بھی ایک کنفیوژن ہے اور یہ کنفیوژن بھی تاریخ نے تمام جزئیات اور اعداد وشمار اور سابقہ واقعات و حادثات کو سامنے رکھ کر پیدا کیا ہے۔ اس کنفیوژن کو لے کر کئی نکتے ہیں، جن کو جاننا ضروری ہے۔ مثال کے لیے حکومت نے محسوس کیا کہ دنیا کے حسن کو بچانے کے لیے ان آوازوں کو خاموش کرنا ہوگا، جو عام طور پر فنکاروں اور دانشوروں کی طرف سے اٹھتی رہی ہیں، کیونکہ تاریخ گواہ ہے کہ ایسی خوفناک دانشورانہ آوازوں نے ہمیشہ سلطنت اور حکومت کے کاموں میں دخل دینے کی کوشش کی ہے۔ حکومت نے آسانی سے ان فنکاروں کے مقابلے اپنے فنکار نمائش میں اتار دیے اور اتنی بڑی تعداد میں اتار دیے کہ باغی دانشور اور فنکار اپنے اپنے گھر میں نیند کی گولی کھا کر سو گئے۔ ایک پریشانی بدنما، بدہیئت اور تعداد میں کم لوگوں سے تھی۔ ایک ساتھ ان کا صفایا مشکل تھا۔ لیکن حکومت نے عدلیہ کا سہارا لے کر اس کام کو بھی آسان بنا دیا۔ اب تیسرا محاذ خزانوں کا تھا۔ خواص نے خزانوں کی حفاظت کے لیے ملک کی سرحد پار کے علاقے چنے تھے اور اچانک سلطنت میں خزانے کی کمی کا احساس ہوا تو خفیہ ایجنسیوں کو تحقیقات کا کام سونپا گیا۔ تفتیش سے ایک نئی بات نکل کر سامنے آئی اور اس بات نے یقیناً حکومت کو حیران بھی کیا اور پریشان بھی۔ کیونکہ اصل خزانے تو عام کہے جانے والے لوگوں کے خفیہ تہہ خانوں میں موجود تھے۔ تضاد یہ تھا کہ یہ عام آدمی حکومت سے وابستہ خواص کو خزانوں کا مالک بتا کر اپنی جنگ لڑ رہا تھا۔ جبکہ اصلیت یہ تھی کہ خزانے عام آدمیوں کی تحویل میں تھے۔ حکومت نے عام آدمیوں کو بحفاظت خزانہ جمع کرانے کا اعلان سنا دیا۔ اس کے بعد ملک کے تمام گوشوں میں خزانہ جمع کرنے کے لیے میلوں لمبی قطار دیکھی گئی۔ اور جیسا عام طور پر ہوتا آیا ہے، کچھ لوگ اس قطار میں مارے گئے۔ لیکن ملک کی ایک بڑی آبادی کو ان مرنے والوں کا افسوس نہیں تھا۔ کیونکہ حکومت نے ان لوگوں کو ''ہماری دنیا خوبصورت ہو رہی ہے'' کا ایک ایسا نشہ گھول کر پلا دیا تھا، جس کے خمار میں یہ آبادی اب بھی ڈوبی ہوئی تھی۔

میں نے اس بارے میں اپنے تیسرے پڑوسی مسٹر ناگارجن سے استفسار کیا تو وہ زور سے ٹھہاکہ مار کر ہنس پڑے۔

'اب دیکھ لیجیے خزانہ کہاں ہے۔'

'لیکن یہ تو معمولی لوگوں اور غریبوں کے پیسے ہیں اور دنیا کی تاریخ میں شاید ایسا پہلی بار ہوا کہ غریب اپنے ہی پیسوں کے لیے قطار میں ہے۔'

'مسٹر ناگارجن ہنسے۔ 'تو کیا غریب کو دوسروں کے پیسوں پر ہاتھ صاف کرنے کے لیے قطار میں ہونا چاہیے تھا؟

'لیکن آپ انہیں قطار میں بھی مار رہے ہیں۔'

ناگارجن نے برا سا منہ بنایا۔ 'وہ اپنی موت مر رہے ہیں اور وہ اسی لائق ہیں۔'

'کیا آپ کو ان کی موت سے فرق نہیں پڑتا؟

'آپ کو پڑتا ہے؟' ناگارجن کا لہجہ سرد تھا۔ 'آپ باغبانی کرتے تو آپ کو پتہ ہوتا کہ باغ کی خوبصورتی قائم رکھنے کے لیے کمزور، کمہلائے پودوں کو بھی کبھی کبھی جڑ سے اکھاڑ کر پھینکنا پڑتا ہے۔'

'باغ کی خوبصورتی کے لیے آپ سکوں کی جگہ پلاسٹک لے کر آ گئے۔؟

ناگارجن زور سے ہنسے.... پلاسٹک کا زمانہ ہے۔ سوال نہ کیجیے۔ کیا آپ نے نئے احکام پر غور نہیں کیا۔ مخالفت دلیش دروہ ہے اور اس وقت بھی کوئی نہ کوئی کیمرہ ہمیں دیکھ رہا ہے۔ اس لیے اچھی، مناسب اور خوبصورت زندگی چاہتے ہیں تو بس ہدایات پر خاموشی سے عمل کرتے جائیے۔'

میں نے کمزور آواز میں پوچھا۔ ’کیا آپ کو لگتا ہے یہ کسان اور مزدور آئندہ برسوں میں پلاسٹک سے کھیل سکیں گے۔؟ مجھے نہیں لگتا۔‘
’کیا آپ کو لگتا ہے، ایک خوبصورت باغ کو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے۔؟ ناگارجن ہنسے۔ ’یہ تہذیب پلاسٹک کی ہے صاحب۔ زیادہ زور دیں گے تو پلاسٹک مڑے گا نہیں، ٹوٹ جائے گا.....ٹوٹ جائے گا تو کسی کام کا نہیں ہوگا۔‘

ناگارجن کے آخری جملے سے میں قدرے مطمئن تھا۔ ایک خوبصورت باغ کی تعمیر کے لیے ایسے لوگوں کی چنداں ضرورت نہیں، جو حکومت کی سخت گیر ہدایات کے باوجود پلاسٹک کھیلوں کا ذوق نہ رکھتے ہوں اور قطار میں مرنے کے لیے چلے آتے ہوں۔

وہ مجھے قطار میں ملا اور یہ میری اس سے پہلی ملاقات تھی۔ وہ اپنا خزانہ جمع کرنے حکومت کی ہدایت کے مطابق قطار میں کھڑا تھا۔ قطار میں یوں تو بہت سے لوگ تھے۔ مگر اس میں کچھ نہ ہونے کے باوجود، ایسا کچھ ضرور تھا، جو اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ مثال کے لیے وہ ایک کمزور بوڑھے کو دیکھ کر بار بار ہنس رہا تھا اور اس قدر زور زور سے ٹھہا کہ لگا رہا تھا کہ گھومتے ہوئے پولیس اہلکار بھی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ موسم ابر آلود تھا۔ خنکی میں اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ ایک بار پھر چلایا۔
’میں پھر کہتا ہوں۔ اس کو قطار سے نکالو۔ یہ مر جائے گا۔‘
’کیوں مرے گا؟‘
’کیونکہ.....یہ مرنے کے لیے ہی یہاں آیا ہے....‘ اس نے ایک بھدا سا قہقہہ لگایا۔
کچھ لوگوں کو بوڑھے پر رحم آ رہا تھا۔ وہ اس سے دریافت کر رہے تھے کہ وہ کب سے قطار میں کھڑا ہے۔ کس لیے کھڑا ہے۔؟ اور اسے اچانک خزانہ نکالنے یا جمع کرنے کی ضرورت کیوں پڑی؟ جس وقت ہجوم بوڑھے کی بے بسی کا جائزہ لے رہا تھا۔ ٹھیک اسی وقت خزانہ جمع کرنے والا دروازہ بند کر دیا گیا....آہنی دروازے سے ایک سرکاری ملازم نے ذرا سر باہر نکال کر اعلان کیا کہ اب دروازہ کل کھلے گا۔ کب کھلے گا؟ اس کے لیے حکومت کی ہدایت اور حکم کا انتظار ہے۔ یہی وہ لمحہ تھا، جب بوڑھا غش کھا کر زمین پر گرا اور ایک بار پھر اس آدمی کے قہقہہ کی آواز سنائی دی۔
’میں کہتا نہ تھا یہ مر جائے گا۔ اب اٹھاؤ اسے۔ یہ مر چکا ہے۔‘
بوڑھے کی لاوارث لاش اٹھانا بھی سرکاری فرائض کی مجبوری تھی۔ کیونکہ عام آدمی اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ بھیڑ آہستہ آہستہ چھٹ گئی۔ پولیس والے نے کسی سے موبائل پر رابطہ کیا۔ کچھ دیر بعد لاوارث لاش اٹھانے والی گاڑی آئی۔ میں اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اب بھی وہیں تھا۔ وہ کلین شیو تھا۔ لیکن میں نے محسوس کیا اتنی دیر میں اس کے گالوں پر چھوٹے چھوٹے بال پھیل گئے تھے اور اب یہ چہرہ مجھے جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ مگر اسے کہاں دیکھا ہے، یہ آخر تک مجھے یاد نہیں آیا۔ اس نے بوڑھے کی لاش اٹھانے میں مدد کی اور اس کے بعد وہ اچانک غائب ہو گیا۔

اس سے دوسری ملاقات بھی قطار میں ہوئی تھی۔ آج قطار اور بھی لمبی تھی۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور بزرگ بھی۔ بلکہ کچھ لوگ تو دوپہر اور رات کے کھانے بھی باندھ کر لائے تھے۔ اتفاق سے آج میڈیا والے بھی تھے۔ میڈیا والے اس کو گھیرے ہوئے کھڑے تھے۔ وہ زور زور سے اپنی بات کہہ رہا تھا۔

’یہاں جشن کا ماحول ہے صاحب۔ بلکہ میں کہتا ہوں، پکنک کا ماحول ہے۔ بی مشن سے کہیے یہاں سب مزے کر رہے ہیں۔ تھکے ہوئے لوگوں کو مدت سے ایسی تفریح کی ضرورت تھی اور حاکم اس بات کا بالکل خیال نہ کریں کہ کچھ لوگ اس جشن میں مارے جا رہے ہیں۔ ایسے لوگ ہر جگہ مارے جاتے ہیں۔ گلیوں میں، کوچوں میں، سڑکوں پر۔ جیسے کیڑے مر جاتے ہیں یا مار دیے جاتے ہیں۔ لیکن ہم بہت خوش ہیں صاحب.....‘‘

’کیوں خوش ہیں؟‘ ایک میڈیا والے نے دریافت کیا۔

’کیونکہ حاکم خوش ہے....‘ اس نے قہقہہ لگایا.... ہم کام کرتے کرتے، روزگار اور دو روٹی کی فکر کرتے کرتے تھک گئے تھے۔ اب کوئی روزگار نہیں۔ سب دھندے بند اور قطار میں عیش کر رہے ہیں۔ گانا گا رہے ہیں..‘

اس نے ایک بے سُرا گانا شروع کیا تو میڈیا والے نے روک دیا۔ ’بس، اتنا کافی ہے۔‘

’اتنا کافی نہیں ہے۔‘ وہ ایک بار پھر چلایا۔ زور سے قہقہہ بلند کیا..’یہاں جو قطار دیکھ رہے ہیں، یہ سب مارے جائیں گے۔ ان میں کوئی زندہ نہیں بچے گا۔ مگر پریشان نہ ہوں۔ ہم ایک نہ ختم ہونے والی تفریح اور جشن کا حصہ ہیں۔ جشن میں مارے جانے والوں کا افسوس کیا کرنا..‘ وہ دوبارہ چلایا.... ہم بہت خوش ہیں۔ زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں۔ ہم بہت خوش ہیں۔‘

میں ٹی وی نہیں دیکھتا۔ اخبار نہیں پڑھتا۔ اس لیے یہ معلوم کرنے سے قاصر رہا کہ میڈیا نے بریکنگ نیوز میں اس شخص کو پروگرام کا حصہ بنایا یا نہیں۔ مگر اس دوسری ملاقات میں اس کی گفتگو میرے اندر تک اتر گئی تھی۔ وہ غلط نہیں تھا۔ اس وقت پورا ملک ایک نہ ختم ہونے والے سرور اور جشن میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ سیلفیوں کا دور تھا۔ خزانے کے دروازے سے باہر آنے والا ہر شخص کسی فاتح کی طرح اپنی سیلفی لیتا اور اسے سوشل ویب سائٹس پر ڈال کر اپنی کامیابی کے قصے کو عام کرنے کی کوشش کرتا۔ اس لیے دوسری ملاقات میں اس نے جشن اور تفریح کے نام پر جو کچھ بھی بیان دیا، اسے غلط نہیں کہا جا سکتا۔

یہ میری ذاتی سوچ تھی کہ میں ایک آسان زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا گیا ہوں۔ آسان زندگی، جہاں آپ کو سوچنا نہیں ہے کہ کیا ہو رہا ہے۔ سبحان علی کیوں مرا۔ سمیرا کی عصمت دری کیوں کی گئی۔ محمد فرقان، زرین حیدر، شاہنواز قادری کو کیوں مارا گیا۔ سعدیہ کو جیل کیوں بھیجا گیا۔ شاستری نے مرنے سے پہلے جو لکھا، اس کے بارے میں بھی سوچنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ نظام یہی چاہتا ہے کہ تمام لوگ مخالف سوچ سے آزاد ہو جائیں اور آسان زندگی گزاریں۔ ایسا سوچنے والوں کی تعداد ملک میں یقیناً ہوگی، مگر میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ احکام، ہدایات، خفیہ ایجنسیوں کے سایے اور گھروں میں آویزاں سی سی ٹی وی فوٹیج کے دائرے میں زیادہ غور و فکر کرنا عام شہری کے حقوق میں شامل نہیں تھا اور جیسا کہ خفیہ محکمہ کے افسر نے بتایا تھا کہ ہماری آواز اور گھر میں ہونے والے واقعات بھی حکومت کے ریکارڈ میں شامل ہیں تو اس بات پر یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا، جس پر نظر نہ رکھی جا رہی ہو اور جہاں معمولی معمولی باتوں کو بھی آن لائن حکومت کے ریکارڈ میں شامل کیا جا رہا ہو، وہاں زندگی گزارنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ جو کہا جا رہا ہے آپ اس پر عمل کرتے جائیے۔ تاریخ کی قبرگاہ میں ایسے ہزاروں قصے آپ کو آسانی سے مل جائیں گے، جہاں حاکم کے قائم کردہ دستور اور ہدایات پر عمل کرنا آسان زندگی کا پیش خیمہ رہا ہے۔ اس بادشاہ کی مثال کافی ہے، جس نے مسکراتے ہوئے عوام سے کہا۔ بس اپنی زندگی مجھے دے دیجیے۔ آپ وہی دیکھیے جو میں دکھانا چاہتا ہوں۔ آپ وہی سُنیے جو میں بیان دیتا ہوں۔ آپ وہی بولیے، جو میں آپ کو سکھاتا ہوں۔

قصہ کوتاہ جشن میں ڈوبے ہوئے ملک کو کئی ماہ گزر گئے تھے۔ اچانک ایک سبزی منڈی میں اس سے ملاقات ہوگئی۔ یہ اس سے تیسری ملاقات تھی۔ سبزی منڈی میں عام طور پر چلنے والوں کے لیے جگہ نہیں ہوا کرتی تھی۔ آواز کا شور اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ کچھ پل کھڑا رہنا بھی آسان نہیں ہوتا..... مگر اس دن نہ شور تھا نہ ہنگامہ۔ اکا دکا لوگ تھے جو سر مارے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ اچانک میری نظر اس پر پڑ گئی۔ وہ ایک دکان کے آگے کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک بڑا نوٹ تھا۔ جس کو وہ نچا نچا کر زور زور سے کہہ رہا تھا۔

’آخری بار دیکھ لو۔ پھر نہیں دیکھ پاؤ گے۔‘

دکاندار سمجھا رہا تھا۔ جیب میں رکھ لو۔ پولیس آ گئی تو تمہارے ساتھ میری بھی شامت آ جائے گی۔

’کیوں رکھ لوں؟‘

’کیونکہ ان نوٹوں کو رکھنا جرم ہے۔‘

’لیکن میرے پاس تو یہی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی سکّہ نہیں۔‘

میں اس کے قریب آ گیا۔ غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ پھر پوچھا۔ ’تو یہ نوٹ نہیں چلا۔؟

’نہیں۔ نوٹوں کو چلنا کہاں آتا ہے‘۔ اس بات پر وہ پھر زور سے ہنسا۔

’لیکن اس دن تو آپ قطار میں جشن کی باتیں کر رہے تھے؟‘

’اب بھی کر رہا ہوں۔ بڑے نوٹ کا پاس میں ہونا کیا کسی جشن سے کم ہے۔؟ اچانک وہ رک گیا..... دیکھیے ....

’کیا.....؟‘

’غور سے دیکھیے۔ نوٹ بڑا ہو رہا ہے۔ ایک زمانے میں، تاریخ گواہ ہے جب جانور ’پا گیٹ‘ بن گئے تھے۔ مکڑیاں، چھپکلی، معمولی کیڑے مکوڑے اچانک پھیل کر بڑے ہو گئے۔ اچانک اتنے بڑے کہ انسان ڈر کر اپنے اپنے گھروں سے بھاگنے لگا..‘ وہ ہنس رہا تھا۔ دیکھیے..... یہ نوٹ پھیل رہا ہے۔ بڑا ہو رہا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں نا.....

مجھے واقعی احساس ہوا کہ بڑا نوٹ اچھل اچھل کر پھیل رہا ہے۔ پھیلتے..... پھیلتے..... نوٹ کا سائز اس عام آدمی سے زیادہ ہو گیا۔ اب وہ آدمی غائب تھا۔ مگر وہ گیا کہاں؟ میں اسے چاروں طرف تلاش کر رہا تھا۔ عجیب بے تکا آدمی تھا۔ چھلاوا تھا کہ یکا یک غائب ہو گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے نوٹ تھا اور نوٹ پھیلتے پھیلتے ایک ہلکی آواز کے ساتھ غبارے کی طرح پھٹ گیا۔

یہ میری اس سے تیسری ملاقات تھی۔ جب نوٹ اور وہ دونوں ہوا میں غائب تھے۔ تیسری ملاقات میں اس کی داڑھی کچھ کچھ بڑھ چکی تھی۔ ممکن ہے قطار میں کھڑا رہنے کی وجہ سے اس نے چہرے پر دھیان نہیں دیا ہو۔ مگر چوتھی ملاقات ایسی تھی جب میں زیادہ سنجیدگی سے اس کے بارے میں غور کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ کالونی میں کسی کا انتقال ہو گیا تھا۔ یہ وہی ڈیری فارم کا مالک تھا، جس کی گایوں نے اچانک پوجا پاٹھ شروع کر دی تھی۔ اور ایک دن اچانک ڈیری فارم سے گائیں باہر نکل کر خدا جانے کہاں غائب ہو گئیں۔ اس سانحہ سے میرا پڑوسی اتنا ٹوٹ گیا کہ بالآخر اس نے رسّی کا پھندہ گلے میں ڈال کر خودکشی کر لی۔

میں نگم بودھ گھاٹ آیا ہوا تھا۔ گھاٹ پر ایک قطار سے کئی انسانی جسم جل رہے تھے۔ انسانی لاشوں کے جلنے کی بو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ بو سے بچنے کے لیے میں نے چہرے کو رومال سے محفوظ کر لیا تھا۔ اچانک میری نظر اس پر پڑی۔ مجھے تعجب تھا کہ وہ یہاں کیا کر رہا

ہے۔اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ آج غائب تھی....وہ الگ الگ سلگتی لاشوں کے قریب جا کر کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آج میں نے اسے غور سے دیکھا اور اچانک خوف کی ہلکی ہلکی سرسراہٹ میں نے اپنے جسم میں محسوس کی۔اس کی داڑھی بڑھ گئی تھی۔اور اب اس چہرے کو پہچاننا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔

مگر حیرت انگیز طور پر دو چہروں میں اتنی مشابہت کیسے ہوسکتی ہے....مجھے خیال آیا کہ عام طور پر بڑے بڑے لیڈروں کے جلوس میں ،سبھاؤں میں عوام کچھ مشہور لوگوں کے ماسک لگا کر اپنی حمایت کا اعلان کرتے ہیں۔ایک مفکر کا خیال تھا کہ کبھی کبھی ماسک غائب ہو جاتا ہے اور ماسک کا چہرہ ہی عوام کا چہرہ بن جاتا ہے۔میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب آیا۔

'کیا تلاش کر رہے ہو؟'

اس نے میری طرف دیکھا پھر آگے بڑھ گیا۔یہاں لاش کو آگ دی جا رہی تھی۔

'میں تمہیں پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔'

'شی...'اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔'یہاں بھی کیمرہ ہے۔پاگل ہو گئے ہو کیا؟'

'لیکن تم کس کو تلاش کر رہے ہو؟'

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا...کل رات میں سویا نہیں تھا۔دیر تک سڑکوں پر بھٹکتا رہا۔پھر شمشان گھاٹ چلا آیا۔یہاں آکر مجھے کافی سکون ملا....میں نے طے کر لیا کہ مجھے رات یہیں گزارنی ہے.....پہریدار کو نوٹ دیا تو اس نے لے لیا۔اسے معلوم بھی نہیں کہ ہماری دنیا میں کیا کیا ہو چکا ہے۔ایک لمحہ کے لیے وہ رُکا۔بڑی زور کی نیند آئی۔'اس نے اشارہ کیا۔میں وہاں سویا تھا۔نہیں شاید وہاں..نہیں میں یہاں سویا تھا۔'وہ دوبارہ ہنسا۔شاید میں اب بھی یہیں سو رہا ہوں..'

اس بار اس کی آواز سرد تھی۔اس سے پہلے کہ میں اسے دیکھ پاتا۔وہ میرے سامنے سے غائب تھا۔یہ اس سے چوتھی اور آخری ملاقات تھی۔میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ اس بھاگم بھاگ میں تم نے اپنے چہرے کو بدنما بنا لیا ہے۔تم پھر سے کلین شیو ہو جاؤ تو اچھے لگنے لگو گے....مگر اس سے قبل کہ میں اپنی بات مکمل کرتا، وہ اپنی جگہ سے غائب تھا۔

اور یہ پانچویں ملاقات تھی۔ایک چونکانے والی ملاقات،جس کی تفصیل میں آپ کو بتا چکا ہوں۔یعنی اس شب فریج میں رکھا ہوا چکن اچانک مٹن بن گیا۔سارہ میری خطا پر ناراض تھی۔جب وہ سونے کے لیے اپنے کمرے میں آئی تو اس وقت بھی اس کی ناراضی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ بیڈ کے قریب ہی ایک سنگار دان تھا جس پر ایک بڑا سا شیشہ جڑا تھا۔میری نظر اچانک شیشہ کی طرف چلی گئی۔سارہ اسی وقت بولتی بکتی ہوئی کسی کام سے کمرے سے باہر گئی تھی۔میں اچانک چونک گیا۔میں نے کئی بار آنکھیں مل مل کر شیشہ کی طرف دیکھا۔مجھے یہ بھی خیال تھا کہ یہ میرا وہم ہوسکتا ہے۔خود کو غلط ثابت کرنے کے لیے میں نے اپنے تیز ناخنوں کا سہارا لیا۔مگر یہ کوئی خواب نہیں تھا۔آئینہ میں میرا چہرہ نہیں تھا۔آئینہ میں اس آدمی کا چہرہ آ گیا تھا۔اور اب اس شخص کا چہرہ بھی غائب تھا۔چہرے کی جگہ داڑھی موجود تھی۔صرف داڑھی....وہی داڑھی جو اس کے چہرے کو بدنما بنا رہی تھی۔میں نے شیشہ کی طرف پلٹ کر دیکھا تو میرا چہرہ داڑھی میں سما گیا تھا۔آئینہ کے عکس میں اب میں ایک داڑھی والا اجنبی تھا۔اچانک وہ جانے کہاں سے نکل کر میرے برابر میں کھڑا ہو گیا۔وہ ہنس رہا تھا۔

'تم بدل رہے ہو۔'

'ملک بدل رہا ہے۔' وہ ہنس رہا تھا۔ غور سے آئینہ میں دیکھو.....'

'دیکھ لیا۔ یہ میرا چہرہ نہیں ہے۔'

غائب ہونے سے پہلے اس کا آخری جملہ تھا۔ کیا میرا چہرہ، میرا چہرہ تھا؟

'ارے سنو تو.....'

لیکن وہ غائب تھا۔ سارہ کمرے میں آئی اور آئینہ کی طرف دیکھا تو اس نے زور کی چیخ ماری۔ میں آئینہ کی طرف دیکھ کر حیران تھا۔ مجھے داڑھی کے ساتھ اپنی بیوی سارہ کسی طور پر قبول نہیں تھی۔

'یہ کیا ہو رہا ہے۔' سارہ زور سے چیخی۔

'نہیں معلوم۔'

'یہ تمہارے چہرے پر داڑھی کیسے آ گئی۔؟

'کہاں ہے؟'

'لیکن آئینہ میں تو ہے۔'

'ہاں۔'

'اور آئینہ میں تمہارے نازک چہرے پر بھی یہ داڑھی موجود ہے۔'

وہ گھبرا کر ایک بار پھر چیخی۔ 'یہ کیا ہو رہا ہے۔'

میری آواز پھنسی پھنسی تھی۔ میں نہیں جانتا یہ کیا ہو رہا ہے۔ پہلے جو کچھ بدلا گیا، کیا ہم اس کے لیے تیار تھے۔؟ اب چہرہ بھی بدل گیا ہے۔'

'کچھ تو کرنا ہوگا' سارہ خوفزدہ تھی۔

'ہاں کچھ تو کرنا ہوگا۔ ایک کام کرتے ہیں....' میری آواز اب کمزور تھی...' آئینہ کا رخ دیوار کی طرف کر دیتے ہیں۔'

پھر خود کو کیسے دیکھیں گے؟'

سنگاردان گھماتے ہوئے اور شیشہ کا رخ دیوار کی طرف کرتے ہوئے میری آواز پہلے سے کہیں زیادہ کمزور تھی..' کیا خود کو دیکھنے کی ضرورت ہے؟'

میرے لیے ان تمام واقعات و حادثات کا تجزیہ کوئی مشکل کام نہیں تھا، جو ادھر پچھلے کچھ برسوں میں تیزی کے ساتھ پیش آئے۔ گو ان کی شروعات کافی پہلے سے ہو چکی تھی۔ مگر اس رات شیشے والے حصے کو دیوار کی طرف کرتے ہوئے مجھے شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ میرے بدن میں ان گنت چیونٹیاں رینگ رہی ہیں۔ کیا یہ محض احساس تھا یا اس بات کی پیشگی اطلاع کہ عنقریب میرے ساتھ کچھ بھیانک ہونے جا رہا ہے۔ اس رات خوف کا احساس کچھ اس قدر شدید تھا کہ کمرے میں اندھیرے کی جگہ میں نے ٹیوب لائٹ کو جلتا چھوڑ دیا۔ نیم شب سارہ کسمائی ہوئی حالت میں، کچھ ڈھیر ساری الجھنوں کے پیش نظر اچانک اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پھر میری طرف اشارہ کیا......

'تم کچھ آواز سن رہے ہو؟'

’ہاں......‘

’یہ کہاں سے آ رہی ہے......‘

کچھ بھن بھن کرتی آوازیں تھیں جیسے شہد کی مکھیوں کا شور ہوتا ہے۔ میں نے پلٹ کر سنگھاردان کی طرف دیکھا۔ بوسیدہ لکڑی کا گھسا ہوا حصہ میرے سامنے تھا۔لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے بار بار سنگھار میز کو ہلانے کی کوشش کی جا رہی ہو......

سارہ کا لہجہ خوف سے پرتھا۔’’ کچھ دنوں سے عجیب عجیب حرکتیں ہو رہی ہیں۔کیا خفیہ محکمے ان حرکتوں سے واقف ہیں۔‘‘

’ہاں۔‘ مجھے ہنسی آئی۔’ان کے پاس سارے ریکارڈ ہوتے ہیں۔‘

پھر وہ کیا کر رہے ہیں۔؟

’ابھی ان کی تحقیق چل رہی ہے۔سو جاؤ۔ان کی تفتیشی ایجنسیاں گھروں پر خصوصاً ہم جیسوں کے گھروں پر خاص نگرانی رکھتی ہیں۔‘

مجھے احساس تھا کہ عالمی سطح پر آنے والی بڑی تبدیلیوں میں خاموشی سے ہمیں بھی شریک کر لیا گیا تھا۔ہم اچانک ہونے والی تبدیلیوں کے بڑے بازار کا حصہ تھے۔اور اس بڑے بازار نے ہمیں چھوٹے موٹے روبوٹ یا مشین میں تبدیل کر دیا تھا۔ بچے بھی مشین میں کام آنے والے کل پرزے تھے۔اور اس مشین پر اختیار کسی اور کا تھا۔یعنی اس وقت ہماری کوئی حیثیت نہیں تھی۔ دوسرے دن مجھے اپنے بہت سارے سوالوں کا جواب مل گیا تھا، جب اچانک بیل کی آواز کے ساتھ ہمارے پڑوسی خفیہ افسر نے مسکراتے ہوئے گھر کے اندر قدم رکھا۔

میز پر ایک طشت میں کچھ فروٹس رکھے ہوئے تھے۔اس نے نارنگی کا انتخاب کیا اور اس کے چھلکے ادھیڑنے لگا۔اچانک اس نے کچھ ناگواری کے انداز میں میری طرف دیکھا۔

’ آپ نے محسوس کیا؟ کچھ اسمیل آ رہی ہے......‘

’نہیں۔ میں نے محسوس نہیں کیا۔‘

’یہ اسمیل باہر سے ہوتی ہوئی آپ کے گھر کا حصہ بن گئی ہے۔ کچھ تو گڑ بڑ ہے۔‘وہ مسکرایا۔’ آپ کے نام گرفتاری کا وارنٹ ہے۔ مجھے آپ کے گھر کی تلاشی لینی ہے۔‘

’وارنٹ‘ میں خوف سے نہا گیا۔کس بات کا وارنٹ......؟

وہ مزے سے نارنگی کھا رہا تھا۔ادھر کچھ دنوں سے آپ لگا تار وارداتیں انجام دیتے رہے ہیں۔‘

’واردات......؟

’ہاں۔ ہمارے پاس سی سی ٹی وی فوٹیج ہے۔ باضابطہ ہر بات کا ریکارڈ ہے۔‘

وہ مسکرایا...... پہلے بچوں کے پارک کو ہی لیجیے۔ چھوٹی سی گیند اچانک غبارہ بن گئی۔‘

’ہاں۔ یہ افواہ سنی تھی۔‘

افواہ نہیں۔سچائی ہے۔ وہاں آپ تھے،آپ کی فوٹیج موجود ہے۔اور آپ کی وجہ سے ایسا ہوا؟‘

’مطلب؟‘ میری وجہ سے معمولی سی گیند غبارے میں تبدیل ہوگئی۔؟‘

’بالکل سہی۔‘

'یہ کیا منطق ہوئی۔'

وہ زور سے ہنسا۔ ہماری تحقیقات میں کسی منطق یا دلیل کو دخل نہیں ہوتا۔ گیند کا اچانک غبارہ بن جانا دہشت گردی ہے۔ آپ وہاں تھے۔'

اس لیے مسئلہ زیادہ سنگین ہے۔'

میرا دماغ بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ ادھر چند دنوں میں جو تفصیلات میں نے جمع کی تھیں، انھیں میرے خلاف بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس وقت خفیہ افسر یہی کر رہا تھا۔

اس بار اس نے طشت سے ایک سیب اٹھا لیا۔ میری طرف دیکھا۔ آپ اس وقت ڈیری میں موجود تھے جب گائیں پوجا کر رہی تھیں۔ آپ جانتے ہیں نہ کہ گائے کے ہونے کا مطلب کیا ہے؟ اور کسی کی پوجا میں دخل دینا کتنا بڑا جرم ہے۔؟

مجھے یاد آیا، اس صبح پڑوسی کو دیکھنے کے بہانے اچانک میرے قدم ڈیری کی طرف اٹھ گئے تھے۔ میں نے گایوں کو دیکھا مگر یہ دیکھنا نظر بھر سے زیادہ نہیں تھا۔

''ان گایوں نے اپنے سینگوں سے کچھ شاطر بدمعاشوں کو ہلاک کیا تھا۔ پھر یہ گائیں گم ہو گئیں۔''

'تو انہیں تلاش کیجیے۔'

'نہیں۔ یہ آپ کی وجہ سے گم ہوئیں۔ آپ ڈیری میں گئے اور یہی وقت تھا جب گایوں کی گمشدگی کا قصہ شروع ہوا۔'

'یہ کیا منطق ہے؟' میں زور سے چلایا۔

اس بار اس کی آواز سرد تھی۔ میں نے کہا نا۔ تفتیش میں کوئی منطق کام نہیں آتی۔ ہم فیصلہ سناتے ہیں، منطق کا آگا پیچھا نہیں دیکھتے۔'

سیب کھاتے ہوئے اس نے تیسرا حملہ کیا۔ اس دن چکن اچانک مٹن نہیں بنا۔ اس کے پیچھے بھی آپ کی سازش تھی۔ یہ سب باتیں ہمارے ریکارڈ میں ہیں۔ لیکن یہ بڑے الزامات نہیں ہیں۔ ان چھوٹے موٹے الزامات کے لیے آپ کو بس کچھ برس کی سزا ہو سکتی ہے۔ مگر بڑا الزام......'

خفیہ افسر نے غور سے میری طرف دیکھا۔ اس دن بھی آپ قطار میں پائے گئے، جس دن ایک بزرگ منافع خور زمین پر گر کر مر گیا۔'

اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ اب اصل بات پر آتا ہوں۔ آپ اس آدمی کو پہچانتے ہیں جو بوڑھے کی موت پر ہنس رہا تھا...؟۔ اس نے بوڑھے کی لاش گاڑی تک پہنچانے میں بھی ہماری مدد کی تھی۔'

'جی۔'

'شکریہ۔ اب آپ تفتیش میں ہمارا ساتھ دے رہے ہیں۔ پھر تو آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ وہ کہاں ہے....؟

'جی۔ بالکل بھی نہیں۔'

'دیکھیے۔ ہمارے پاس پوری رپورٹ ہے۔ اس دن میڈیا والے بھی تھے۔ اور آپ بھی۔ آپ ہنس رہے تھے۔ یعنی یہ حادثہ گایوں کی گمشدگی کے تین چار دن بعد ہی سامنے آیا۔'

'اس واقعہ کا گائے کی گمشدگی سے کیا تعلق؟۔

خفیہ افسر زور سے ہنسا....؟ گایوں کا تعلق ہر واقعہ سے ہے۔ آپ کو بھلے ہی تعلق نہ ہو، ہمیں گایوں کی اس گمشدگی کا خیال ہے۔' اس نے اس بار جلتی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ تیسری بار آپ اس آدمی سے سبزی منڈی میں ملے تھے۔'

'جی ہاں۔'

'سبزی منڈی میں اس کے ہاتھ میں ایک نوٹ تھا۔ کالا دھن......' خفیہ افسر اس بار زور سے چلایا۔ اچانک نوٹ کہاں چلا گیا۔ اور اس کے بعد آپ شمشان گھاٹ گئے تھے۔ نوٹوں کو جلانے یا انسان کو جلانے؟'

خفیہ افسر شک کی نگاہوں سے میری طرف دیکھا تھا۔ وہ آدمی اس دن بھی آپ کے ساتھ تھا۔ اور اس دن کے بعد سے وہ غائب ہے۔ کہاں گیا؟'

'میں نہیں جانتا۔ لیکن ایک بات سے میں بھی پریشان تھا۔'

'کس بات سے؟'

آپ نے سی سی ٹی وی کیمرے میں اس کی فوٹیج دیکھی ہوگی۔ اچانک اس درمیان اس کا چہرہ بدل گیا تھا۔ اور اس کے چہرے پر داڑھی آگئی تھی۔ ٹھیک اسی طرح کی داڑھی جیسے......'

خفیہ افسر اس بار اتنے زور سے چلایا کہ مجھے کان کے پردے تک پھٹتے ہوئے محسوس ہوئے......

'داڑھی کا کوئی ذکر نہیں۔'

'مگر کیوں؟'

'میں نے کہا نا۔ داڑھی کا کوئی ذکر نہیں۔' اچانک اس نے ناک سکوڑتے ہوئے منہ بنانے کی کوشش کی۔ اسمیل بڑھ گئی ہے۔ مجھے آپ کے گھر کی تلاشی لینی ہوگی۔ آیئے میرے ساتھ......

ادھر ادھر دیکھتا ہوا اب وہ میرے ساتھ میرے بیڈ روم میں تھا۔

وہ آنکھیں نچا نچا کر سنگار میز کو دیکھ رہا تھا۔ اور یہ میری آنکھوں کا دھوکہ نہیں تھا، سنگھار میز اب تک ہل رہی تھی۔ اسی طرح جیسے نیم شب میں نے ہلتے ہوئے دیکھا تھا۔

'اس کے پیچھے کیا ہے؟' خفیہ افسر زور سے چیخا......

'پیچھے کچھ نہیں ہے'

'میں کہتا ہوں پیچھے کچھ ہے۔'

وہ غصے میں آگے بڑھا۔ دونوں ہاتھ سے سنگھار میز کو تھام کر اپنی طرف کھینچا۔ اور اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ میرے لیے بھی چونکانے والا تھا۔ اس کے ہاتھ اچانک سیلیوٹ کے لیے اٹھ گئے، شیشے کا رخ دوبارہ اس نے دیوار کی طرف کر دیا۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا یا خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا... مگر ایک لمحے کے لیے میں نے اس کی آنکھوں میں خوف کی جھلک محسوس کی تھی۔

دوبارہ ڈرائنگ روم میں آنے تک وہ خود کو بحال کر چکا تھا۔ میری زبان گنگ تھی۔ ہوش و حواس گم تھے۔ اس نے سر کو ایک جھٹکا دیا اور میرا ہاتھ تھام لیا۔

'آپ کو ابھی اسی وقت میرے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا ہوگا۔'

مجھے معلوم تھا کہ موجودہ حالات میں مجھ پر جو الزامات لگائے گئے ہیں، ان الزامات سے باہر نکلنا میرے لیے مشکل ثابت ہوگا۔ مجھے جینے کی طرح اس سزا کو قبول کرنا ہوگا، جو ان حالات میں عدالت مجھے سنائے گی۔ مجھے اس بات پر بھی کوئی حیرت نہیں ہوئی کہ فیصلے کی

پہلی سنوائی میں جج نے دوبار میرا نام کیوں لیا۔ مجھے یقین ہے، اس درمیان اس نے غور سے میری طرف دیکھ کر سرکاری ہدایات کا بغور جائزہ لیا ہوگا۔ سزا ملنے کے ایک ہفتہ بعد سارہ جیل میں مجھ سے ملنے آئی تھی۔ اس کے چہرے پر کسی طرح کی کوئی شکن موجود نہیں تھی۔ الجھنوں کے باوجود اس کے چہرے پر میں نے سکون اور طمانیت کی جھلک محسوس کی۔ اس نے بتایا، سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ ٹی وی خراب ہوگیا تھا اس لیے اس نے بیچ دیا۔ اخبار کا بل زیادہ آنے لگا تھا۔ اس لیے اس نے اخبار بند کر دیا۔ پاشا مزے میں ہے۔

'اس نے دبے لفظوں میں بتایا.... ہاں.. وہ ہے۔ اور وہ کبھی کبھی ہمارے کمرے میں چلا آتا ہے۔'

اس کے بعد وہ ٹھہری نہیں چلی گئی....

میں نے جیل کی سلاخوں کے پار دیکھا... مجھے یقین تھا، کوئی مجھے اس وقت بھی دیکھ رہا ہے... قید خانے میں مچھر پریشان کر رہے تھے اور مجھے زور کی نیند آ رہی تھی۔

(۱۳)

دس دن بعد مجھے رہائی مل گئی۔ جیل کی صعوبتوں سے آزادی ملی تو میں گھر آ گیا۔ میں بیمار تھا اور ذہن میں ابھی بھی چکر آ رہے تھے۔ میں نے پاشا مرزا کو دیکھا اس کے چہرے پر خاموشی تھی۔ سارہ مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔ مجھے اس کی آنکھوں میں نمی کا احساس ہوا۔

' چلو۔ تمہیں ہوش آ گیا۔'

سارہ کی بات سن کر میں زور سے چونکا۔ 'ہوش۔ میں جیل سے آ رہا ہوں۔'

' ہاں۔'

' اور تم نے دیکھا نا....وہ آدمی....'

' میں نے سب کچھ دیکھا۔'

' تم ملنے بھی آئی تھیں۔ ٹی وی تو گھر میں موجود ہے۔' میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

' میں نے تم سے جھوٹ کہا تھا۔' سارہ نے مسکرانے کی کوشش کی۔

' اور تم نے یہ بھی کہا کہ وہ اکثر تمہارے درمیان آ جاتا ہے۔'

' ہاں یہ سچ ہے۔'

' ابھی وقت کیا ہوا ہے؟'

' وقت رُک گیا ہے۔'

' رُک گیا ہے؟'

' گھڑی بند ہے۔' سارہ آہستہ سے بولی۔ لیٹ جاؤ۔ ڈاکٹر نے تمہیں آرام کا مشورہ دیا ہے۔'

' اب یہ ڈاکٹر کہاں سے آ گیا۔؟'

' میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے گئی تھی۔'

'ہاں میں بیمار ہوں۔ دس دن جیل میں.....اور وہ گھٹن۔'
'اس کمرے میں تمہیں گھٹن کا احساس نہیں ہوگا۔'
'ہاں۔' میں نے آہستہ سے کہا۔ سنگھاردان کی طرف دیکھا۔
'اب یہ ہلتا نہیں ہے۔' سارہ آہستہ سے بولی۔ 'خدا کے لیے خود کو ٹھیک کرو۔'
'تم بھی بیمار نظر آ رہی ہو۔'
'میں کہیں سے بیمار نہیں ہوں۔'

سارا اٹھ کر چلی گئی تو میں بکھری ہوئی کڑیوں کو جوڑنے لگا۔ نیند میں چلتے ہوئے کچھ لوگ تھے کچھ لوگ تھے جو ایک بڑی سی لوہے کی وین میں بیٹھ رہے تھے۔ ایسی وین میں نے کچھ تصویروں میں دیکھی تھی۔ مجھے وین سے دھواں نکلتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

اتل دا ملنے آئے تھے۔ کچھ دیر بیٹھے پھر چلے گئے۔ مجھے احساس تھا کہ اب میں زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہوں گا۔ اس درمیان سارہ مجھے لے کر دو بار ڈاکٹر کے یہاں گئی۔ ڈاکٹر نے کچھ ٹسٹ بھی لکھے۔ ایک سیاہ آہنی دروازہ تھا اور اس کے ذرا سا پیچھے میں کھڑا تھا۔ یہ دروازہ کبھی بھی مجھے اپنی آغوش میں لے سکتا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ فکر پاشا مرزا کی تھی، وہ ان حالات کا سامنا نہیں کر سکتا۔ نفرت کی ایک منزل محبت بھی ہے۔ لیکن یہ بات صرف رشتوں کی حد تک کہی جا سکتی ہے۔ میں زیادہ دیر تک آرام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ چلتا ہوا کھڑکی کے پاس آیا۔ مجھے کچھ دوری پر دھواں اٹھتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ درخت کے سایے میں کوئی کھڑا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا، یہ وہی آدمی تھا۔ پراسرار آدمی جو آخری بار مجھے قبرستان میں نظر آیا تھا اور جسے تلاش کرتی ہوئی خفیہ پولیس میرے گھر آئی تھی۔ یہ آدمی یہاں کیا کر رہا ہے؟ وہ میرے گھر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر میں نے اسے واپس مڑتے ہوئے دیکھا۔ ایک لمحہ کے اندر وہ غائب تھا۔ ممکن ہے درختوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے وہ کہیں اور چلا گیا ہو۔

سخت ترین قانون اور نئے نئے حکم ناموں نے عام آدمی کی زندگی کو دشوار بنا دیا تھا۔ دوسرے دن میں صبح ہی صبح اٹھ گیا۔ فریش ہو کر اور ناشتہ کرنے کے بعد میں گھر سے نکل پڑا۔ ذرا دور چلنے پر سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی سڑک اس دیوار سے مل جاتی تھی، جس پر بڑے بڑے پوسٹر لگے رہتے تھے۔ مجھے پوسٹروں میں جادوگر کی تصویر نظر آ رہی تھی۔ کچھ لوگ خاموش کھڑے پوسٹر کو دیکھ رہے تھے۔ دھوپ کی تپش بڑھ چکی تھی۔ مجھے پھر وہ آدمی نظر آیا جو کل مجھے اپنی کھڑکی سے دکھائی دیا تھا۔ اس کے کندھے پر ایک بیگ تھا اور ہاتھ میں کچھ کاغذات تھے۔ اس کے سر کے بال گھنے تھے اور ان میں سفیدی آ چکی تھے۔ اس کی آستین کا ایک حصہ پھٹا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ رُک گیا۔ بولا۔

'بہت تھک گیا ہوں۔'
'لیکن تم تھے کہاں۔؟'
'قبرستان میں۔'
'وہاں کیا کر رہے تھے۔'
'مردوں سے زندگی جینا سیکھ رہا تھا۔' اس نے قہقہہ لگایا۔
'پولیس تمہاری تلاش میں ہے۔'

'اب نہیں ہے۔' وہ مسکرایا۔ 'یہ دیکھو۔ ریڈ بک۔ میں فارم بھر رہا ہوں۔'

'فارم....؟'

اس نے پھر قہقہہ لگایا 'موت کے دستاویز۔ آخر کب تک جیو گے۔ مارکیٹ میں پیسہ نہیں۔ گھروں میں زندگی نہیں۔ دکانوں میں راشن نہیں۔ مرنا ہے تو ایک بار میں مر جاؤ۔ فارم پر دستخط کرواور بتاؤ کہ کب مرنا چاہتے ہو۔ گھسٹ گھسٹ کر زندگی جینے سے بہتر ہے کہ خود ہی اپنی موت کے دن کا انتخاب کر لو۔'

'تم پاگل ہو گئے ہو۔'

'یہ نیا حکم نامہ ہے۔ تم لوگوں کے لیے۔ میں تو اپنا کام کر رہا ہوں۔'

'کتنے فارم بھرے جا چکے ہے؟'

'تقریباً تین ہزار۔ اچھا سنو' اس آدمی نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پھسپھساہٹ بھرے لہجے میں کہا۔ 'کوئی بھی جینا نہیں چاہتا۔ سب مرنے کے لیے تیار ہیں۔ کیوں اپنی زندگی ضائع کر رہے ہو۔ ویسے بہت جلد ہی مشن والے فارم لے کر تمہارے گھر آنے والے ہیں۔'

'موت کا فارم؟'

وہ ہنسا۔ 'خوشگوار زندگی کے لیے، جہاں تمہارے پاس سوچنے، فکر کرنے کے لیے کچھ نہیں ہوگا۔ تم سب باہر نکل آؤ گے۔ اب جاؤ۔ مجھے اپنا کام کرنے دو۔ ابھی بہت سے لوگوں سے فارم بھروانے ہیں۔'

خفیہ افسر سے ملاقات ہوئی تو اس نے ہنستے ہوئے کہا، 'ہم بہت جلد تمہارے گھر آئیں گے۔'

ہائی وے کے قریب ایک بلند دیوار دور تک چلی گئی تھی۔ وہاں اس وقت کافی بھیڑ جمع تھی۔ دیوار پر ایک اسکرین لگا تھا۔ کہا جا رہا تھا کہ وہ بہت جلد اسکرین پر نظر آئے گا۔ یہ بھی بتایا گیا کہ ایسے اسکرین اس وقت مختلف شاہراہوں پر لگے ہیں اور جادوگر کو اس وقت ملک کے تمام حصوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مجمع پُر جوش نظر آ رہا تھا۔ مجھے یاد آیا، خفیہ افسر نے میرے گھر پر سنگھاردان کے پیچھے کسی کو دیکھتے ہوئے سیلوٹ کیا تھا۔ جب نمائش گاہ میں خون کے فوارے ابل پڑے تھے۔ اس وقت کچھ ہی لوگ تھے جو مخالفت میں نعرے لگا رہے تھے۔ بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ اس وقت آسمان مجھے سرخ نظر آیا۔ ٹریفک رُک گیا تھا۔ اور ایک بار پھر گایوں کا جھنڈ ہائی وے کی طرف بڑھتا نظر آ رہا تھا۔ ان کے پیچھے ڈھول، مجیرے، بجاتے ہوئے سادھو تھے۔ جو گایوں کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ درمیان میں شنکھ کی آواز گونج رہی تھی۔ ایک عجیب سی بو تھی، جو اس وقت ماحول میں رچی بسی تھی۔ بھیڑ میں کچھ لوگوں نے پرارتھنا شروع کر دی تھی۔ کچھ بھجن گا رہے تھے۔ سب کی نظر اسکرین پر تھی۔ وہ کچھ ہی دیر میں اسکرین پر اپنا نیا جادو دکھانے والا تھا۔ مجھے اس بھیڑ سے کوفت ہو رہی تھی۔ گھٹن کا احساس ہو رہا تھا، مگر میں اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ بھیڑ میں سے ایک آدمی بتا رہا تھا کہ اس نے پارلیمنٹ ہاؤس اور عدالتوں کے مینار پر زعفرانی پرچم کو لہراتے دیکھا ہے۔

میں نے اَتل دا کو فون کیا۔ انہوں نے بتایا کہ اس وقت تمام ٹی وی چینلز پر اس کے آنے کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ اور وہ بھی اس وقت ٹی وی پر نظریں گڑائے بیٹھے ہیں۔ مجھے احساس تھا کہ ملک اس وقت بھی دو حصوں میں تقسیم ہے۔ ایک بہت بڑا طبقہ جادوگر کے جشن میں

ڈوبا ہے اور ایک چھوٹا سا طبقہ جو خوفزدہ بھی ہے اور جو مسلسل موت کی آہٹیں سن رہا ہے۔ مجھے سبحان علی کی یاد آ رہی تھی۔ ایک برس قبل کی بات ہوگی۔ ملک میں مسلسل ہونے والے حادثات سے وہ خاصا زخمی تھا۔ اس نے نسل کشی کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ۱۹۴۴ کے بعد یہ اصطلاح وجود میں آئی۔ پھر نسل کشی عام ہوگئی۔ اس کا مقصد کسی مخصوص مذہب، کسی گروہ، کسی گروپ کے وجود کو ختم کرنا ہوتا ہے۔ ۱۹۴۸ میں انسانی حقوق کا عالمی منشور سامنے آیا جس میں کہا گیا کہ انسانی حقوق کا تعلق انفرادی لوگوں کے حقوق سے ہے۔ یہ انفرادی لوگ کم از کم ہم تو نہیں ہو سکتے۔ چنار کے درختوں کے سایے میں بھی یہ تاریخ دہرائی جائے گی اور اب......، سبحان علی نے یہ بھی کہا تھا۔ ہم بدترین انجام کی طرف بڑھ چکے ہیں۔

شارع عام پر ہلچل مچ گئی۔ اسکرین روشن تھا۔ اچانک روشنیوں کے درمیان جادوگر کا چہرہ چمکا۔ اس کے سر پر اس وقت بھی ہیٹ تھا، ہلکی ہلکی داڑھی تھی اور اس نے قیمتی سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑے۔ دوبارہ ہاتھ جوڑے تو اس کے ہاتھ میں کتے کا ایک پلا تھا۔ اب اس کی آواز گونج رہی تھی۔

' ہم گاڑیوں میں جاتے ہیں تو اکثر ہماری گاڑیوں کے نیچے کتے کے پلّے آ جاتے ہیں۔ یہ پلہ بیمار ہے۔ اگر ہم اس پلے کی مدد کرنا چاہیں تو کس طرح کر سکتے ہیں۔؟ بہت آسان ہے۔ یہ دیکھیے۔ اس نے آنکھیں بند کیں۔ کچھ منتر پڑھے اور پلے کو زمین پر ڈال دیا۔

' آسان موت۔ اب یہ مر چکا ہے۔ اب اس کو تکلیف نہیں ہے۔ اب یہ کسی بیماری کا شکار نہیں ہے۔ بیمار یا زخمی انسان یا جانور ہو، اس کی تکلیف کو ختم کرنا ہی انسانیت ہے۔ ہم نے یہی کیا اور ہم یہی کرنے جا رہے ہیں'

بھیڑ نے زور زور سے تالیاں بجا کر جادوگر کا استقبال کیا۔ آسمان پر سرخ بدلیاں چھائی تھیں۔ اور آسمان کا رنگ بھی اس وقت سرخ تھا۔ گایوں اور سادھوؤں کا قافلہ گزر چکا تھا۔ ٹریفک کی آمد و رفت روک دی گئی تھی۔

جادوگر مسکرایا اور بولنا شروع کیا۔' مہربان قتل۔ آپ بیماری کا بوجھ کیوں اٹھاتے ہیں؟ مرنے کے عمل کو ضرورت سے زیادہ لمبا کیوں دیکھنا چاہتے ہیں؟ ہم رحم دل انسان کی طرح عزت و وقار کی موت کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہم بیماروں کو شفا دیتے ہیں۔ خوفزدہ انسانوں کو خوف سے بری کر دیتے ہیں۔ ۲۰۱۵ میں فرانسیسی پارلیمنٹ میں بیمار مریضوں کو آسان موت مرنے کے بل پر مہر لگا دی گئی۔ جن کا مرض لاعلاج ہے، قانون کے ذریعہ وہ اپنے لیے آسان موت کے ذریعہ کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ موت بھگوان، رب، اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا ذریعہ ہے۔ بس ہم ایک چیز کھو دیتے ہیں سانسیں اور ایک لمحہ کے اندر رب کے پاس ہوتے ہیں'

بھیڑ تالیاں بجا رہی تھی۔

جادوگر وقفہ کے لیے رُکا۔ اس نے پھر بولنا شروع کیا۔

' اٹھارہویں صدی میں اچھی موت کے لیے یونانی زبان کا ایک لفظ سامنے آیا۔ یوتھنیسیا (Euthanasia)۔ قدیم روم اور یونان میں یہ طریقہ موجود تھا کہ ڈاکٹر بیمار مریضوں کو آزاد کر دیتے تھے۔ سقراط نے خدا کے وجود سے انکار کیا تو روم کے شہر ایتھینز میں عدالت نے آسان موت کے فرمان پر دستخط کر دیے اور اسے وِش کا پیالہ پینا پڑا۔ کتنی آسان موت۔ نیدر لینڈ، بلجیم، لگزمبرگ، سوئزرلینڈ، ایسٹونیا، البانیہ، امریکہ، کناڈا آسان موت کو قانونی حیثیت حاصل ہے۔ ہمارے مخصوص طبقے کے بچے بھی بیمار ہیں۔ بلجیم، ہالینڈ اور برطانیہ میں کچھ شرائط کے ساتھ چائلڈ یوتھنیسیا کو قانونی قرار دیا ہے۔ یہ سب ہمارے بچے ہیں۔ نوجوان بچے.....جو بیمار ہیں... خوفزدہ ہیں، جو ہمیں بھی بیمار کر سکتے ہیں.... مہاتما بدھ کی تعلیمات میں ایسے مریضوں کے لیے رحم دل بننے کے لیے کہا گیا ہے۔ آسان موت کے لیے وہاں رحم دلی کا جواز ملتا ہے۔ تکلیف میں مبتلا افراد کو زندگی سے آزاد کر دیا جائے۔ مقدس وید میں صاف طور پر کہا گیا،

انسان کے دو ہی دوست ہیں پہلا علم، دوسرا موت۔ جاپان کا سب سے بڑا مذہب شنتو ہے۔ یہاں کہا گیا ہے کہ زندگی کو بے مقصد طول دینا شرمناک ہے۔ اس سے موت بہتر ہے۔'

لوگ ابھی بھی تالیاں بجا رہے تھے۔ جادوگر کا نام لے کر چیخ رہے تھے....

کچھ عورتیں آرتی اتار رہی تھیں، مرد پوجا وندنا کر رہے تھے۔ ٹریفک ابھی بھی کھلا نہیں تھا۔ جادوگر کے چہرے پر سکون کی مسکراہٹ تھی، اس کی آواز میں سحر تھا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔ مجمع اس طرح سن رہا تھا جیسے اس کے الفاظ خدائی الفاظ ہوں۔ جادوگر نے اس بار ہاتھ کا اشارہ کیا اور پھر بولنا شروع کیا۔

' موت، جو زندگی سے خوبصورت ہے لیکن کچھ لوگ موت سے گھبراتے ہیں۔ جنہیں موت خوبصورت لگتی ہے، وہ موت کو گلے لگا لیتے ہیں.... ایک موب آتا ہے۔ مقدس موب۔ خدا کی طرف سے بھیجا گیا۔ وہ ترشول لہراتا ہے اور موت..... آسان موت..... ماچس، ماچس کی ایک ذرا سی تیلی۔ اور گھر سلگنے لگتا ہے۔ آسان موت.... بیماری، دکھ، تکلیف، سب سے نجات۔ پیسوں کی، دولت کی ضرورت ختم۔ الجھنیں ختم۔ ایک نئی دنیا کا انتظار اور موت اس راستے کو آسان بنا دیتی ہے۔ میں نے ہالینڈ میں ایک کلینک کے بارے میں سنا جہاں موت کی درخواست دینے والوں کی مدد کی جاتی ہے۔ ناقابل علاج نسل کو موت کے انجکشن دیے جاتے ہیں۔ یہ اسلحے، یہ بارود، یہ میزائلیں، ہم کس دنیا کی طرف جا رہے ہیں اور یہ کیسی ترقی ہے کہ ہم آسان موت بھی نہیں خرید سکتے۔ سائنس کی سب سے اہم دریافت ہے موت۔ سوچیے کہ زندگی خوبصورت کیسے ہوگی....'

جادوگر ٹھہرا، مسکرایا۔ 'اتنی بڑی آبادی۔ کیا سب کو بجلی مل سکتی ہے، پانی مل سکتا ہے؟ روزگار مل سکتا ہے؟ اتنے بینک نہیں ہیں ہمارے پاس۔ روپے کی قیمت گرتی چلی گئی۔ ہمارے کچھ مسیحا تھے۔ بڑے بینکر۔ کچھ انڈسٹریلسٹ، جو آپ کو روزگار دے رہے تھے اور آرام سے، مہذب طریقے سے انہیں بینک سے اربوں روپے کی ضرورت تھی۔ اس سے پہلے کہ ان پر مصیبتیں نازل ہوں، ہم نے ایسے فرشتوں کو باہر بھیج دیا۔ نئی نسل کو زندگی دی کہ وہ محنت اور مشقت سے بچ سکیں۔ روزگار کرنے سے کیا ملے گا۔ روزگار تو دھرم میں ہے۔ گائے چرائیں۔ گائے پوجیں۔ سادھو سنت بن جائیں۔ سائنس ہماری قدیم کتابیں، ہمارے گرنتھ کی نقل ہی تو ہے۔ دولت ہمیشہ آپ کو لڑاتی ہے۔ میں نے دولت کچھ مخصوص لوگوں کے حوالے کر دی کہ جنگ نہ ہو.....اور آپ میں سے زیادہ تر لوگ اپنے گھروں میں آرام سے جی سکیں۔'

جادوگر مسکرایا۔ اس نے بولنا جاری رکھا۔ 'اس دنیا میں کیا رکھا ہے بھائی اور بہنو....! بلڈ پریشر، شوگر، ایڈس، کینسر، دنیا بھر کی بیماریاں۔ اور یہ بیماریاں مخصوص طبقہ اور مخصوص گروہ کی طرف سے ہم پر بھیجی جا رہی ہیں۔ ملک کی بڑھتی آبادی اور ملک کی خوشحالی کے پیش نظر ہمیں مخصوص طبقے اور گروہ کے لیے محبت بھری موت کے سرٹیفکیٹ جاری کرنے پڑے.... جاؤ اپنے رب سے ملنے۔ جاؤ نجات کی طرف.... جاؤ سیاہ پتھروں کی طرف..... جاؤ آہنی دروازے کی طرف.... اور تمہیں اختیار ہے کہ تم کیسی موت چاہتے ہو..... ہم رحمدل ہیں۔ ہم کوئی فیصلہ نہیں کریں گے۔ فیصلہ آپ کا ہوگا۔'

' رحم دل جادوگر زندہ باد—' کچھ لوگوں نے جوش میں نعرے لگائے۔

' جادوگر زندہ باد—'

ان نعروں سے آسمان گونج اٹھا۔ جادوگر کے چہرے پر فخریہ مسکراہٹ تھی۔ اس نے پھر آہستہ آہستہ بولنا شروع کیا۔

' میں نے ایک عالم سے سن رکھا تھا کہ گناہ کم کرو۔ موت آسان ہوگی۔ میں نے گناہ کے راستے کا پتھر ہی ہٹا دیا۔ زندگی ہے تو

گناہ ہے۔ اور موت زندگی سے نجات کا دوسرا نام۔ ایک دنیا نے زندگی کو آسان بنانے کے لیے نیوکلیئر بم بنا دیے۔ خلا میں بھی اس کے تجربے کیے جا چکے ہیں۔ پہلے نیوکلیئر ٹسٹ کو پرائم اسٹارفش کا نام دیا گیا۔ بڑے بڑے طوفانوں کو جوہری بموں سے روکا جا سکتا ہے اور اس وقت ہماری آبادی ایک بڑے طوفان کی زد میں ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی اور اکثریتی طبقے کی خوشحالی۔ بیمار لوگوں کو مرنا ہوگا۔ اس پورے نظام کی خوشحالی ان کی موت پر منحصر ہے۔ ملک اتنی بڑی آبادی کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتا.....'

جادوگر مسکرایا۔ 'خوشحالی کے لیے، زرخیزی کے لیے، پھولوں اور تتلیوں کے لیے، باغ اور دریاؤں کے لیے، سمندر کی طغیانی کے لیے، خوشگوار تیز ہواؤں کے لیے، خوشبو کے لیے، نیلے آسمان کے لیے اور آندھیوں سے نجات کے لیے اور اپنے دل کے ٹکروں کے لیے ہم نے بہت سوچ کر حسین موت کا انتخاب کیا۔ آپ سواگت کیجیے، اور ذرا تصور کیجیے، اس دنیا کا جہاں کوئی بیمار اور مریض نہیں ہوگا۔ خوشحال اکھنڈ بھارت کے لیے.....جے ہند.....

جادوگر نے ہاتھ جوڑے اور اسکرین سے اس کی تصویر ہٹ گئی۔ بھجن کی آواز تیز ہوگئی تھی۔ مجمع ابھی بھی جادوگر کا نام لے کر زور زور سے چیخ رہا تھا۔ سرخ بدلیاں ابھی بھی آسمان پر چھائی تھیں۔ میں اس لمحے کا گواہ تھا۔ میں دم بخود اور سکتے کی حالت میں تھا۔ گھر کی طرف لوٹتے ہوئے میں نے دوبارہ اس پُراسرار آدمی کو دیکھا۔ اسے گھیرے ہوئے کئی لوگ کھڑے تھے۔ ان کے سر پر ٹوپیاں تھیں اور ان کے چہرے مجسمہ کی طرح خاموش تھے۔ یہ فارم پُر کر رہے تھے۔ میں کچھ دیر کے لیے وہاں رُکا پھر تیز تیز گھر کی طرف بڑھ گیا۔

(۱۴)

گدھوں کی آنکھیں کھلیں تو مختلف درختوں کی شاخوں پر ان کا بسیرا ہو چکا تھا۔ مردار کی بو انہیں ان درختوں تک کھینچ لائی تھیں۔ کچھ لاشیں تھیں جو ان درختوں سے لٹک رہی تھیں۔ ان میں ہر طرح کے گدھ تھے۔ جانوروں کی لاشوں پر سب سے پہلے سفید پشت والے گدھ اترتے ہیں۔ یہ گدھ بے رحمی سے جانور اور انسانوں کی لاش پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ سیاہ گدھوں کا معدہ سب سے مضبوط ہوتا ہے۔ ان کے معدوں میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ ہڈیوں تک کو پگھلا سکتی ہیں۔ بہت دور تک نظر رکھنے والے گدھ اپنے شکار کو آسانی سے تلاش کر لیتے ہیں۔ ان میں سفید پشت والے گدھ بھی تھے جو اب ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ لاش دیکھ کر گدھ اسی طرح خوش ہوتے ہیں، جیسی خوشی اس دن جادوگر کے چہرے پر نظر آ رہی تھی۔ مردہ جسموں کی تلاش کرنے والے گدھ شکار سے دور بھاگتے ہیں اور دوسرے شکاری جانوروں کے بچے کھچے گوشت پر گزارہ کرتے ہیں۔ برفانی علاقوں میں گدھ اور بھیڑیے دونوں ایک دوسرے کے جانی دشمن ہوتے ہیں اور اس بات کا انتظار کرتے ہیں کہ خدا ان کے لیے رزق کب بھیجتا ہے۔ ایک ایسا بھی لمحہ تھا جب آسمان اچانک سفید اور سیاہ گدھوں سے ڈھک گیا۔ چاروں طرف بڑے بڑے گدھ اڑتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

بڑے سائز کی آہنی وین سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔ یہ وین جہاں رُکتی، وہاں گھروں سے نکل نکل ٹوپیوں والے خاموشی سے وین میں بیٹھ جاتے۔ یہ سب کام بہت سکون اور خاموشی سے انجام دیا جا رہا تھا۔

کتنے آدمی ہیں؟

کل پندرہ.....

ابھی کتنی وین خالی ہیں

دس وین....

آگے کچھ لوگ اور ملیں گے....

خفیہ افسران سرخ فارم پر ایک نظر ڈالتے پھر دھواں چھوڑتی ہوئی وین کو لے کر آگے بڑھ جاتے۔

تمام سیاسی پارٹیوں اور جماعتوں پر جادوگر کے اعلان کا کوئی اثر نہیں تھا۔ مجھے اس بات کا یقین تھا کہ کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے احتجاج ضرور ہوگا۔ کامریڈ اتل نے میری بات پوری سنجیدگی سے سنی۔ پھر کہا۔

' آپ چاہتے ہیں، میں شاستری بن جاؤں۔ آپ نے دیکھ لیا کہ ان کے ساتھ کیا ہوا؟' کامریڈ اتل کا لہجہ کمزور تھا۔ اکثریتی طبقہ ہمارا ابھی ووٹ بینک ہے۔ ہم اس ووٹ بینک سے محروم نہیں ہو سکتے۔'

' خونی منقار والے گدھ، لاشیں، آہنی وین اور موت کا فرمان....' میں کہتے کہتے رُک گیا۔

' یہ کس ملک میں نہیں ہو رہا۔ اس وقت یہ کھیل ساری دنیا میں ہو رہا ہے۔ ہم اس معاملے کو نہیں اٹھا سکتے۔'

' کیا کوئی مسئلہ اس سے زیادہ سنگین ہو سکتا ہے؟'

' دیکھیے، مستقبل میں ہم سے یہی غلطیاں ہوئیں کہ ہم مارکس کے قدیم اصولوں پر چلتے رہے اور یہ بھول گئے کہ دنیا بدل چکی ہے۔ معیشت بدل چکی ہے۔ زندگی کے طور طریقے اور انداز میں زبردست تبدیلی آئی ہے۔ ہم نے یہ باتیں قبول نہیں کیں اور نتیجہ کیا ہوا، ہم مغربی بنگال، تریپورہ، کیرالہ ہر جگہ حاشیے پر دھکیل دیے گئے۔ ہمیں آپ سے ہمدردی ہے مگر اس وقت اس سچ کو قبول کرنا ہوگا کہ ملک کی خوشحالی ہماری پہلی ضرورت ہے۔'

' ......اور یہ خوشحالی کچھ لوگوں کو ہلاک کر کے حاصل ہوگی۔'

' خوشحالی کے لیے اور معیشت کی تیز رفتاری کے لیے آبادی پر کنٹرول بھی ضروری ہے۔'

' لیکن صرف ہمیں کیوں؟'

کامریڈ اتل کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئے۔ پھر بولے۔

' آپ کہاں؟ بیمار اور کمزور لوگ۔ جو بیمار ہیں وہ یقیناً مارے جائیں گے'

' آسان موت؟'

' ہاں۔ آسان موت۔ اسلام نے تو یہی سکھایا ہے کہ موت سے گھبرانا نہیں چاہیے۔'

' اسلام نے ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کے لیے بھی کہا ہے۔'

کامریڈ اتل ہنسے۔ انتظامیہ سے کون لڑے گا؟ آپ؟ مردہ ہو کر بی مشن کی آہنی وین میں خاموشی سے بیٹھنے والے....؟'

' اتنی بڑی آبادی....؟ میں کہتے کہتے ٹھہر گیا۔ میں غور سے کامریڈ اتل کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ چہرہ مجھے ایک انجان اور اجنبی آدمی کا چہرہ معلوم ہو رہا تھا، جسے میں نہیں جانتا تھا۔

کامریڈ ہنسے...'اتنی بڑی آبادی؟ یہ بھی آپ کی بھول ہے۔ آپ نے دیکھا، بہت تیزی سے آپ کی آبادی سمٹ رہی ہے۔ پھر آپ اس سرزمین پر رہ بھی جائیں گے تو اتنے کمزور ہوں گے کہ سر اٹھانے کے لائق نہیں ہوں گے۔'

' یہ آپ کہہ رہے ہیں۔'

' ہمیں وقت کے ساتھ اپنے سوچنے کا نظریہ بدلنا ہوگا۔'

مجھے جادوگر کی ایک پرانی بات یاد آرہی تھی۔تمام سیاسی پارٹیاں ہمارے ہی مشن کا حصہ ہیں۔اب کا مریڈ اتل سے یہ کہنے کا وقت نہیں تھا کہ آپ میں اور بی مشن میں کیا فرق ہے۔ میں تیزی سے پارٹی آفس سے باہر نکل آیا۔گدھ آسمان میں اڑ رہے تھے۔سڑک پر ٹریفک روزمرّہ کی طرح تھا۔دنیا کے دستور میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔سڑک پر تیز رفتاری سے گاڑیاں دوڑ رہی تھیں۔آس پاس کی تمام دیواروں پر جادوگر کے پوسٹر چسپاں تھے۔یہ خیال مجھے پریشان کر رہا تھا کہ کیا حقیقت میں ہم زندہ ہیں؟ ہمارے مسائل اٹھانے والے زندہ ہیں؟۔ہمارے سچ کو سامنے رکھنے والے زندہ ہیں؟

گدھ آسمان میں اڑ رہے تھے۔

اس وقت گدھ تمام درخت کی شاخوں پر موجود تھے اور اپنے شکار کا انتظار کر رہے تھے۔

گھر کی طرف بڑھتے ہوئے خفیہ افسر اچانک میرے سامنے آ گیا۔

' آپ نے فرمان سن لیا ہوگا۔'

' ہاں۔'

وہ مسکرایا۔' پھر آپ نے کیا سوچا؟'

' کیا کچھ سوچنے کے لیے رہ گیا ہے۔؟'

' ہاں۔ہم اس کا موقع دیں گے آپ کو۔اور کل ہم آپ کے گھر آئیں گے۔'

اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔اس وقت مجھے کچھ بھی ہوش نہیں تھا۔میں بیمار تھا اور مجھے چکّر آ رہے تھے۔

(۱۵)

'.......اور اگر تم میرے حکم نامے پر نہیں چلے اور عمل نہیں کیا تو تم پر سرخ کتاب کا عذاب بھیجا جائے گا۔اگر تمہاری روحوں کو میرے فیصلوں سے نفرت ہوگی تو تمہاری روحیں آگ میں جلیں گی اور تم میں دشمنوں سے مقابلے کی ہمت نہیں ہوگی۔کچھ آوازیں تھیں جو میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ بڑی بڑی گاڑیاں اور آہنی وین سڑکوں پر دوڑ رہے تھے۔کچھ آہٹیں تھیں، جو میرے دروازے تک آ کر خاموش ہو جاتی تھیں۔پیپل اور جامن کے درختوں پر سناٹا تھا۔

یہ صبح عام صبحوں جیسی نہیں تھی یہ صبح سرخ کتاب کا تحفہ لے کر آئی تھی۔سرخ کتاب، جس کے ہر صفحے پر موت لکھی تھی۔جس کا خالق جادوگر تھا۔اور پرسنشا کرو میری کہ میں نے تمہاری زندگی پر موت کو آسان بنا دیا اور جو میرے مخالف ہیں، میں ان کے لیے بھی موت کے راستے کو آسان کر دوں گا اور تم جاؤ گے اس انوکھی دنیا کی سمت اپنے رب سے ملنے، تم جس کی تسبیح کیا کرتے تھے۔ مجھے وہ مزدوروں کی قطار یاد تھی جنہیں حاکم وقت کے فیصلے کے بعد سیاہ کوٹھریوں میں بھیج دیا گیا تھا۔زار کے زمانے میں مخالفت کرنے والے سائبیریا میں برف کی وادیوں میں دفن ہو جاتے تھے اور جنہیں حضرت نوحؑ کی کشتی میں جگہ نہیں ملی، انہیں پانیوں کا طوفان اپنے ساتھ بہا لے گیا۔وہ آنے والے ہیں اور وہ کسی وقت بھی پہنچ سکتے ہیں۔

میں نے دیکھا، ایک گدھ میری کھڑکی پر بیٹھا تھا اور اس کے پنکھ نہیں تھے۔اس کی آنکھیں میری طرف دیکھ رہی تھیں۔اسی عالم میں، میں نے سارہ کی طرف دیکھا جو دروازے تک آ کر ٹھہر گئی تھی اور میری طرف ان نگاہوں سے ایسے دیکھ رہی تھی جیسے میرے جسم میں

جان نہیں بچی ہو اور میری روح پرواز کرنے والی ہو۔ میرے گلے سے گھڑگھڑانے کی آواز نکلی۔ میں نے سارہ سے پوچھا۔

' تم جانتی ہو نا، وہ آنے والے ہیں؟'

' ہاں۔ وہ کبھی بھی آسکتے ہیں۔'

' شکر کہ تم جانتی ہو۔'

' مگر ہم کر بھی کیا سکتے ہیں؟'

' ہاں۔ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ ہم دیوار میں ایک میخ نہیں ٹھوک سکتے۔ ہم دریا پر پل نہیں بنا سکتے۔ ہم خود کو گھر میں مقید نہیں کر سکتے۔ ہم فرار نہیں ہو سکتے۔'

سارہ نے پھر میری طرف دیکھا۔ اس بار وہ خاموش رہی۔

' کیا ان کا آنا کوئی معمولی قصہ ہے....'

' بالکل بھی نہیں۔'

' تو تمہیں احساس ہے کہ یہ معمولی قصہ نہیں۔'

' بے شک۔'

' اور اس کے باوجود تمہارے چہرے پر کوئی شکن نہیں۔'

سارہ اس بار مسکرائی۔' کیونکہ کرنے والا اللہ ہے۔ میرا اس پر بھروسہ ہے....'

' کرنے والا اللہ....' میں نے چونک کر سارہ کو دیکھا۔ تو کیا جو کچھ ہو رہا ہے، اللہ کی مرضی سے ہو رہا ہے۔'

' اس میں کیا شک ہے۔'

' یعنی سرخ چیونٹیاں.... موت کا فرمان..... یہ سب اللہ کے حکم سے ہے۔'

' یقیناً اس میں کوئی شک نہیں۔'

' یعنی تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔'

' اللہ کا شکر واجب ہے، وہ جس حال میں رکھے۔'

' چاہے، ہمیں تباہیوں کے دروازے پر پہنچا دے۔'

اس بار سارہ خاموش رہی۔ اس کی نگاہیں بار بار میری آنکھوں سے اتر کر میرے جسم کا جائزہ لے رہی تھیں۔

' ابھی کھڑکی پر ایک گدھ بیٹھا تھا۔'

' اسے بھی رزق اللہ دیتا ہے۔'

' اللہ دیتا ہے....' زور کی کھانسی اٹھتی ہے۔ میں دیر تک کھانستا ہوں۔ پھر بستر پر بیٹھ جاتا ہوں۔ البیر کامو کے ناول پلیگ کا کردار ڈاکٹر ریو اس وقت میرے سامنے تھا جو ایک نومولود بچے کو مرتا ہوا دیکھ کر خدا سے سوال کرتا ہے کہ اس کا قصور تو بتا دو۔

میری آنکھوں میں اندھیرا جمع ہو رہا ہے۔ دروازے کے باہر چرمراتی گاڑیوں کے پہیوں کی آوازوں کے ساتھ ہارن کی آواز سن کر چونکتا ہوں۔

' لگتا ہے وہ آ گئے۔'

'کوئی نہیں آیا۔گاڑیاں گزر رہی ہیں۔'

'یقیناً یہ فوجی گاڑیاں ہوں گی۔'

'ان کے ساتھ بڑے بڑے ٹرک بھی ہوں گے۔'

'ہاں،ٹرک بھی ہیں۔'

میں کمرے میں ٹہل رہا تھا۔

'اللہ ہمارے لیے موت کا انتخاب کیوں کر رہا ہے۔؟'

'اللہ کسی ایک کے لیے موت کا انتخاب نہیں کرتا۔'

'مگر ان دنوں....اس وقت....'میں کہتے کہتے ٹھہر گیا۔' پاشا کہاں ہے؟'

'وہ کالج گیا ہے۔'

'اس وقت....کیا اسے معلوم نہیں کہ کیا ہونے والا ہے۔'

'میں پاشا کو ان باتوں سے دور رکھتی ہوں۔'

'اچھا کرتی ہو۔ پاشا کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔مگر...' مجھے خیال آیا،شاستری نے بھی مرنے سے قبل یہی لکھا تھا،وہ آچکے ہیں۔ جادوگر نے مسکراتے ہوئے آسان موت کی ادائیگی کی تھی۔

'سرخ کتاب...'میں اچانک چونکتا ہوں۔یہ کتاب میرے بیڈروم میں کیسے آئی۔'

'یہ تم ہی لائے تھے۔'

'میں۔'

ہاں تم۔کیا یہ کمیونسٹوں کا نیا مینی فیسٹو ہے؟۔'

'آہ،کمیونزم۔'

سارہ نے چونک کر میری طرف دیکھا۔'پھر اس کتاب میں کیا ہے؟'

'آئین اور دستور کی نئی کتاب۔ہمیں اس کتاب میں خارج کیا جا چکا ہے۔ٹھہرو،میں آتا ہوں۔'

سارہ زور سے چلائی۔'تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔کہاں جا رہے ہو۔'

'میں باہر سے آتا ہوں۔شاید مجھے تازہ ہوا کی ضرورت ہے۔'

◆◆

ہائی وے کے دائیں طرف دور تک جنگل ہی جنگل تھا۔اس جنگل کے قریب ہی ایک قبرستان تھا۔قبرستان کے قریب کچھ پولیس گاڑیاں کھڑی تھیں۔میں نے شہر خموشاں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو وہاں پچاس سے زیادہ گورکن قبریں کھودنے میں مصروف تھے۔ قبرستان کے قریب سے ایک ساتھ بہت سارے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ابھی صبح کے 9 بجے ہوں گے۔اتنی صبح صبح میں نے کتوں کو کم ہی بھونکتے ہوئے دیکھا ہے۔اس وقت بھی آسمان گدھوں سے بھرا پڑا تھا۔ بڑے بڑے ٹرک ہائی وے سے گزر رہے تھے۔ان سب کے باوجود مجھے گہرے سناٹے کا احساس ہوا۔اس سے پہلے کہ میں واپسی کے لیے مڑتا،وہ آدمی اچانک میرے

سامنے آ گیا۔ اس وقت بھی اس کے چہرے پر ہلکی سی داڑھی تھی۔ اس آدمی کے ہاتھ میں کل میں نے موت کا فارم دیکھا تھا۔ آج بھی ایک بیگ اس کے کندھے سے جھول رہا تھا۔

اس نے قہقہہ لگایا۔ تم کہیں نہیں ہو.....

' ہاں۔'

' سماج سے سیاست اور آئین تک۔'

' ہاں۔'

وہ زور سے ہنسا۔ ' تم قبرستان میں ہو.....وہ دیکھو۔ بڑی تعداد میں قبریں کھودی جا رہی ہیں۔' وہ زور سے ہنسا۔ ' چاہو تو اپنے لیے بھی تھوڑی سی جگہ چن لو۔'

اس سے آگے ایک پارک تھا۔ اس وقت پارک میں سناٹا تھا۔ میں کچھ دیر بنچ پر بیٹھ کر تازہ ہوا کھانا چاہتا تھا۔ پارک میں جادوگر کا ایک بڑا سا پوسٹر لگا تھا۔ مجھے یقین تھا، پارک میں میرا دم گھٹ جائے گا... میں دوبارہ گھر کی طرف بڑھا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے میرا پیچھا کیا جا رہا ہو۔ میں نے قدموں میں تیزی لائی اور دروازے تک پہنچتے ہوئے ہانپنے لگا۔

سیاہ بادلوں کا کارواں نمودار ہوا اور آسمان اندھیرے میں ڈوب گیا۔ ٹھیک اسی وقت پر پھڑ پھڑاتے گدھوں کی آوازیں سنائی دیں۔ سیڑھیوں پر کچھ قدموں کی آہٹیں تھیں، پھر ایسا لگا جیسے یہ آہٹیں میرے دروازے تک آ کر خاموش ہو گئی ہوں۔ کچھ دیر بعد دستکوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ممکن ہے کال بیل کام نہیں کر رہی ہو، یہ میرا قیاس ہے جبکہ کال بیل صبح تک ٹھیک تھی۔ اس وقت بھی جب صفائی والے نے زور زور سے کال بیل بجائی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا تو سب سے آگے راکیش وید کھڑے تھے۔ ان کے پیچھے خفیہ افسر، ناگارجن، پولیس کا ایک سپاہی، تارا دیش پانڈے اور دو انجان لوگ تھے۔ یہ دھڑ دھڑاتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ مجھے الگ سے دو تین کرسیوں کا انتظام کرنا پڑا۔ کچھ لوگ صوفے پر بیٹھ گئے۔ راکیش وید میرے گھر کا جائزہ لے رہے تھے۔ مجھے یقین ہے، سیاہ بادلوں کا کارواں ابھی رخصت نہیں ہوا ہوگا۔

' آپ بھی بیٹھ جائیے۔ تکلف کی ضرورت نہیں۔' راکیش وید کی آواز ابھری۔

' جی۔' میں نے خاموشی سے کہا۔

' یقین ہے آپ مرنے کے لیے تیار ہو چکے ہوں گے۔' یہ تارا دیش پانڈے تھی۔

' موت ایک نعمت ہے۔ آسان موت، اس سے کہیں بڑی نعمت' ناگارجن بولے۔

خفیہ افسر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ ' ایک دن سب کو مرنا ہے۔ رحمدل جادوگر کا شکریہ ادا کیجیے کہ موت کے لیے اس نے آپ کو مہلت دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ موت ایک جشن ہے۔'

' موت ایک پرندہ ہے۔ ایک خوبصورت احساس۔' تارا دیش پانڈے کی آنکھوں میں چمک تھی... ایک ان دیکھا سیارہ جہاں نور ہی نور، جہاں زندگی کی تمام صعوبتوں سے چھٹکارہ.... جس کا ذائقہ سب سے میٹھا.... عورت کے گداز جسم سے بھی زیادہ۔'

' موت مکتی ہے، موت نجات ہے۔' ان دونوں میں سے ایک آدمی نے کہا جو میرے لیے انجان تھا اور بغور میرے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔'

راکیش وید نے فارم ہوا میں لہرایا.... میری طرف دیکھا۔ سرخ کتاب کی طرح یہ سرخ فارم ہے۔ ملک کی خوشحالی کے لیے، ترقی کے لیے۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا..... رحمتوں اور برکتوں والے جادوگر کے لیے، اس کی درازی عمر کے لیے دعا کیجیے۔ اس کی لافانی محبتوں کا قرض ادا کیجیے۔' راکیش وید نے فارم میز پر رکھا۔ اس نے آپ کی قوم کو دس برس دیے ہیں۔ دس برس میں آپ نہیں ہوں گے۔ اور آپ کو اس کی رحمدلی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ آپ مسلسل پریشان تھے۔ اذیتوں میں گرفتار تھے اور آسان موت.... یہ تحفہ بھی ہے اور دلچسپ تجربہ بھی۔ مرنے کے لیے وقت آپ طے کریں گے۔ اور ہاں، دس برس میں ۴ برس سے لے کر دس برس کا کوٹہ فل ہو چکا ہے۔ آپ کے پاس صرف تین برس ہیں۔'

'تین برس....؟'

'ہاں۔' اس بار تارادیش پانڈے نے میری طرف دیکھا۔ عورتوں سے ہمیں کوئی شکایت نہیں۔ عورتیں تو ہماری وراثت کو آگے بڑھائیں گی۔ عورتیں ہماری پراپرٹی ہیں۔ یہ فارم عورتوں کے لیے نہیں ہے۔ صرف مردوں کے لیے۔'

خفیہ افسر نے میری طرف دیکھا۔' خاص کر نوجوانوں کے لیے۔ یہ انقلابی ہوتے ہیں۔ دہشت گرد ہوتے ہیں۔ ہم سب کو مکتی دینے کے لیے آئے ہیں۔ اس رحمدل جادوگر کا شکریہ ادا کیجیے جو آپ کے بچوں کو بھی مستقبل کے دوزخ سے نجات دینے کے لیے پیدا ہوا ہے۔'

کمرے میں سناٹا تھا۔ مندر سے بھجن کی آوازیں آرہی تھیں۔ باہر سیاہ بادلوں کا کارواں اب بھی موجود تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ آس پاس کہیں سارہ تھی یا نہیں۔ سارہ ان لوگوں کی گفتگو سن رہی تھی یا نہیں۔ میرا چہرہ فق تھا۔ دھندلے سایے تھے جو آنکھوں میں اتر رہے تھے۔ سرخ کتاب.... سرخ فارم.... موت کے وقت کا تعین۔ آسان موت.... میں جانتا تھا، یہ لمحہ ضرور آنے والا ہے۔ باہر سے گھڑگھڑاتے ٹرکوں کی آوازیں بھی گونج رہی تھیں۔ اس وقت ایسے ٹرک پورے ملک میں ہزاروں کی تعداد میں گھوم رہے تھے۔ مگر ایک دنیا خاموش تھی۔ مجھے احساس تھا کہ اس وقت میرے جسم کا قطرہ قطرہ باہر نکل چکا ہے اور میں سرد لاش میں تبدیل ہوں..... اور یہ لوگ لاش کی بولی لگانے آئے ہوں۔

'تم کس فکر میں ڈوب گئے جہانگیر مرزا۔' تارادیش پانڈے نے میری طرف دیکھا۔

میں اچانک زور سے چیخا۔' میرے بیٹے کے لیے دس برس دیجیے۔ اس نے ابھی کچھ بھی نہیں دیکھا ہے۔ اس نے ابھی ابھی تو آنکھیں کھولی ہیں۔'

'افسوس دس برس کا کوٹہ پہلے سے ہی فل ہے۔' راکیش وید نے کہا۔

'نو برس۔'

'یہ بھی نہیں۔'

'آٹھ برس۔'

'سوری۔'

'سات برس....'

'ہم نے کہا نا، یہ سارے کوٹے پہلے سے فل ہیں۔'

'چھ برس....' میں لرز رہا تھا۔

' نہیں ہے۔'

' پانچ برس۔'

' مسٹر جہانگیر مرزا۔ ہمیں افسوس ہے۔'

پھر چار برس تو دیجیے۔ ہم سمجھ لیں گے، ہمارا لخت جگر اتنی ہی عمر لے کر اس دنیا میں آیا ہے۔'

' صرف تین برس۔ اور آپ کے لیے کچھ مہینے۔' خفیہ افسر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ دس برسوں میں اس ملک کو آپ سے خالی کرنا ہے۔ ملک میں خوشحالی آئے گی۔ اور آپ اپنے رب کے پاس ہوں گے۔'

' تین برس...' میں ہکلا رہا تھا۔ یہ بہت کم ہیں۔ مجھے جینے کی کوئی آرزو نہیں۔ مجھے ابھی سنگسار کر دیجیے۔ کوئی سی بھی آسان موت جو آپ چاہتے ہیں مگر میرے بیٹے پر رحم کیجیے۔'

' رحم دل جادوگر رحم ہی تو کر رہا ہے۔'

' میں زور سے چیخا۔ میری بیوی سارہ کہاں جائے گی؟'

' اوہ سارہ' تارادیش پانڈے نے سگریٹ جلا لیا۔' ہم نے کہا نا، عورتوں کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ ہماری پراپرٹی ہیں۔ وہ ہمارے ساتھ رہیں گی۔'

' سارہ نازک ہے، وہ اس دنیا کے اچھے برے کے بارے میں نہیں جانتی۔'

' یہاں کون نازک نہیں جہانگیر۔' تارا محبت سے بولی۔ ملک کی تقسیم کے وقت بھی عورتوں کی ادلا بدلی ہوئی تھی۔ سب طور طریقے نیا ماحول سکھا دیتے ہیں۔ تم کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'

راکیش وید کا لہجہ اس وقت سرد اور سخت تھا۔' ہزار برس۔ غلامی کے ہزار برس۔ تم نے ہمارے آریہ ورت پر قبضہ کر لیا۔ پھر آریہ ورت کے ٹکڑے کر دیے۔ ہم غلاموں کی طرح خاموش رہے۔ تم مٹھی بھر تھے اور ہم پر حکومت کر رہے تھے۔ ظلم سے، زور زبردستی سے، شمشیر سے تم ہم کو اپنے مذہب میں کنورٹ کر رہے تھے۔ ہم خاموشی سے سب کچھ برداشت کر رہے تھے۔ تم ہمیں موت دے رہے تھے۔ ہم نے کچھ کہا؟ نہیں کہا۔ برکتوں والے اور رحمتوں والے جادوگر نے موت کے انتخاب کی ذمہ داری بھی تم کو دی ہے۔ اس کا شکریہ ادا کرو۔'

' ہم نے ایسا کچھ نہیں کیا۔' میری آواز پھنسی پھنسی تھی۔' یہ غلط ہے۔'

' تم نے کیا۔ ہمیں اتہاس سے غائب کیا۔ چاروں طرف اپنے ہونے کی نشانیوں کو آباد کر دیا۔ ہم اپنے ہی ملک میں اجنبی تھے۔ اور اب تمہیں کوئی حق نہیں ہے، یہاں رہنے کا۔ ملک کی خوشحالی کے لیے تمہارا نہیں ہونا ضروری ہے۔ اور ہم تمہیں وقت دے رہے ہیں۔'

' وقت نہیں۔ موت کا فرمان جاری کر رہے ہیں۔ نسل کشی کر رہے ہیں۔'

خفیہ افسر زور سے ہنسا.... کیا ان اموات کے لیے تم تیار تھے جب گائے رکشک تمہاری ہتیائیں کر رہے تھے؟ یا بچہ چوری کا الزام لگا کر تمہیں مارا جا رہا تھا۔؟ یہ مشکل کام تھا۔ ایک کو مارو تب بھی الزام۔ کروڑوں کا صفایا کرو تو کوئی الزام نہیں۔ ہم تمہارے ہی راستے پر چلے....'

' مگر بیٹے کے لیے تین سال....؟ میں قبول کرنے کو تیار نہیں ہوں۔'

' تمہیں قبول کرنے کو کس نے کہا ہے۔ تمہیں بس اس فارم پر دستخط کرنے ہیں۔ اپنی مرضی سے تم نے تین برس کا وقفہ چنا ہے۔'

بس ایک چھوٹا سا دستخط چاہیے، اور کچھ نہیں۔'

' پاشا ابھی گھر پر نہیں ہے۔'

' اس کی ضرورت نہیں ہے۔ باپ ہو۔ اس کی گارنٹی تم لے لو۔'

' بیٹے کے مرنے کی گارنٹی؟'

' آسان موت۔ رحم دل جادوگر کی طرف سے۔ تم غلط سوچ رہے ہو۔'

تارا دیش پانڈے کے لہجے میں ناراضی تھی۔ اُف تم نے بہت وقت ضائع کیا۔ فارم میں یہ بھی لکھا ہے کہ تم کیسی موت چاہتے ہو۔ آسان موت۔ تمہارا گلہ گھونٹ دیا جائے۔ تمہیں گیس چیمبر میں ڈال دیا جائے۔ تمہیں کینسر یا ایڈز کے انجکشن لگا دیے جائیں۔ تمہیں پانی میں غرقاب کر دیا جائے۔ تمہیں سمندر کی لہروں کے حوالے کر دیا جائے۔ تمہیں کسی شارک کے منہ میں ڈال دیا جائے۔ یا تمہیں تمہارے فریج میں بند کر دیا جائے۔ سرد موت..... برف کی آغوش اور آسان موت..... ہمارے پاس آسان موت کے لیے ہر طرح کی مثالیں ہیں۔ تمہیں فارم میں یہ بھی بھرنا ہے کہ تم اپنے اور بیٹے کے لیے کس طرح کی موت چاہتے ہو.... اُف جہانگیر مرزا۔ اب باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔ ہمیں کچھ اور لوگوں سے بھی ملنا ہے۔'

اس وقت باہر سے لگاتار تین بار گولیاں چلنے کی آواز آئی۔ اور کمرے میں اچانک سناٹا چھا گیا۔ میں دھند اور سیاہ بادلوں کے نرغے میں تھا اور ان کہانیوں کو یاد کر رہا تھا جب تقسیم کے بعد ہمارے بہت سے عزیز اور رشتے دار پاکستان چلے گئے تھے۔ ایک ملک کا حادثات سے گزرنا اور نئے سرے سے خود کو کھڑا کرنا بلاشبہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ مگر تقسیم نے اصلی درد کس کو دیا تھا۔ یا سب سے زیادہ زخمی کون ہوا تھا۔ جو پاکستان چلے گئے۔؟ یا وہ ہندوستانی جنہوں نے پاکستان جانا قبول نہیں کیا۔؟ وہ سارے واقعات جو میں نے سنے، اب بھی آسیب کی طرح میرا پیچھا کرتے ہیں۔ میرے والد نے منقسم ہندوستان کو ناقابل شناخت حالات میں دریافت کیا اور وہ اب تک تقسیم کا درد بھلا نہیں سکے۔ انہیں جنگوں کا زمانہ یاد آتا ہے۔ اور وہ کہتے تھے سونے کی سرزمین سے سارہ سونا انگریز لے گئے۔ دونوں ملکوں کے لیے جنگیں چھوڑ گئے۔ جب کانگریس سوشلزم کا راستہ اپنا رہی تھی وہ کہتے تھے سیاست کے لیے علامتیں بے جان ہوتی ہیں اور اب کوئی ہجوم آئے گا جو کانگریس کا صفایا کر دے گا۔ پاکستان کا قیام مسلم لیگ اور مسلمانوں کے لیے فائدہ مند ثابت ہوا یا نہیں لیکن ہندوستانی مسلمان سیاست کی ہڈی بن گئے جن کی طرف ہر سیاسی پارٹی کی نظر تھی۔ حکومت کی خواہشات سے منحرف ہونے والے پہلے بھی سزا یافتہ قیدیوں کی طرح تھے اور اب ملک کی غالب اکثریت ایک نئے جشن کی تیاری کر رہی تھی۔ محبت، بھائی چارہ، اخوت، ملت، سیکولر، جمہوریت جیسے لفظ ہولناک قرار دے دیے گئے۔ دوسری جنگ عظیم سے لے کر آزادی تک اور آزادی کے ۵۰ برسوں میں ملک میں کئی طرح کی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ پہلے وہ بوڑھی مچھلیوں کا شکار کر رہا تھا پھر اس کا چہرہ موت کے عزم مصمم کا آئینہ دار ہو گیا۔ نئی نسل نے اپنے آبا و اجداد سے کچھ نہیں سیکھا۔ وہ اطمینان اور سکون کے اس راستے پر چلے جہاں اب ہلاکت اور دہشت گردی کا بوجھ تھا۔ ۱۷۔۱۸ سال قبل جادوگر کی خفیہ آمد نے پیش گوئی کر دی تھی اور برے موسم کا حال بتا دیا تھا۔ مگر سیاست کی مکڑیوں نے ایک پوری قوم کو سکون کے نشے کا عادی بنا دیا تھا۔ جادوگر ہوا میں کرشمے دکھاتا رہا اور نیند میں چلنے والے، نیند میں چلتے رہے۔ نیند، نہ ختم ہونے والی نیند۔ اور اب موت کا فرمان..... باہر گولیاں چلی تھیں اور اب گولیوں کا چلنا کوئی ایسی بات نہیں تھی، جس کے بارے میں بے چین ہوا جا سکے۔

' کیا سوچنے لگے....' خفیہ افسر میری طرف دیکھ رہا تھا۔

’ کچھ نہیں۔‘

’ تو پھر دیر کس بات کی۔‘ تارا دیش پانڈے نے مسکرا کر کہا۔

دوسرا اجنبی زور سے کھلکھلا کر ہنسا… ’ آپ لوگ تو موت سے نہیں ڈرتے…‘

’ یہ کوئی پہلی بار نہیں ہو رہا ہے۔‘ راکیش وید کی آواز میں سانپ کی پھنکار شامل تھی۔

’ یہ فیصلہ مجھے قبول نہیں۔‘ میری آواز میں لرزش تھی۔

’ تمہارے نہ قبول کرنے سے کیا ہوتا ہے۔‘

’ فیصلہ تو آ چکا ہے۔‘

خفیہ افسر نے مجھے کرسی پر دھکّا دیا۔ میرا سر کرسی کی پشت سے ٹکرایا۔ اب یہ لوگ حملہ آور ہو رہے تھے۔ مگر مجھے ان کے حملوں سے کوئی خوف نہیں تھا۔ میرا بیٹا پاشا مرزا اور محض تین برس۔ میں زور سے چلایا…..

’ آپ مجھے مجبور نہیں کر سکتے۔‘

’ مجبور نہیں کر رہے۔ وقت دے رہے ہیں۔‘ راکیش وید نے سگریٹ سلگا لیا۔ وہ دھواں میرے چہرے کی طرف چھوڑ رہا تھا۔ اب زیادہ سوچنے کا وقت نہیں ہے۔ جلد سائن کرو اور ہمیں اجازت دو….‘

’ تین برس….‘ میری آواز میں گرگراہٹ شامل تھی…. ’ کم از کم دس برس تو کر دیجیے۔ ابھی میرا بیٹا نادان ہے۔ بہت چھوٹا ہے۔….‘

’ سارے کوٹے فل ہیں۔‘ تارا دیش پاڈے کے چہرے پر اب بھی مسکراہٹ تھی۔ زیادہ وقت ضائع نہ کرو۔ دستخط کر دو۔‘

’ اپنے خاندان کی موت پر دستخط؟‘

’ آسان موت….وہ رحم دل بادشاہ ہے….‘ راکیش وید نے آہستہ سے کہا۔

مرگ…امبوہ۔ تاریخ کی کتابوں سے ایسے کئی سیاہ ورق اور تصویریں اس وقت نظروں کے سامنے تھیں۔ باہر سڑک پر گاڑیاں اور ٹرک دوڑ رہے تھے۔ ان کی آواز بھیانک تھی۔ سرخ فارم میرے ہاتھ میں کانپ رہا تھا۔ پاشا مرزا اور سارہ کا چہرہ میری نگاہوں میں روشن تھا۔ اب یہ چہرے اوجھل ہو رہے تھے۔ مجھے چکّر آ رہے تھے۔ خفیہ افسر نے میرے ہاتھوں کو تھاما۔’ یہاں دستخط کرو۔‘

میرے ہاتھ لڑکھڑا رہے تھے۔

’ اور یہ تمہاری موت کا فرمان…. یہاں بھی دستخط کرو۔‘ راکیش وید مسکرائے…ویسے بھی تم میں زندگی کہاں بچی ہے۔ تمہارے پاس ابھی بھی کچھ دن ہیں۔ بیوی بچوں سے مل لو….‘

’ گڈ بائے۔‘ تارا دیش پانڈے کے ساتھ ساتھ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ جاتے ہوئے تارا دیش پانڈے نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ پھر آگے بڑھ گئے۔

کھڑکی کے باہر اب بھی سیاہ بادلوں کا کارواں موجود تھا۔ دن کی روشنی غائب ہو گئی تھی۔ اب آنکھوں کے سامنے دنیا کا سب سے بڑا ’اذیت کیمپ‘ تھا۔ بیمار جسموں کی ایک لمبی قطار سامنے تھی۔ چاروں طرف ایسی بد بو پھیلی ہوئی تھی کہ خطرناک بیماریاں پھیلنے کا خدشہ تھا۔ بجلی کے تار سے یہ پورا علاقہ پاٹ دیا گیا تھا۔ پولیس کے سپاہی بیماروں کو گھسیٹتے ہوئے بجلی کے تار کے قریب لیے جا رہے تھے۔ ان

تاروں میں کرنٹ دوڑ رہا تھا۔ یہ آخری اسٹیشن تھا۔ لوگوں کو ٹرینوں میں، بڑے بڑے لوہے کے ٹرکوں میں بھر کر لایا جا رہا تھا۔ چاروں طرف انسانی لاشوں کے جلنے کی مہک تھی۔

میں نے آنکھیں کھولیں تو سارہ قریب تھی۔ وہ چہرے سے غمزدہ لگ رہی تھی۔

'وہ چلے گئے....؟'

'ہاں۔'

'اور تم گواہ ہو کہ وہ آئے تھے اور تعداد میں دس تھے۔۔'

سارہ نے کہا۔'اتنا کیوں سوچتے ہو.....'

'اب بھی نہیں سوچوں۔ میں مرنے والا ہوں، میں نے موت کے فرمان پر.....'

میں سارہ کے چہرے کا تعاقب کر رہا تھا۔'سب کچھ اتنی جلدی سمٹ جائے گا۔ مجھے پتہ نہیں تھا۔'

میرا خیال ہے، سارہ اپنے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

'بجلی کے تار، کرنٹ، اذیت کیمپ اور کہانی ختم...'

اس بار سارہ روتے ہوئے زور سے چیخی۔'اتنا کیوں سوچتے ہو...'

میں پھر آہستہ سے بولا.... کہانی ختم......

◆◆

اس رات میں نے ڈائری کا آخری صفحہ لکھا، جسے تم پڑھنے جا رہے ہو میرے بیٹے پاشا مرزا۔ زندگی نفرت اور محبت کے درمیان کہیں ہے۔ یہ ہم پر ہے کہ ہم اسے کہاں تلاش کرتے ہیں۔ میں نے تمہارے لیے تین برس کا انتخاب کیا، یہ میری مجبوری تھی۔ لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ آگے کے دو برس تم اذیت میں گزارو۔ میں اب بھی چاہتا ہوں تم خوش رہو۔ خوشی، یہ پرندہ اب نہیں ہے۔ آلودہ فضا نے اس پرندے کو ہلاک کر دیا ہے۔ دو سال بعد تم پورے بیس برس کے ہو جاؤ گے۔ تمہارے پاس منصوبوں کے لیے پورا ایک سال باقی ہے۔

میرے بیٹے، میں زندگی بھر تہی دامن رہا۔ میرے پاس کچھ نہیں تھا، سوائے محبت کے۔ مجھے احساس ہے کہ کبھی بھی میری موت ہو سکتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی نفرتیں مل کر جنگ کی فضا تیار کرتی ہیں۔ میں اپنی محبت تمہیں دکھا نہیں سکا۔ سارہ کا بہت خیال رکھنا۔ اور میری طرح زندگی سے شکست تسلیم مت کرنا۔ تم میرے بہادر بیٹے ہو۔ اچھا میرے بیٹے الوداع.....

۱۲؍دسمبر ۲۰۱۸

باب پنجم

نیند میں چلنے والے

پاشا مرزا کی کہانی کا آخری صفحہ

(۱)

یہ غیر دلچسپ ڈائری تھی، جس کو پڑھنے میں مجھے کافی وقت لگا۔ میری ایسی کوئی خواہش نہیں تھی کہ کوئی ڈرا کیولا میرے جسم میں پنجے گڑا دے یا کوئی ویمپائر مجھے نگل لے یا کوئی وہیل مچھلی مجھے اپنا شکار بنالے۔ ایک برس، دو برس یا تین برس، ان کا حوالہ بھی مجھے کچھ زیادہ پسند نہیں آیا.....اور اس وقت ایک بار پھر مارک زبرگر اور اسٹیو جابس میرے سامنے کھڑے تھے۔

' چلتے ہوئے ہمیشہ یقین کرو کہ تم تنہا نہیں ہو۔' یہ مارک زبرگر تھے۔

' جہاں ہم بند راستہ دیکھتے ہیں، دراصل وہاں سے بھی ایک راستہ نکلتا ہے۔

اور جس وقت میں پلاسٹک کے کارڈ سے کھیل رہا تھا اور زومیٹو سے اپنے لیے آن لائن لنچ کا آرڈر دے رہا تھا ٹھیک اسی وقت ممی میرے سامنے آکر کھڑی ہو گئیں۔

' تم نے ڈائری پڑھ لی۔'

' ہاں۔ اور میں نے زومیٹو کو لنچ کا آرڈر بھی کر دیا۔'

' یہ کیا بات ہوئی۔'

' کیونکہ اب مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ میں نے ممی کی طرف دیکھا۔ کیا تم نے یہ ڈائری پڑھی۔'

' نہیں۔ کیونکہ ڈیڈی نے مرنے سے قبل صرف تمہیں پڑھنے کے لیے کہا تھا۔'

' ڈیڈی کو آخری وقت میں کیا ہوا تھا؟'

' وہ بہت بیمار تھے۔'

' کیا تم کچھ ان کی بیماری کے بارے میں بتا سکتی ہو؟' میں نے ممی کی طرف دیکھا۔ ' جہاں تک مجھے یاد ہے انہیں ہارٹ اٹیک آیا تھا۔'

' ہاں۔ کیونکہ آخری دنوں میں بہت پریشان تھے۔'

' دو برس زیادہ نہیں ہوتے۔' میں نے آہستہ سے کہا۔ ویسے ڈیڈی کا علاج کہاں چل رہا تھا۔

' ڈاکٹر ماتھر کے یہاں۔'

' جو ساؤتھ ایکس میں رہتے ہیں۔'

' ہاں۔'

میرے لیے ان تمام باتوں کا تجزیہ کرنے سے بہتر تھا کہ میں ڈاکٹر ماتھر سے ملوں۔ میں نے ڈاکٹر ماتھر کو فون کیا اور دوسرے دن صبح میں انہوں نے مجھے کلینک میں بلا لیا۔ ماتھر ۴۵ برس کے جوان تھے۔ میں نے انہیں ڈیڈ جہانگیر مرزا کے بارے میں بتایا۔ انہوں نے پرانا ریکارڈ لیپ ٹاپ پر چیک کیا۔ پھر میری طرف دیکھا۔

' دراصل وہ دو طرح کی بیماریوں میں گھر گئے تھے۔ ایک مالیخولیا، جسے انگریزی میں Melancholia کہتے ہیں۔ ایسا مریض

مستقل گہری اداسی کا شکار رہتا ہے۔اور یہ بیماری مختلف طریقوں سے اس کا شکار کرتی ہے۔مثال کے لیے گردن، چہرے، مسلز، مسلسل تناؤ کا شکار رہتے ہیں۔اس طرح مریض کے تصور میں ایک Disorder پیدا ہوجاتا ہے۔اس بیماری کے کئی اسباب ہوسکتے ہیں۔ جیسے کوئی گہرا صدمہ، محبت میں ناکامی، احساس کمتری (Inferiority complex)۔ایک اور وجہ ہے، ایسے کچھ مریض ضرورت سے زیادہ ذہین ہوتے ہیں اور ضرورت سے زیادہ سوچتے ہیں۔اس طرح وہ اپنی سوچ میں توازن نہیں رکھ پاتے۔ جرمنی کے مشہور فلاسفر نطشے آخری عمر میں اسی مرض کا شکار ہوگئے تھے۔'

' اوہ....؟ میں غور سے ڈاکٹر ماتھر کی باتیں سن رہا تھا۔اور دوسری بیماری.....

' مجھے دیکھنے دیجیے۔' لیپ ٹاپ پر چند سیکنڈ نظریں گڑانے کے بعد انہوں نے میری طرف دیکھا۔' دوسری بیماری اسی سے ملتی جلتی مگر زیادہ خطرناک تھی۔آخری عمر میں وہ Schizophrenia کا شکار ہوگئے تھے۔ایسا مریض موجود اور غیر موجود میں فرق نہیں کرپاتا اور لگتا ہے جیسے جو کچھ اس کے دماغ میں چل رہا ہے، وہی کچھ اس دنیا میں ہو رہا ہے۔اس میں مریض حقیقت اور توہم کے درمیان تقسیم ہوجاتا ہے۔کبھی کبھی ایسے مریضوں کو کچھ آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں، جو حقیقت میں نہیں ہوتیں۔مگر مریض ان آوازوں کو سچ سمجھ بیٹھتے ہیں۔اور مریض تخیل کے ذریعہ کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔جس کی وجہ سے وہ Hallucination کا شکار ہوجاتا ہے۔ اور پھر وہ غیر موجود کو دیکھنے لگتا ہے۔'

' اوہ۔' میں نے دوبارہ کہا۔اس وقت مجھے ڈیڈ کی ڈائری کے تمام واقعات وحادثات یاد آرہے تھے۔کیا وہ حقیقت میں ان دو بیماریوں کے شکار تھے۔اور ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا؟ وہ غیر موجود کو دیکھ رہے تھے۔اور تصور میں یہ غیر موجود سانسیں لے رہا تھا۔ میں کشمکش میں ڈوبا ہوا تھا۔

' ایک بات اور۔' ڈاکٹر ماتھر نے دیکھا۔مرنے سے دو ایک ماہ قبل ان کو نیند میں چلنے کی بیماری ہوگئی تھی

' سلیپ واکر۔'

ہاں۔جسم کے اندر کسی ایک ناقص ڈی این اے کی موروثی طور پر موجودگی نیند میں چلنے کی بیماری پیدا کرتی ہے۔ابھی تک اس مرض کا کوئی علاج پیدا نہیں ہوا ہے۔یہ مرض ۵۰ بالغ لوگوں میں کسی ایک کو متاثر کرتا ہے۔

' اوہ۔'

ویسے اس کے مریض کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ریل گاڑیوں کی پٹریوں کے درمیان لیٹ سکتے ہیں۔کسی کو قتل کرسکتے ہیں۔کبھی کبھی گھر کا دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھ کر ڈرائیونگ کی کوشش کرتے ہیں۔یہ سب نیم بیہوشی، تھکاوٹ اور دباؤ کی وجہ سے ہوتا ہے۔ایسے کئی مریض باہر کے ملکوں میں بھی دیکھے گئے ہیں۔واشنگٹن میں ایک مجرم پکڑا گیا، جس پر تین قتل کے مقدمے تھے۔بعد میں معلوم ہوا، یہ قتل اس نے نیند میں چلنے کی حالت میں کیے تھے۔'

' شکریہ ڈاکٹر۔'

میں ڈاکٹر ماتھر کے پاس سے نکلا تو میرا ذہن کافی تیزی سے کام کررہا تھا۔ڈاکٹر نے ڈیڈی کے بارے میں جو تفصیلات مجھے بتائی تھیں، وہ میرے لیے نئی تھیں۔ مجھے کئی باتیں یاد تھیں اور مرنے سے کئی مہینے قبل تک وہ کافی نروس اور گھبرائے ہوئے نظر آتے تھے۔ڈائری کی زیادہ تر باتیں سچ پر مبنی تھیں۔ہم میں سے زیادہ تر نوجوان سیاست سے دور رہتے ہیں۔اس لیے مسلسل جو حادثے ہوتے

رہے، ہم نے انہیں نظر انداز کیا۔ لیکن جادوگر تھا اور جادوگر ہے۔ اس کے جادو کے کرشمے اب بھی جاری ہیں۔ کشمیر سے ۳۷۰ چنار کے درخت غائب ہو گئے۔ ۳۵ ڈل جھیلیں سوکھ گئیں۔ مرد اور عورت گھر میں قیدی بنا دیے گئے۔ ایک سروے کے مطابق دو برسوں میں ان کے مکینوں کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ مگر کچھ باتیں مجھے اٹک رہی تھیں۔ سرخ کتاب نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ مگر موت کے دستاویز....؟ کیا ڈیڈی دوسروں سے کہیں زیادہ حالات کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ گھر آنے کے بعد میں نے ممی کو آواز دی۔ ممی اس وقت کچن میں کام کر رہی تھیں۔ ممی کو دیکھ کر میں نے سوال کیا۔

' کیا ڈیڈ کو نیند میں چلنے کی بیماری تھی۔'

' ہاں۔ مجھے دوبارا اس کا احساس ہوا۔ ایک دفعہ وہ آدھی رات میں گھر سے باہر نکل گئے۔ جب دروازہ کھول کر اندر آئے، اس وقت بھی وہ نیم بیہوشی کی حالت میں معلوم ہو رہے تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے آدھی رات کو دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو میری نیند کھل گئی۔ میں انہیں دوبار بیڈ تک لے کر آئی۔ دونوں بار نیند میں اٹھ کر انہوں نے باہر جانے کی کوشش کی۔ میرا خیال ہے اس عمل کو وہ کئی بار دہرا چکے تھے۔'

' نیند' میں ممی کی بات غور سے سن رہا تھا۔..' موت کا دستاویز....؟'

' میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔'

' یا بتانا نہیں چاہتی۔'

' میں نہیں جانتی۔ اور کچھ....؟'

' کیا سعدیہ آنٹی کا کچھ پتہ چلا۔؟'

' نہیں۔ ان کا گھر بھی راتوں رات غائب ہو گیا۔ وہ کہاں گئیں، کسی کو پتہ نہیں۔'

آخری سوال، کیا ڈیڈ حقیقت میں مجھ سے پیار کرتے تھے۔'

' مجھ سے بھی زیادہ۔ تم نہیں سمجھ سکتے۔'

ممی کے جانے کے بعد میں نے ڈائری کے مختلف صفحوں کو دوبارہ پڑھنے کی کوشش کی۔ کچھ جگہ نشانات بھی لگائے۔ یہ بھی سوال تھا کہ کیا ڈیڈ مالخولیا اور شی زوفرینیا کے مریض تھے تو وہ مستقبل کو دیکھ رہے تھے۔؟ یا جو کچھ ڈیڈ نے لکھا، وہ حقیقت میں پیش آیا تھا۔؟ یہ دنیا جس رفتار سے چل رہی تھی، اس بارے میں سوچنا مضحکہ خیز تھا کہ ڈیڈ نے ڈائری لکھتے ہوئے مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے۔ سرخ چیونٹیوں کی یلغار یا دن دہاڑے ہجومی تشدد کے واقعات، اب نئے نہیں تھے۔ سیاست میں میری دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن ڈیڈ نے جس تیزی سے آئی ہوئی موت کا تذکرہ کیا تھا، وہ موت اب زیادہ دور نظر نہیں آتی تھی۔

میں نے ممی سے دوبارہ موت کے فرمان کے بارے میں پوچھا۔

ممی کا اس بار بھی یہی جواب تھا۔ وہ اس بارے میں نہیں جانتیں۔

دو برس زیادہ نہیں ہوتے لیکن دو برس میں جادوگر کا یہ چہرہ سامنے آ چکا تھا۔ اب میں خفیہ پولیس سے ملنے کا مشتاق تھا۔ دوسرے دن میں نے اس کے گھر کی بیل بجائی۔ وہ گھر سے باہر نکل کر آیا تو مجھے کمزور محسوس ہوا۔ اس نے بتایا کہ ایک سال قبل وہ ریٹائر ہو چکا

ہے۔اب اسے شوگر ہے اور وہ پھل نہیں کھاتا۔ مجھے اس کے چہرے پر ابھی بھی حیوانیت نظر آ رہی تھی لیکن مجھے یہ بھی احساس ہے کہ بڑھتی عمر اور موت کے احساس نے اسے پہلے سے کہیں زیادہ کمزور بنادیا تھا۔اس کے بعد میں ناگارجن سے ملا۔ان کی آنکھیں کمزور ہوگئی تھیں اور انہوں نے اخبار پڑھنا بند کردیا تھا۔اب ان کو اس بات کا احساس تھا کہ جو کچھ ملک میں ہو رہا ہے، وہ صحیح نہیں ہے۔ان کا خیال تھا کہ ہندو نوجوان بہت حد تک بے روزگار ہو چکے ہیں اور کبھی بھی کوئی بڑی بغاوت اس ملک میں ہوسکتی ہے۔ میں نے موت کے فارم کے بارے میں پوچھا تو وہ چپ ہو گئے۔اور انہوں نے کہا کہ اس بارے میں وہ کوئی بات نہیں کر سکتے۔

اب میں تارا دیش پانڈے سے ملنا چاہتا تھا۔ پاپا کے موبائل میں تارا دیش پانڈے کا نمبر تھا۔ جب پہلی بار انھوں نے میرے بارے میں سنا تو ملنے سے صاف انکار کردیا۔دوسری بار انہوں نے کمزور آواز میں کہا....شام میں مل سکتے ہو۔

شام پوری تیاری کے ساتھ میں تارا دیش پانڈے سے ملنے ان کے گھر پہنچا۔ وہ میرا انتظار کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے سب سے پہلے سوال کیا۔

’ تم میرے بارے میں کیا جانتے ہو؟‘

’ زیادہ نہیں ۔‘

’ اوہ‘ ان کی حیرانی میں کمی آئی تھی۔

’ آپ ڈیڈ کے بارے میں کیا جانتی ہیں۔؟‘

’ وہ میرے دوست تھے۔مگر ایک کمزور انسان ۔‘

’ آخری بار آپ میرے گھر کب آئی تھیں۔؟‘

’ یاد نہیں۔اب تو کافی وقت گزر گیا؟۔‘

’ کیا آپ نے ڈیڈ کو کوئی دھمکی بھی دی تھی؟‘

تارا دیش پانڈے کے چہرے کا رنگ اتر گیا....’تم اس بارے میں کیسے جانتے ہو۔‘

’ میں نہیں جانتا۔اسی لیے پوچھ رہا ہوں۔‘

تارا نے اٹک اٹک کر کہا....’میں اسے خوفزدہ کرنا چاہتی تھی۔‘

’ اس عالم میں، جب وہ بستر مرگ پر تھے۔؟‘

’ یہ میں نہیں جانتی۔مگر وہ ایک دماغی مریض تھے۔‘

’ دماغی مریض....‘

’ وہ بہت آگے کی باتیں سوچ لیا کرتے تھے۔‘

’ یعنی غلط سوچتے تھے؟‘ میں نے تارا دیش پانڈے کی آنکھوں میں جھانکا۔

’ نہیں۔ یہ مطلب نہیں ہے۔مگر حالات اچھے نہیں تھے....اور انہیں وقت کے ساتھ چلنا چاہیے تھا۔

’ اور وہ موت کا فرمان؟‘

تارادیش پانڈے نے برا سا منہ بنایا۔ میں اس بارے میں نہیں جانتی اور مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔

تارادیش پانڈے کے گھر سے نکلنے کے بعد مجھ اس بات کا احساس ہوا کہ ان میں سے ہر شخص مجھ سے کچھ نہ کچھ چھپانے کی کوشش ضرور کر رہا تھا۔ کیا حقیقت میں دو برس قبل موت کے فارم پر دستخط لیے گئے۔ لوہے کے ٹرکوں میں قیدیوں کی طرح مسلمانوں کو بھرا گیا۔ اور انہیں گیس چیمبر لے جایا گیا، جیسا کہ ڈیڈ نے ڈائری میں لکھا تھا۔ اب میں راکیش وید سے ملنا چاہتا تھا۔ ان سے ملنا آسان نہیں تھا۔ دو برس کے اندر وہ راجیہ سبھا میں پہنچ چکے تھے۔ کافی کوششوں کے بعد مجھے تین دن بعد ملاقات کا وقت دیا گیا۔ یہ ملاقات بی مشن کے ہیڈ آفس میں طے پائی گئی۔ مجھے خیال ہے کہ اس ملاقات سے مجھے ڈیڈ کے بارے میں بہت کچھ جاننے کا موقع مل سکتا ہے۔

(۲)

کامریڈ اتل اب بی مشن کا حصہ بن چکے تھے۔ اور ان کے نام کے آگے سے کامریڈ کا لفظ ہٹ چکا تھا۔ ان کے کئی اشتعال انگیز بیانات نے بھی تہلکہ مچایا تھا۔ اب ان کی جگہ ذمہ داری کامریڈ قیوم کو دی گئی تھی۔ میں پارٹی آفس میں جا کر کامریڈ قیوم سے بھی ملا لیکن انہوں نے میری غیر ضروری گفتگو میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ کامریڈ فرید میرے ساتھ باہر تک آیا۔ اس سے باتیں ہوئیں تو اس نے بتایا کہ میرے ڈیڈ نے کچھ بھی غلط نہیں کہا۔ دو برس قبل ایسے تمام حادثات سامنے آ چکے ہیں۔ اب فصلوں کے کٹنے کا موسم ہے۔ اور فصلیں بہت جلد کاٹی جائیں گی۔

اربوں روپے سے تعمیر شدہ بی مشن کے ہیڈ آفس کا آہنی گیٹ کھلا اور میں نے اس کے اندر قدم رکھا تو ایسا محسوس ہوا، جیسے میں کسی قید خانے میں آ گیا ہوں۔ یہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ راکیش وید کا نام لینے پر، گیٹ پر مجھ سے زیادہ پوچھ تاچھ بھی نہیں ہوئی۔ ہیڈ آفس کے عالیشان محل میں یہ میری پہلی انٹری تھی۔ راکیش وید کے لیے مجھے آدھے گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ اس درمیان گیسٹ روم میں انتظار کرنے کے لیے کہا گیا۔ تقریباً ۴۵ منٹ بعد میرا بلاوا آیا۔ ماتھے پر ٹیکہ تھا۔ زعفرانی رنگ کا کرتا تھا۔ عمر ۵۰ کے آس پاس ہوگی۔ مجھے دیکھتے ہوئے مسکرائے۔

'اسمارٹ ہو۔ بی مشن میں کیوں نہیں آ جاتے۔؟'

'آ جاؤں گا سر۔'

'گڈ۔' راکیش وید مسکرائے۔ ہاں تم نے بتایا تھا کہ تم جہانگیر مرزا کے بیٹے ہو۔'

'جی سر۔'

'میں نے بی مشن چھوڑنے سے منع کیا تھا۔'

'جی۔ مجھے پتہ ہے۔'

'وہاں سے اٹھ کر سرخوں کے پاس چلا گیا۔ کیا ملا؟'

'دراصل وہ ہم قتل....' میں کہتے کہتے رک گیا۔

'قتل کہاں نہیں ہوتے۔' راکیش وید مسکرائے... چیچنیا میں، فلسطین میں، لبنان میں، پاکستان میں، افغانستان میں.....'

'کشمیر میں.....' میں آہستہ سے بولا۔
'کچھ قتل واجب ہوتے ہیں۔ راکیش وید میرے چہرے کا جائزہ لے رہے تھے۔ 'لیکن ہر قتل سیاسی نہیں ہوتا۔'
'آپ آخری باران سے ملنے گھر بھی گئے تھے۔؟'
'میں؟' راکیش وید اچانک چونک گئے.....نہیں تو.....
'آپ یاد کرنے کی کوشش کیجیے سر۔'
'دو برس ہو گئے۔ کچھ یاد نہیں آ رہا۔'
'وہ سرخ کتاب.....موت کا فارم...'
راکیش وید ہنسے.....سب پرانی بات ہوگئی۔ پرانی کتاب کب تک چلتی۔ سرخ کتاب آ گئی۔ مگر یہ سرخ رنگ بہت حد تک زعفران سے ملتا جلتا رنگ ہے۔ تمہارے کمیونسٹ پارٹی کا رنگ نہیں۔'
'میں کمیونسٹ پارٹی سے نہیں ہوں سر۔'
'گڈ۔' راکیش وید مسکرائے۔ تم نوجوان ہو، اس لیے اتنا تو سمجھ ہی سکتے ہو کہ تم میں اور ہم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہے یا نہیں۔؟ تم خدا کی پرستش کرتے ہو۔ ہم پتھروں کو پوجتے ہیں۔ تمہارا رہن سہن طور طریقہ الگ ہے۔ ہمارا الگ۔ تم گوشت کھاتے ہو۔ ہم گھاس پھوس۔ تم لٹیرے بن کر آئے اور ہم میں سے کچھ لوگوں کو گوشت کھانا سکھا دیا۔' راکیش وید زور سے ہنسے.....تم لوگوں نے ایسا بہت کچھ کیا، جو نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہی کام ہم کریں تو اپرادھ۔ جزیہ مغلوں نے لگایا۔ ہم یہ کام کریں تو اپرادھ...تم نے ہمارے مندر توڑے، ہم مسجدیں توڑیں تو اپرادھ۔ ہم نے سب کچھ تم لوگوں سے سیکھا۔'
'نہیں سر۔' میں نے مسکرا کر کہا۔ ہم میں آپ میں کوئی فرق نہیں۔ ہم آپ دونوں اسی سرزمین کا حصہ ہیں۔ ہم باہر سے آئے تو آپ بھی باہر سے آئے۔ مغلوں نے جزیہ لگایا تو تحفظ بھی دیا۔ اکبر نے دوبار جزیہ ختم کیا۔ کسی بھی مسلمان ملک میں غیر مسلموں پر کوئی زیادتی نہیں ہوتی۔ مجھے معاف کیجیے گا سر، یہ سب آپ نے کہیں اور سے سیکھا۔'
'تم میں اور جہانگیر مرزا میں فرق ہے۔' راکیش وید مسکرائے۔
'یہ فرق جنریشن کا بھی ہے سر۔ ہم بہت جلد ایموشنل نہیں ہوتے۔'
'ہاں، ایموشنل۔' راکیش وید کچھ سوچ رہے تھے۔ 'تمہاری نسل کے لیے مرنا بھی کھیل جیسا ہے۔'
'یہ سچ ہے۔ مگر ہماری نسل کی چمڑی موٹی ہے سر۔' میں مسکرایا۔
'اب اتنی بھی موٹی نہیں۔' راکیش وید ہنسے.....
'کیا پانچویں موت میرے ڈیڈ کی تھی؟'
'انہیں ہارٹ اٹیک آیا تھا۔'
'خوف اور صدمے سے بھی ہارٹ اٹیک آتا ہے سر۔'
'ہوسکتا ہے۔' راکیش وید بغور میرے چہرے کا جائزہ لے رہے تھے.....مگر آخری ملاقات کے بعد میں محسوس کر رہا تھا کہ موت

اس کے آس پاس ناچ رہی ہے۔'

' اور اس موت کو قریب آپ نے کیا تھا...' میں موت کا فارم کہتے کہتے رک گیا۔ راکیش وید سے اب کچھ بھی پوچھنا فضول تھا۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ راکیش وید اب بھی پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں تیزی کے ساتھ دروازے سے باہر نکل گیا۔

میں باہر آیا تو یہ دیکھ کر مجھے حیرت نہیں ہوئی کہ سڑک پر یا سڑک کے کنارے جو لوگ بھی چل رہے تھے، وہ دراصل نیند میں چلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دو برس قبل یہ زندہ متحرک لوگ ہوں گے اور جذباتی بھی۔ مگر دو برس میں جادوگر نے ان سب کو سلیپ واکر بنا دیا تھا۔ میں نے چلتے ہوئے لوگوں کو غور سے دیکھا۔ ان کے قدموں میں نقاہت تھی۔ سر تھوڑا جھکا ہوا تھا۔ آنکھوں کے پپوٹے بھاری تھے۔۔ اور ایسے تمام لوگ سیدھی دشا میں چل رہے تھے۔ مجھے اس بات کا بھی احساس ہوا کہ ان میں سے کسی کو بھی کسی سے مطلب نہیں ہے۔ دو برس میں یہ تمام لوگ نیند کے نشہ میں ڈوب گئے تھے یا گہری نیند کے عادی ہو گئے تھے۔ جبکہ دو برس میں یہ دنیا زیادہ خوفناک ہو گئی تھی۔ زیادہ لوگ ہلاک ہوئے تھے۔ زیادہ لوگ اپنے گھروں سے غائب ہوئے تھے۔ حادثات کی رفتار پہلے کے مقابلے کہیں تیز تھی۔ چنار کے درخت جن سے سورج کی شعاعیں ٹکراتیں تو چاروں طرف سونے کے ٹکڑے چمکتے ہوئے نظر آتے۔' اب چنار سے شعلے نکل رہے تھے اور ایک پوری قوم کو نسل کشی کے لیے مجبور کیا جا رہا تھا۔ ایسے بہت سے حادثے تھے، جو ڈیڈی کے مرنے کے بعد سامنے آئے مگر نیند میں چلنے والے اب ایسے حادثوں سے بے خبر تھے۔ انہیں صرف یہی معلوم تھا کہ انہیں آفس آنا ہے۔ آفس سے گھر جانا ہے۔ سیاسی معاملات پر کوئی بات چیت نہیں کرنی ہے۔

میں نے ایک شخص کو روکا۔ اور دریافت کیا.....

' کیا آپ نیند میں چل رہے ہیں۔'

اس نے جواب دیا۔ ہاں۔ یہاں ہر شخص نیند میں ہے۔

' نیند میں تو خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔ کچھ لوگ گاڑی کے نیچے آ سکتے ہیں۔'

' ہاں اکثر آتے ہیں۔ نیند میں چلنے والے ان باتوں سے بے خبر رہتے ہیں۔'

' موت....؟' میں کہتے کہتے رک گیا۔

اس نے عجیب سا چہرہ بنا کر میری طرف دیکھا.... ' زندگی کہاں ہے؟'

سامنے ایک بڑے اخبار کی عالیشان بلڈنگ تھی۔ ایک صحافی ہاتھ میں کچھ کاغذات لیے باہر نکل رہا تھا۔ میں اس صحافی کو پہچانتا تھا۔ میں کئی بار ٹی وی چینل پر اس کو دیکھ چکا تھا۔ میں تیزی سے آگے بڑھا۔ اس کی آنکھیں نیم غنودگی میں ڈوبی تھیں۔ اور وہ بھی سیدھی سمت چل رہا تھا۔ میں تیز چلتا ہوا اس کے پاس آیا۔

' آپ نیند میں ہیں۔'

وہ زور سے ہنسا۔ کیا تم نہیں ہو....

میں مسکرایا۔' کیا نیند کے پیسے بھی ملتے ہیں۔'

' ڈوز جتنا زیادہ، پیسہ اتنا زیادہ۔اس بارے میں ہم نہیں سوچتے...'

' کیا آپ کے دفتر میں کٹھ پتلیاں بھی ہیں؟'

اس نے میری بات نہیں سنی۔ وہ مصروف تھا، اس لیے تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ یہاں مجھے سب کٹھ پتلیوں کی طرح نظر آرہے تھے۔جن کی ڈور کسی اور ہاتھ میں تھی۔ مجھے ڈیڈ کی ڈائری کا وہ صفحہ یاد آیا، جس میں انہوں نے لکھا تھا، کچھ لوگ نیند میں جادوگر کا قتل کررہے تھے۔یعنی کوئی لمحہ ان کی زندگی میں ایسا بھی ہوتا ہے، جب نیند ذرا سی کھلتی ہے۔ یہ بیداری کا لمحہ ہوتا ہےاوراس وقت ان کے اندر قتل کرنے کی خواہش زور پکڑتی ہے۔یعنی ان کی نیم بیہوشی کا فائدہ اٹھایا جارہا ہے۔

سڑک پر پولیس والے کچھ مدرسے کے بچوں کو کھینچتے ہوئے لیے جارہے تھے۔کہاں، میں یہ نہیں جانتا تھا۔مگر نیند میں چلنے والے ان تمام باتوں سے انجان تھے۔کوئی دس بجے ہوں گے۔اس وقت ٹریفک رک گیا تھااور نیند میں چلنے والے بھی رک گئے تھے۔دکانیں کھلی تھیں۔ان کے درمیان عالیشان عمارتوں کی قطار تھی۔سڑک کنارے کچھ پھیری والے بھی تھے۔اب یہ عقدہ مجھ پر کھل رہا تھا کہ یہ سب نیند میں ڈوبے تھے۔ یہ نیند میں کام کرتے تھے۔نیند میں چلتے تھے۔نیند میں ان عالیشان عمارتوں کے آسیب میں سما جاتے تھے۔نیند میں شاپنگ کرتے تھے۔یہاں تک کہ نیند میں اخبار پڑھتے اورٹی وی دیکھتے تھے۔باہر کی دنیا سے اب انہیں کوئی مطلب نہیں رہ گیا تھا۔کیا میں بھی ان میں سے ایک ہوں؟ یقینی طور پر۔اس وقت اسٹیو جابس میرے سامنے کھڑے تھے۔جب سب نیند میں چل رہے ہیں تو تم ان سے الگ کیسے ہوسکتے ہو۔؟

دیر تک سڑک پر یونہی آوارہ گردی کرتے ہوئے اچانک میں ٹھہر گیا۔سامنے ایک ریستوراں تھا۔اس ریستوراں کا نام الدسترخوان تھا۔ایک نوجوان کچھ دیر کے لیے ریستوراں سے باہر آیا تھا۔وہ ادھرادھر دیکھ رہا تھا۔پھروہ دوبارہ ریستوراں کے اندر چلا گیا۔میرے دل ودماغ میں تیز حرکت ہوئی۔ریمنڈ۔اب میں نیند سے بیدار تھا۔یہ کرشمہ تھا یا خواب۔لیکن ریستوراں سے باہر آنے والا شخص ریمنڈ ہی تھااور ریمنڈ کو میں لاکھوں کی بھیڑ میں پہچان سکتا تھا۔یہ میری نظروں کا دھوکہ نہیں تھا۔بلیو وہیل گیم کے بعد آج مدتوں بعد میں اس کا دیدار کررہا تھا۔تو کیا ریمنڈ زندہ ہے۔؟ اگر زندہ ہے تو وہ ہم لوگوں کے سامنے کیوں نہیں آیا۔اس نے خود کو چھپانے کی کوشش کیوں کی۔ نیتی، راہل وہ کسی بھی دوست سے کیوں نہیں ملا۔وہ کالج کیوں نہیں آیا۔اس وقت میں ہزاروں سوالوں کی زد میں تھااوران سب کا جواب ریمنڈ کے پاس تھا۔ میں تیز چلتا ہوا ریستوراں کے دروازے پر ٹھہر گیا۔کیا حقیقت میں وہ ریمنڈ تھا۔اگر ہاں تو وہ اس ریستوراں میں کیا کررہا ہے۔؟

پہلے میں اس بات کا مکمل یقین کرنا چاہتا تھا کہ وہ ریمنڈ ہی ہے۔ہم لوگ ریمنڈ کو مردہ تصور کرچکے تھے، وہ بلیو وہیل سے جنگ کرنے نکلا تھا، جو ہر دن اس کا شکار کررہی تھی۔اس لیے ہمارا پختہ یقین تھا کہ ریمنڈ کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آچکا ہےاور وہ ہمارے درمیان نہیں ہے۔میں تیزی سے مڑااور ریستوراں میں داخل ہوگیا۔ریستوراں میں اس وقت سناٹا تھا۔کچھ کرسیوں پر لوگ بیٹھے تھے۔ایک طرف ایک کیبن تھا، جہاں مجھے کوئی بیٹھا ہوا نظر آیا۔یقیناً یہ ریمنڈ تھا۔میں تیزی سے آگے بڑھا۔دروازہ کھولا۔اور ریمنڈ اچانک مجھے دیکھ کر چونک گیا۔

' تم پاشا مرزا۔'

میں نے اسے ایک گندی سی گالی دی۔ 'سالے تم زندہ ہو۔'
' دیکھ کر مزہ نہیں آیا۔'
ریمنڈ میرے گلے لگ گیا۔ 'ہاں دوست زندہ ہوں۔اور یہ میری دوسری زندگی ہے۔'
' لیکن تم نے خود کو چھپا کر کیوں رکھا۔'
' کیوں کہ میں دنیا کے سامنے نہیں آنا چاہتا تھا۔تم میرے باپ سے ملو گے؟'
اس بار میں چونک گیا تھا۔کچھ دیر ٹھہرو۔ہم ابھی گھر چلتے ہیں۔
اس نے ریسپشن پر بیٹھی ہوئی لڑکی کو آواز دی۔کچھ سمجھایا۔اس کے بعد ہم باہر نکل آئے۔ باہر ایک خوبصورت مہنگی کار کھڑی تھی۔ میں ڈرائیونگ سیٹ کے پاس والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ریمنڈ کار ڈرائیو کر رہا تھا۔اس وقت اس کے چہرے پر جوش بھی تھا اور میں کچھ ہلچل بھی محسوس کر رہا تھا۔

(۳)

دروازہ ایک بزرگ شخص نے کھولا۔ یہ ایک خوبصورت عمارت تھی، جس کے باہر اللہ لکھا ہوا تھا۔ بزرگ شخص کے بال سفید تھے۔ داڑھی بھی سفید تھی۔ان کے چہرے سے نور ٹپک رہا تھا۔انہوں نے سفید کرتا اور پائجامہ پہن رکھا تھا۔ریمنڈ نے ادب سے انہیں السلام علیکم کہا اور یہ بھی کہ یہ میرا دوست ہے۔ بزرگ خاموش تھے۔ریمنڈ مجھے لے کر اندر آ گیا۔کمرے میں داخل ہوتے ہی ڈرائنگ روم تھا۔ کافی کشادہ۔ایک طرف کچھ اسلامی پینٹنگس لگی تھیں۔صوفے قیمتی تھے۔اس درمیان ایک بزرگ خادم اندر آیا۔اس کے سر پر ٹوپی تھی۔ اس نے میرے آگے پانی کا گلاس رکھ دیا۔کچھ دیر بعد اندر سے فریش ہو کر ریمنڈ ڈرائنگ روم میں آ گیا اور میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔وہ مجھے دیکھ کر ہنس رہا تھا۔
' یقیناً تم کو یہ سب دیکھ کر تعجب ہو رہا ہو گا۔'
ریمنڈ تعجب کی بات کر رہا تھا جبکہ اس وقت میں ویلس کے ونڈر لینڈ میں تھا۔اسٹیو جابس اور مارک زکر برگ اچانک میرے سامنے آ گئے۔ دونوں مسکرا رہے تھے۔اس دنیا میں بہت کچھ ایسا ہوتا ہے، جس کے بارے میں ہم پہلے سے نہیں جانتے۔یہ گول گول گھومتی گھڑی کی سوئیاں ہیں جو اچانک ہمیں کسی ونڈر لینڈ میں لے آتی ہیں۔ میں ریمنڈ کو دیکھ رہا تھا۔اس درمیان دروازہ کھولنے والے بزرگ ریمنڈ کے پاس ہی بیٹھ گئے۔انہوں نے ریمنڈ کے سر پر ہاتھ رکھا۔میری طرف شفقت آمیز نظر ڈالی۔پھر اٹھ کر چلے گئے۔
' یہ بول نہیں سکتے۔' ریمنڈ نے آہستہ سے کہا۔اس وقت اس کے چہرے پر ایسی نفرت تھی، جس کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔
' کیوں۔؟'
' بتاؤں گا۔'
اس درمیان بزرگ خادم ہمارے لیے چائے اور ناشتے کی ٹرے رکھ کر واپس چلے گئے۔
' یہ علی بابا ہیں......اور جنہیں تم نے ابھی دیکھا، وہ میرے ابّو ہیں۔علی بابا گھر کے خادم نہیں ہیں۔ہماری ضرورتوں کا خیال رکھتے ہیں۔ابّو کے ساتھ برسوں سے ہیں۔'
یہ کہانی مجھے حیران کر رہی تھی۔

' ابّو کا نام ابونصر ہے۔ جو ریستوراں تم نے دیکھا، وہ ابّو کا ہے۔ اب میرا ہے۔ ابّو نے یہ گھر، یہ ریستوراں سب میرے نام کر دیا۔۔ان کا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ کیا آج کے زمانے میں تم سوچ سکتے ہو کہ کوئی شخص ایسا بھی ہو سکتا ہے۔؟ اس نفرت کے دور میں؟ زہریلے دور میں.....؟'

میں ریمنڈ کی باتیں سن رہا تھا۔ اس وقت دنیا کا کوئی بھی قصہ مجھے ریمنڈ کی داستان سے بہتر نہیں لگ رہا تھا۔ ظہر کا وقت تھا۔ میں نے بزرگ کو ڈرائنگ روم کے ایک طرف نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ نماز پڑھنے کے بعد ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ جانماز پر بیٹھے ہوئے وہ آہستہ آہستہ تسبیح کے دانوں پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔

ریمنڈ نے میری طرف دیکھا.....'یوں تو لمبی کہانی ہے لیکن تمہیں مختصر میں بتاتا ہوں۔ بلیو وہیل گیم کے پچیسویں پڑاؤ پر تھا۔ میں اندر سے مضبوط تھا، اس لیے شاید زندگی کی امنگ میرے اندر باقی رہ گئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود میں جان رہا تھا کہ یہ گیم مجھے موت کی طرف لیے جا رہا ہے اور ممکن ہے پچاسواں پڑاؤ پار کرنے سے قبل ہی میری موت ہو جائے۔ ڈیڈی کو کچھ حد تک میرے ہاتھوں اور چہرے کی خراش سے کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا۔ اس دن مجھے لے کر ان کا موڈ بہت خراب تھا۔ ایک بار پھر انہوں نے مجھے گھر سے نکل جانے کو کہا۔

ان کا لہجہ سخت تھا۔' جا کر کہیں ڈوب مرو۔'

' کیوں مروں۔؟'

' ویسے بھی تم مرنے والے ہو۔ میرا دماغ مت خراب کرو۔'

' میں کہاں جاؤں گا؟'

' کہیں بھی۔ لیکن یہ گھر خالی کر دو۔'

' خالی نہ کروں تو....'

' میں تمہیں دھکے مار کر باہر نکال دوں گا۔'

ریمنڈ نے میری طرف دیکھا۔' یہ ایک باپ کی نفرت تھی اور میں اس نفرت کے لیے تیار نہیں تھا۔ اب چھبیسواں پڑاؤ تھا۔ صبح ۴ بج کر ۲۰ منٹ۔ میں نے کھیل شروع کیا اور جس عالم میں تھا، اسی عالم میں اٹھ کر باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد میں ریل کی پٹریوں کے درمیان تھا۔ مجھے کچھ بھی نہیں معلوم۔ ریل آنے والی تھی۔ اسی وقت زور سے کسی نے میرے ہاتھوں کو پکڑ کر کھینچا۔ ریل گزر گئی۔ میرے قریب ایک بزرگ شخص کھڑے تھے۔ میرے ابّو۔ انہوں نے کچھ نہیں پوچھا۔ مجھے لے کر گھر آ گئے۔ ان کا گھر یہاں سے قریب تھا۔ نماز کے بعد وہ اکثر ٹہلنے کے لیے اس طرف جاتے تھے۔

علی بابا نے میرے لیے ناشتہ لگایا۔ ابونصر نے کہا.... یہ تمہارا گھر ہے، جب تک چاہے رہ سکتے ہو...'

ریمنڈ نے میری طرف دیکھا۔ ایک فرشتہ میرے سامنے تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مسلمان ایسے بھی ہوتے ہیں۔ ابو نے مجھے جینے کی دعائیں دیں اور مجھے سمجھایا کہ زندگی کس قدر قیمتی ہے۔ پھر مجھے وہ لے کر ریستوراں جانے لگے۔ انہوں نے بتایا کہ کچھ برس قبل ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ ایک بیٹا تھا جو عین جوانی میں اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اب علی بابا کے علاوہ ان کا دنیا میں کوئی نہیں۔ میں بلیو وہیل، پرانے گھر اور اپنے ڈیڈی ممی کو بھول چکا تھا۔ مجھے اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ کچھ رشتے خون کے رشتے سے زیادہ مضبوط

ہوتے ہیں۔ ابھی کچھ دن قبل یہ کہہ کر ابو نے ریستوراں اور گھر میرے نام کر دیا کہ ان کی زندگی کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ ہاں اس درمیان ایک خوفناک واقعہ پیش آیا۔

ریمنڈ کچھ دیر کے لیے چپ ہوا۔ میری طرف دیکھا۔ 'تم نے کچھ لیا نہیں۔'

' تمہاری کہانی ہی ایسی تھی۔'

' زندگی ہر بار نئی لگتی ہے دوست۔' ریمنڈ نے میری طرف دیکھا۔ 'ذرا باہر نکل کر دیکھو... نفرت کی برف گر رہی ہے اور یہاں...' اس کا لہجہ سخت تھا... ان کا جواب دینے کے لیے علی بابا اور ابونصر جیسے لوگ ہمیشہ ہوتے ہیں اور اس لیے زیادہ دنوں تک ان کی نفرتیں اپنا کام نہیں کرتیں۔'

ریمنڈ نے میری طرف دیکھا۔ میں اس زندگی کے بارے میں خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔؟ وہ میرے سگے ڈیڈی ممی تھے۔ لیکن مجھے اس گھر میں ایک دن بھی سکون نصیب نہیں ہوا۔ اور یہاں آ کر مجھے زندگی مل گئی۔ ایک خوبصورت زندگی کو مذہب کے خانوں میں کیوں تقسیم کر دیا گیا ہے۔؟ اس دن...'

ریمنڈ کا لہجہ پھر سخت تھا۔ 'ابو عشا کی نماز سے لوٹ رہے تھے۔ ماب لنچنگ انجام دینے والوں نے ان کی عمر کا خیال بھی نہیں کیا۔ ان کی داڑھی، ٹوپی، موچھ انہیں سڑک پر گرایا۔ اور ان کی زبان کاٹ لی۔'

' زبان کاٹ لی؟' میں چونک گیا۔

' مجھے خبر ملی تو میں نے پولیس اسٹیشن سر پر اٹھا لیا۔ ابو کو لے کر اسپتال گیا۔ ابو بے ہوش تھے۔ میں اس معاملے کو کورٹ تک لے کر گیا۔ اور تم جانتے ہو کورٹ میں کیا بات ہوئی۔؟ وہ ایک ساؤتھ انڈین جج تھے۔ پستہ قد۔ وہ اس کیس کو دیکھ رہے تھے۔ ان سے جو بات ہوئی وہ تمہیں بتاتا ہوں۔

جج: کیا تم اس آدمی کو جانتے ہو؟

ریمنڈ: ہاں

جج: کیا نام ہے اس کا

ریمنڈ: ابونصر

جج: کیا کرتا ہے؟

ریمنڈ: ایک ریستوراں چلاتے ہیں

جج: تم سے کیا رشتہ ہے

ریمنڈ: میرے ابو ہیں

جج: ابّو؟ فادر؟

ریمنڈ: یس

جج: لیکن تم تو ہندو ہو

ریمنڈ: ہاں

جج: پھر یہ تمہارے فادر کیسے ہو سکتے ہیں؟

ریمنڈ: یہ میرے ابّو ہیں اور یہ حقیقت ہے
جج: لیکن ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟
ریمنڈ: یہی سچ ہے
جج: کہیں یہ تم کو مسلمان تو نہیں بنا رہے؟
ریمنڈ: بالکل نہیں
جج: یہ آدمی کٹّر لگتا ہے
ریمنڈ: کیا پوجا پاٹ کرنے والے کٹّر ہوتے ہیں؟
جج: نہیں
ریمنڈ: یہ نماز پابندی سے پڑھتے ہیں اور ٹریرسٹ نے ان کی زبان کاٹ دی
جج: تم ان لوگوں کو ٹریرسٹ کیسے کہہ سکتے ہو؟
ریمنڈ: ایسے لوگوں کو کیا نام دیا جائے آپ ہی بتا دیجیے
جج: تم نے کہا یہ تمہارے ابّو ہیں۔ کیسے مان لوں....؟
ریمنڈ: ان کے پاس ایک عالیشان گھر اور ریستوراں ہے۔ یہ دونوں انہوں نے اپنے بیٹے یعنی میرے نام کر دیے۔ وصیت میں بھی مجھے بیٹا کہا گیا ہے۔
جج: وہاٹ: اپنا گھر اور ریستوراں تمہارے نام کر دیا...؟
ریمنڈ: جی ہاں۔ یہ ان کی وصیت کے کاغذات ہیں۔ آپ دیکھ سکتے ہیں۔
جج: (کھڑے ہوکر): میں آپ کو سیلیوٹ کرتا ہوں سر۔ آپ لوگ کبھی بی مشن کو کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔

میں نے ریمنڈ کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ یہ جج نے کہا، جو کچھ دیر بعد پہلے میرے ارگومنٹ سے خوش نہیں تھا۔ تم سمجھ سکتے ہو، عدالت، انصاف سب جگہ ایک خاص رنگ آ گیا ہے۔ کورٹ میں بھی ابو خاموش تھے۔ میں انہیں سہارا دیتے ہوئے باہر لایا۔ پھر گھر آ گیا۔

’اوہ...زبان کاٹ دی گئی۔‘ میرے تصور میں وہ لمحہ گھوم رہا تھا جب اس بزرگ شخص کی زبان کاٹی گئی ہوگی۔ وہ کس قدر درد سے چلایا ہوگا۔ نیند میں چلنے والوں کی بھی زبان کاٹ دی گئی تھی۔ میری آنکھوں کے آگے ابھی بھی ڈائری کے ورق رقص کر رہے تھے۔ اس درمیان ابونصر چلتے ہوئے دوبارہ صوفے پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے ایک سفید کاغذ پر قلم سے کچھ لکھا اور میری طرف بڑھایا۔

’جمہوری اور غیر جمہوری طاقتوں کی آخری لڑائی۔ اصل فیصلہ ابھی نہیں ہوگا۔‘

میں نے پڑھنے کے بعد ان کی طرف دیکھا۔ ان کا چہرہ پرسکون تھا۔ پھر وہ اٹھے اور اندر چلے گئے۔

♦♦

ممی سارہ مجھے گھر میں نہ دیکھ کر پریشان ہوگئی تھیں۔ میں واپس آیا تو ممی کے چہرے کی شادابی نے میرے آگے سے وہ دھند

ہٹادی، جس کے درمیان میں قید ہوکر رہ گیا تھا۔

' خدا کے لیے، مجھے بتا کر جایا کرو پاشا۔'

' میں بتا کر گیا تھا۔'

' خدا کے لیے....' وہ کچھ کچھ کہتے رُک گئی۔

' کیا لوگ غلام بنے رہنا چاہتے ہیں ممّی ؟'

' پتہ نہیں۔'

' تمام رشتے جس احساس سے منسلک ہیں، اس کا نام آزادی ہے۔'

' تم اب بڑے ہو گئے ہو؟'

' کیا ڈیڈ حقیقت میں نیند میں چلتے تھے؟'

' شاید ہاں۔'

' میرا خیال ہے نہیں۔'

' کیوں؟'

' وہ نیند میں چلنے والوں کے لیے لڑ رہے تھے۔'

' نیند میں.....'

' وہ دیکھو....' میں نے کھڑکی سے باہر اشارہ کیا.... جو لوگ چل رہے ہیں، ان کی حرکات وسکنات کا جائزہ لو....انہوں نے آسانی سے خود کو نیند کے حوالے کر دیا ہے۔ ڈیڈ ایسا نہیں کر سکے....اس لیے....' میرا لہجہ مضبوط تھا..' ڈیڈ گم ہو گئے ...':

◆◆

جب رات کی تاریکی یہ اعلان کرتی ہے کہ میں ہوں تو کچھ دیر گزر جانے کے بعد سحر پُر نور بھی یہ اعلان کرتی ہے کہ میں ہوں۔ جب جنگل سے بھیڑیوں کی آوازیں گونجتی ہیں، اسی جنگل کے کسی گوشے میں مورنی بھی اپنے پنکھ پھیلاتی ہے۔ جب سیاہ بادلوں کا کارواں چلتا ہے، ان کے درمیان کہیں سنہری چاندنی بھی چھپی ہوتی ہے۔ جب موت کچھ لوگوں کے تعاقب میں ہوتی ہے، اس وقت کہیں نہ کہیں زندگی کا بازار بھی گلزار رہتا ہے۔...ایک اندھیرا ہمیں گم کرتا ہے۔ ایک اجالا ہمیں زندگی دے جاتا ہے۔

میں کچھ دیر کے لیے فطرت کے مناظر میں کھو جانا چاہتا تھا۔ ندی، نالے، پہاڑ، درخت، پھول، تتلیاں، بہتے ہوئے آبشار، سمندر کی لہریں۔ قدرت سیاست سے کہیں بلند ہے۔ ڈیڈ کی طرح مجھے بھی یقین تھا کہ اس وقت بھی نیند میں چلنے والوں کا قافلہ سڑکوں سے گزر رہا ہوگا۔ میں فطرت کے سحر میں کھو کر سب کچھ بھول جانا چاہتا تھا۔ اور اس وقت مجھے ریمنڈ کی بات یاد آ رہی تھی۔ بلیو وہیل کا شکار کرنے والے سرخ چیونٹیوں سے خوفزدہ نہیں ہوتے۔ مجھے ڈیڈ پر پیار آ رہا تھا اور کچھ لمحات سکون کے ساتھ میں ڈیڈ کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

دو لفظ

نالۂ شب گیر ۲۰۱۴ء میں شائع ہوا تھا۔ مرگِ انبوہ ۲۰۱۹ء میں۔ اس ناول کی تخلیق میں پانچ برس لگ گئے۔ ہندوستانی فکشن کے نقاد کا مزاج آج بھی مختلف ہے۔ نقاد عام طور پر سیاسی ناولوں کو صحافت سے منسوب کرتے ہوئے بھول جاتے ہیں کہ دنیا کے زیادہ تر شاہکار کا تعلق سیاست سے ہے۔ آپ روسی ادب کو ایک طرف کریں، اس کے باوجود وکٹر ھیوگو، اروندھتی رائے، احان پامک، گابریئل گارسیا مارخیز یہاں تک کہ نجیب محفوظ، سلمان رشدی، میلان کندیرا کے ناول میں بھی سیاست صاف طور پر نظر آتی ہے۔ کیا عالمی جنگ عظیم پر ناول تحریر نہیں ہوئے۔؟ اردو میں عالمی جنگ عظیم کی بازگشت بھی سنائی نہیں دیتی۔ تھکا ہارا نقاد، بوجھل فلسفوں کے درمیان سانس لیتا ہے اور ان ناولوں کو پسند کرتا ہے جو ہجرت، ناسٹلجیا، داغ و میر کی زندگی پر مبنی ہوتے ہیں۔ حالات اور مستقبل کے اشارے ناول کا حصہ بنتے بھی ہیں تو ان کا کینوس محدود ہوتا ہے۔ کیا ۲۰۰۰ء کے بعد کی جو زندگی یا سیاست ہمارے سامنے ہے، وہ لکھنے کا موضوع نہیں۔؟ ۲۰۰۰ء کے بعد حالات بدلتے چلے گئے۔ گودھرا ہوا، سنامی آئی اور ایک خاص مشن اور مشن کے لوگوں نے ہمارے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا۔ ۲۰۱۴ء کے بعد زندگی سنگین حالات کا شکار ہو گئی۔ تشدد میں اضافہ ہوا۔ مسلمان ہونا جرم بن گیا۔ مرگ انبوہ کے لیے میں نے ایک ایسی داستان کو حوالہ بنایا جس کے مرکز میں دو کردار گھومتے ہیں۔ ایک باپ اور ایک بیٹا۔ جنریشن گیپ۔ چھوٹی چھوٹی نفرتوں پر بڑی نفرتیں حاوی ہوتی چلی گئیں۔ ولن ہیرو بن گیا۔ معصوم، گنہگار بن گئے۔ گنہگار پاور میں آ گئے۔ کیا اس سیاسی کھیل کو دیکھنے کا حق صرف احان پامک یا اروندھتی رائے کو ہے؟ آج کشمیر پر کوئی گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔ ہم سب کچھ بھول کر نیند میں چلنے والی قوم بن چکے ہیں۔ ملک کاغذ پر بنا کمرہ نہیں ہوتا۔ اگر گھر کے ایک کمرے میں آگ لگی ہوئی ہے تو کوئی دوسرے کمرے میں چین کی نیند کیسے سو سکتا ہے۔؟ عظیم موسیقار اور یفس کے روحانی نغمے خاموش ہو گئے۔ ہم اس بھیڑ کا حصہ بن گئے، جہاں ہلاکت اور تشدد کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس لیے جینے کے لیے لکھنا تو پڑے گا، بولنا تو پڑے گا۔ منہ کھولنا تو پڑے گا۔ اس بات کا احساس دلانا ہوگا کہ ہم ابھی مُردوں میں شامل نہیں ہوئے۔

شدّت سے مجھے اس بات کا احساس ہو رہا ہے کہ ہماری پسماندگی کی وجہ کیا ہے؟ صرف تنقید سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اور اسی لیے عملی میدان میں آنے سے زیادہ تر لوگ پناہ مانگتے ہیں۔ مسلمانوں کے تعلّق سے میری کئی کتابیں ہیں۔ اپنی قوم کے بارے میں سوچنا بھی گناہ یا جرم ہو گیا؟

ہندوستانی سرزمین پر مستقبل کے جو مناظر میں دیکھ رہا ہوں، وہ شاید ملی تنظیمیں ابھی بھی دیکھ نہیں رہی ہیں.. یا وہ اس خوش فہمی کی شکار ہیں کہ حالات اس سے زیادہ خراب نہیں ہو سکتے۔ اب تک نشانے پر مسلمان تھے اب مذہب بھی نشانے پر آ گیا ہے۔ ابھی بھی حالات بہتر نہیں اور مستقبل کے نام پر آئندہ جس تماشے کی شروعات ہو سکتی ہے، اس کو نظر انداز کرنا اپنی بربادی کو دعوت دینے جیسا ہے۔

ہم اس بات پر بھی غور کریں کہ کہیں انجانے میں ہم مخصوص نظریے یا مشن کی حمایت تو نہیں کر رہے؟

فسطائی طاقتیں انسانی نفسیات کا مطالعہ رکھتی ہیں۔ ہٹلر کے پاس بھی فدائین تھے۔ جو اس کے اشاروں پر ایک لمحے میں جان دے دیا کرتے تھے۔ ملک کے موجودہ حالات مسلمانوں کے لیے بدتر ہوئے جا رہے ہیں۔ حکومت یہ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے کہ مسلمانوں کو زیر کرنے کے لیے کیا کیا تدبیریں کی جا سکتی ہیں۔ حکومت کے پاس مسلمانوں کو زیر کرنے کے لیے ایک لمبی فہرست ہے۔ پھر ایک کے بعد دوسرا نشانہ لگنا شروع ہو جاتا ہے۔ بہت ہوشیاری سے اکثریت اور اقلیت کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ حکومت

کی فسطائی منطق کے سامنے آپ بے بس اور مجبور ہیں۔ ممکن ہے... کہا جائے... لاؤڈ اسپیکر پر اذان نہ دیں... محلے میں ایک مسجد کی جگہ تین مسجدیں کیوں؟ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی آپ کو زیر کیا جائے گا۔ اور اگر آپ ایک جگہ شکست کھا گئے، تو آپ کو ہر جگہ شکست ملے گی۔

حکومت بننے کے ساتھ ہی پہلا حملہ ملک کے سیکولر اور لبرل کردار پر کیا تھا۔ دراصل فسطائی طاقتوں کو ان دو لفظوں سے ڈر محسوس ہوتا ہے۔ فسطائی طاقتیں پوری شدّت اور منصوبوں کے ساتھ مذہب، مشترکہ وراثت اور تہذیب پر حملہ کر رہی ہیں۔

آزادی کے بعد کے فرقہ وارانہ فسادات — جدیدیت کا خیمہ خاموش رہا — ۱۹۸۴ ہوا۔ پھر ۱۹۹۲ — کوئی ہلچل اس خیمے میں نظر نہیں آئی — کچھ ہلکی پھلکی علامتی کہانیاں لکھ دی گئیں۔ ۱۹۹۲ کے بعد کا منظر نامہ دیکھ لیجیے — خاموشی کی روایت قائم ہے...... سیاسی عدم بیداری کی فضا قلم کے محافظ پیدا نہیں کرتی — جدیدیت کے علمبرداروں کو کوئی غرض نہیں کہ ملک کہاں جا رہا ہے — بیمار مریضوں، سوکھی انتڑیوں کے باسی مردہ قصّوں میں اگر زندگی کی حرارت نہیں تو یہ قصّے فقط الفاظ کی بھول بھلیّوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں — ترقی پسند زندہ مکالمے کرتے تھے — بیانات دیتے تھے۔ حق کے لیے جنگ کرتے تھے۔ ۱۹۹۲ کے بعد کا عام رویہ ہے کہ جدیدیت کو عام اذہان اور مسائل میں کوئی دلچسپی نہیں۔ نیند میں سوئے ادیبوں پر آپ فخر کر سکتے ہیں تو کیجیے... لیکن وہ ادیب ہی کیا جسے بدلتے سیاسی منظر نامے کی چیخ سنائی نہ دے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی مجموعی آبادی اٹھارہ سے بیس کروڑ کے درمیان ہے۔ خانہ جنگی ہوئی تو نقصان ملک کا ہوگا۔ شام مشرق وسطیٰ کا ایک بڑا اور تاریخی ملک ہے۔ اس کے مغرب میں لبنان، جنوب مغرب میں فلسطین اور اسرائیل، جنوب میں اردن، مشرق میں عراق اور شمال میں ترکی ہے۔ شام دنیا کے قدیم ترین ممالک میں سے ایک ہے۔ موجودہ دور کا شام ۱۹۴۶ء میں فرانس کے قبضے سے آزاد ہوا تھا۔ اس کی آبادی دو کروڑ تھی۔ اب یہ آبادی ایک کروڑ اسی لاکھ کے قریب بتائی جا رہی ہے۔ ۲۰۱۱ء میں شامی حکومت کے خلاف شروع ہونے والے پرامن مظاہرے کے بعد حالات پرتشدد ہو گئے۔ سات برسوں میں عالمی سیاست نے شام کی سرزمین کو بارود کے دھویں اور خون سے آلودہ کر دیا۔ ہندوستان کی زمین شام نہیں بن سکتی۔

نفرت کا حل نفرت نہیں۔ میں یہ دیکھ کر گہرے سنّاٹے میں ہوں کہ کچھ ادیب بھی نفرت کو ہوا دینے میں پیش پیش ہیں۔ ایسے حالات میں جب ادیبوں کو اپنی ذمے داری ادا کرنی چاہیے، وہ غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ ہم اس سیاست سے واقف ہیں کہ جنگوں کو بہانہ کیوں بنایا جاتا ہے؟ دوستی اور محبت بھری باتوں کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے... یہ کام ہم مل کر بہ خوبی انجام دے سکتے ہیں- ملک ایک نئی صورتحال سے گزر رہا ہے۔ مجسمے توڑے جا رہے ہیں۔ فسطائیت کا غلبہ ہے۔ مسلم مخالف رنگ شدید ہو چکا ہے۔ ان کے منصوبے خطرناک ہیں۔ ملک ہندوستان کو شام بنانے کی دھمکی دی جاتی ہے۔ اب یہ ملک زعفران ہے مگر ان کی نظر میں۔ ہم اس ملک کو زعفرانی نہیں ہونے دیں گے۔ ہندوؤں کا ایک بڑا طبقہ جمہوری قدروں پر یقین رکھتا ہے لیکن اس وقت وہ بھی خوفزدہ ہے۔

وائرس کی ہماری مہذب دنیا میں ہزاروں قسمیں ہیں۔ کچھ وائرس جانوروں سے ہمارے درمیان آتے ہیں۔ جانور اگر انسان کو کاٹ لے تو یہ وائرس انسانی خون میں شامل ہو جاتا ہے۔ ان دنوں تیزی سے یہ وائرس ہمارے ملک کی مسلم آبادی میں پھیل رہا ہے ...... تاریخ نے اکثر یہ سوال پوچھا ہے کہ ہٹلر جیسے حکمرانوں کو کیا خوف محسوس نہیں ہوتا؟ ہٹلر جیسے لوگ ہماری ہنستی مسکراتی دنیا کو اندھیر نگری میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ ایسا ہر اس ملک میں ہوا جہاں بھی ہٹلر کی حکومت رہی۔ لیکن علم نفسیات کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہٹلر جیسے لوگ بچوں سے بھی کہیں زیادہ خوفزدہ ہوتے ہیں... اور سب سے اہم بات تمام تانا شاہ سوالوں سے ڈرتے ہیں۔ کیونکہ ظلم و جبر کی ہر انتہا تک پہنچنے کے باوجود ان کے پاس جواب نہیں ہوتا..

آج ہم دنیا کے سب سے خوفناک تماشے کی زد میں ہیں.. اس تماشے سے الگ وائرس ہر جگہ، ہر گلی، ہر سڑک، یہاں تک کہ آپ کے

گھر میں بھی موجود ہے......اس وائرس کو ختم کرنے کے لیے اینٹی وائرس آپ کو بننا ہوگا.... ورنہ تاریخ آپ کو بھی کبھی معاف نہیں کرے گی— جنگیں زخمی کرتی ہیں۔جنگوں کا خیال زخمی کرتا ہے....اور اس ماحول میں ،اس خوفناک فضا میں محبت کی آہٹ بھی دور تک سنائی نہیں دیتی... جہاں موت ہر گام آپ کے پیچھے ہو، جہاں آپکو دنیا کی نظر میں دہشت گرد قرار دے دیا گیا ہو، وہاں کتنی عجیب بات کہ اسی دہشت گرد پر مصیبت کے پہاڑ توڑے جارہے ہیں۔اس دہشت گرد کو جلاوطنی کی سزا مل رہی ہے.... ہم ہی نشانہ ہیں.. ٹارگٹ صرف ہم.. ہم ابھی بھی ظلم وجبر کے ہاتھوں کی کٹھ پتلیاں بنے خود کو محفوظ تصور کررہے ہیں--

ایک بڑی طاقت میڈیا ہے جو آپ کے جذبات ،آپ کے مذہب ،آپ کی شریعت کے پرخچے اڑانے کے لیے تیار اس لیے بیٹھا ہے کہ اسے مسلمانوں کو رسوا کرنے کی منہ مانگی قیمت مل چکی ہے۔ہم اپنے اپنے حجرے میں سمٹے ہوئے کہیں بھی آسانی سے فروخت ہوجاتے ہیں۔کہیں آواز بلند کرتے بھی ہیں تو یہ آواز صحرا میں گم ہوجاتی ہے۔صدمہ اس بات کا بھی ہے کہ ہم حکومت کی نظروں میں آسان ٹارگیٹ ہیں۔یہ حکومت دو فی صد سکھوں اور ایک فی صد سے بھی کم جاٹوں سے گھبرا جاتی ہے۔ہم ابھی تک سکھوں اور دلتوں کو اپنے قریب نہیں کر پائے۔ان حالات میں مسلمانوں کے مستقبل کے آگے جو خطرہ منڈلا رہا ہے ،اس سے باہر نکلنے کا ہر راستہ تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے۔ہم یہ صاف دیکھ رہے ہیں کہ آنے والے وقت میں فسادات بھی ہم پر مسلط کیے جائیں گے۔بڑھتی بے روزگاری اور بھوک مرنے کے باوجود اکثریتی جماعت کو ہندو راشٹر کا کھلونا تھما دیا گیا ہے۔مودی حکومت پہلے ہی مسلمانوں کے لیے بے نامی جائیداد کا قانون بنا کر بہت حد تک ان کے راستے کو بند کر چکی ہیں۔اراضی کا مسئلہ اٹھا کر مستقبل میں دوسرے مقاصد بھی سادھے جا سکتے ہیں اور ایسی تمام پہل سے نقصان مسلمانوں کا ہی ہوگا۔

میری سب سے بڑی فکر یہ ہے کہ ملک اور اقلیتوں کا کیا ہوگا؟ نوٹ بندی ہو یا جی ایس ٹی سے جس کی کمر سب سے زیادہ ٹوٹے گی ، وہ مسلمان ہوں گے۔معاشی اعتبار سے جو سب سے زیادہ ذبح کیے جائیں گے وہ بھی مسلمان ہوں گے۔اس ملک میں مشن کی سوچ کی پہلی منزل مسلمان ہیں۔اور اسی لیے مشن بار بار یہ بیان دیتا آیا ہے کہ اس ملک کے تمام مسلمان کنورٹیڈ ہیں۔اور یہ بیان بھی برسوں سے دیتی آئی ہے کہ اس کی دشمنی مسلمانوں سے نہیں ،اسلامی فکر رکھنے والوں سے ہے۔کیونکہ ایک دن مسلمانوں کی گھر واپسی ہو کر رہے گی۔

۲۰۱۴ کے بعد کے سیاسی منظر نامہ پر غور کریں تو مسلمانوں کے لیے ہر دوسرا دن ، پہلے دن سے زیادہ بھیانک ثابت ہوا ہے۔ ان ۵ برسوں میں مسلمانوں کو ہلاک کرنے والے ،فرضی انکاؤنٹر کرنے والے ،مسجدیں شہید کرنے والے ،کریمنل ریکارڈ والے تمام مجرم جیل سے بری کر دیے گئے۔اور معصوم مسلمانوں پر جیل کی سلاخیں سخت ہوگئیں۔آسمان میں ناچتے گدھ شکاری بن گئے کہ کیسے مسلمانوں کا شکار کیا جائے۔نئے نئے طریقے ایجاد کیے جانے لگے۔

-مسلمان سبز اسلامی پرچم لہرائے تو وہ پاکستان کا ترنگا ہو جاتا ہے۔

-ہر دوسرے دن ایک بیان مشن کے کسی نہ کسی لیڈر کی طرف سے آجاتا ہے ،جس میں صاف صاف اور کھل کر یہ بات کہی گئی ہوتی ہے کہ مسلمان ملک دشمن ہیں۔

-بار بار مسلمانوں سے یہ صفائی مانگی جاتی ہے کہ وہ محبّ وطن ہونے کا ثبوت پیش کریں۔اور ثبوت کے طور پر دادری میں رہنے والے محمد اخلاق کی فریج کا مٹن ، بیف بن جاتا ہے۔المیہ......المیہ کہ اپنی حد میں رہنے والے ،قانون کا پاس رکھنے والے محمد اخلاق کی فریج میں رکھے مٹن کو عدلیہ بھی بیف ثابت کرنے پر تل جاتی ہے۔

اخلاق اور تبریز بے دردی اور بے رحمی سے ذبح کر دیے جاتے ہیں۔

.....پہلو خان بھی ذبح کر دیے جاتے ہیں۔ ہاتھ میں ترشول لیے خوفناک چہروں والے گئو رکشک دھوکہ سے مسلمانوں کو ہندوستان کے ہر صوبے میں قتل کرنے کے بہانے تلاش کر رہے ہوتے ہیں۔حکومت چپ۔انصاف چپ۔عدلیہ چپ۔غلطی سے کسی ایک مسلمان سے کوئی ایک معمولی سا جرم بھی سرزد ہو جائے تو میڈیا اسے غدار اور دشمن بنا کر چلانے لگتا ہے۔ ہندو سبھاؤں نے دیواروں پر اس طرح کے بینر لگائے کہ ۲۲۰۰ مسلمانوں کی لڑکیوں کو اپنی بہو بنانا ہے مگر کوئی آواز نہیں اٹھی۔سب چپ۔ترشول دھاریوں کو، غیر مسلم قاتلوں کو پوری چھوٹ ملی ہوئی ہے۔ہم ایک ایسے پر آشوب وقت میں داخل ہو چکے ہیں کہ آسمان پر اڑتے ہوئے اور زمین پر گھومتے ہوئے شکاری ہر طرف، ہر جگہ دلت اور مسلمانوں کے فراق میں ہیں۔نشانے پر دلت اور مسلمان ہیں۔

گاندھی مرنے کے بعد بھی زندہ تھے۔ گوڈ سے اسی دن مر گیا جس دن اس نے گاندھی کو مار ڈالا۔ایک خوبصورت اور مہذب دنیا یہ سوچ کر خوش ہوتی رہی کہ گاندھی کسی انسان نہیں آئیڈیالوجی کا نام ہے. انسان مرتا ہے، آئیڈیالوجی زندہ رہتی ہے۔لیکن کیا یہ محض خوش فہمی ہے؟ کیا گاندھی کو مارنا، بہتّر برس بعد جلاوطن کرنا آسان ہے؟ وہ خوش ہیں کہ میڈیا، اخبارات، سرکش اور اشتعال انگیز بیانات کا سہارا لے کر انہوں نے گوڈسے کا مندر تک بنا دیا۔کیا یہ ان کی بھول ہے کہ گاندھی ہر روشن دل میں کل بھی زندہ تھا، آج بھی زندہ ہے...؟ جنگ اور تشدد سے پیدا شدہ تباہیوں سے گاندھی نے یہ سیکھا کہ آزادی کے لیے عدم تشدد کا فلسفہ لے کر آ گئے اور حکومت برطانیہ کے ساتھ عالمی سیاست کو بھی حیران ہونا پڑا کہ وہ قیادت کی اس نئی رسم سے واقف نہیں تھی۔عدم تشدد کا فلسفہ ایسا ہتھیار ثابت ہوا کہ فرنگی گاندھی اور ان کے نظریات سے خوف محسوس کرنے لگے... کیا کوئی سوچ سکتا تھا کہ جنوبی افریقہ کا سوٹڈ بوٹڈ بیرسٹر گاندھی جب اپنے ملک ہندوستان آئے گا.. تو سب سے پہلے وہ ہندوستانی شناخت کو سمجھنے کے لیے ہندوستان کے دور دراز گاؤں کا دورہ کرے گا.. کیونکہ آج بھی اصل ہندوستان کی روح کا رشتہ گاؤں سے ہے... ہندوستان کی ثقافت اور جڑوں کے تفصیلی مطالعہ کے بعد موہن داس کرم چند گاندھی نے اس روٹس کو محسوس کر لیا جس کی جڑیں ہر ہندوستانی کے دل تک پھیلی ہوئی تھیں... یہ حقیقت ہے کہ گاندھی نہ آتے تو حکومت برطانیہ کا تسلط کبھی ختم نہ ہوتا... اب ایک نئے گاندھی کا جنم ہوا۔جس نے سودیشی کا نعرہ دیا... خود چرخہ لے کر بیٹھا.. سوٹ بوٹ اتار پھینکا.. اپنے لباس، سوٹ کے دھاگوں سے تیار کرنے لگا... یہاں تک کہ کستور با کو بھی اپنے مشن میں شامل کر لیا...... یہ گاندھی کا مشن تھا.. کہ ہندوستانی انگریزوں کی بنائی چیزوں سے فاصلہ رکھیں گے... نمک بھی تیار کریں گے... اپنے لباس کے لیے اپنے ہاتھوں کے محتاج ہوں گے... حکومت برطانیہ کے ظلم کے آگے گھٹنے نہیں ٹیکیں گے.. عدم تشدد کا سہارا لے کر انھیں شکست دیں گے... یہ دنیا کی تاریخ میں پہلی بار ہوا جب چرچل کے نیم عریاں فقیر کے جذبے، ضد اور فلسفوں نے حکومت برطانیہ کو جھکنے پر مجبور کر دیا......آزادی کے ساتھ ملک کو بھیانک فرقہ وارانہ فسادات کا تحفہ ملا.. جب ملک آزادی کا جشن منا رہا تھا، گاندھی نواکھلی میں متاثرین کے زخموں پر مرہم رکھنے کے لیے بھوک ہڑتال پر بیٹھے تھے... گاندھی جسے اقتدار کا کوئی نشہ نہیں تھا.. ہے رام کہتے ہوئے جس نے آرام سے گوڈسے کے پستول سے نکلنے والی گولیوں کو قبول کر لیا......اقتدار کے بھوکے سماج میں کیا آج کے دور میں کسی گاندھی کا تصور کیا جا سکتا ہے؟

یہ اس ملک کی موت ہے جہاں گاندھی کی ناقدری کے بعد بھی عوام خاموش ہیں... جہاں پہلے گوڈسے کی نمائندگی کرنے والے گاندھی کی آنکھوں سے عینک اتارتے ہیں پھر گوڈسے کو عینک پہنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ یاد رکھیے کہ ان چار برسوں میں گوڈسے کے مندر بھی بنتے رہے ہیں۔مندروں میں باضابطہ پوجا بھی ہوتی رہی ہے۔بھکتوں کا آنا جانا بھی رہا ہے۔ پہلے گوڈسے کے نام پر خاموش ہو جانے والے اب سینہ تان کر گوڈسے کے قصیدے پڑھ رہے ہیں۔ کیونکہ انکے پاس اقتدار کی طاقت ہے۔ایسی طاقت جہاں دلیلیں کام نہیں آتیں.
..

انسان کی موت کو گاندھی مذہب اور تقسیم کی آنکھوں سے نہیں دیکھتا تھا......وہ چرخہ چلاتا تھا۔وہ کھادی سے اپنے کپڑے بنتا تھا۔وہ

ایک نئے ہندوستان کا خواب دیکھتا تھا۔ اسے اپنے لیے کچھ بھی نہیں چاہیے تھا.... وہ محبت کی ایک روشن مثال بن چکا تھا... ایک مضبوطی۔ یہ نام ہمیں شکست کے ماحول میں حوصلہ دیتا تھا۔ یہ نام قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے ایک مثال تھا... آج اس نام کو گوڈسے کی ذہنیت والوں نے روند دیا ہے... انگریز بھی گاندھی کی عظمت کے قائل تھے... آج گاندھی کی عظمت سے انکار کرتے ہوئے کچھ شر پسند لیڈران یہاں تک کہتے نظر آتے ہیں کہ ہم گاندھی کو ملک سے نکال باہر کریں گے۔ ملک خاموش ہے.... کیا ملک نے گاندھی کی موت کے جشن کے لیے خود کو تیار کر لیا ہے؟ کیا گاندھی کے بغیر آزادی اور ملک کا کوئی تصور باقی رہ سکتا ہے...؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ گوڈسے کے حمایتی ہماری قوت برداشت کا امتحان لے رہے ہوں... ہماری خاموشی ہماری ناکامی ہی گوڈسے کی جیت ہے۔

ملک کا نوے فیصد میڈیا ہندوراشٹر کی بحالی کے لیے مسلمانوں کے خلاف ہے— آسٹریلیا میں جب ایک اخبار نے کچھ برس قبل مسلمانوں کے خلاف لکھا تو وہاں کے تمام اخبار مسلمانوں کی حمایت میں آ گئے۔ انگلینڈ اور امریکہ میں یہی منظر نامہ ہے۔ لیکن ہندوستانی منظر نامہ یہ ہے کہ آج ہونے والے تمام فسادات اور اشتعال انگیزیوں کے پیچھے اکیلا میڈیا ہے جو ہندو سیناؤں کو مسلسل، مسلمانوں کو برباد کرنے کی ٹریننگ دے رہا ہے۔ سب کچھ کھلے عام ہو رہا ہے۔ کیوں ہو رہا ہے؟ کس کے اشارے پر ہو رہا ہے؟ یہ ملک کہاں جا رہا ہے؟

اس وقت ملک کے صفحہ پر مسلمانوں کے خون سے جو کہانی لکھی جا رہی ہے. اسے روکنا ہوگا۔ اشتعال انگیز بیانات اور روز روز ہونے والی ہلاکت کے قصّوں کو ختم کرنا ہوگا۔ لیکن کیا یہ آسان ہے؟.....آپ ڈریں گے تو حکومت ڈرائے گی۔ آپ جس دن ڈرنا چھوڑ دینگے، اس دن سے حکومت ڈرنے لگے گی— نفسیات کا یہ معمولی نکتہ ہے کہ ہر ہٹلر اندر سے کمزور ہوتا ہے۔ وہ مجمع میں دہاڑتا ہے۔ سچ بولنے والے ایک معمولی سے آدمی سے بھی وہ ڈر جاتا ہے۔

میڈیا، ٹی وی چینلز اور حکومت نے مسلمانوں کو دوسرے بلکہ تیسرے درجے کی مخلوق گردانناشروع کر دیا ہے، ایک ایسی مخلوق جسے بس اس سرزمین سے باہر نکالنا باقی رہ گیا ہے۔ آنکھیں بدل گئی ہیں۔ کچھ دن اسی طرح گزرے تو مسلمان اس ملک میں نمائش کی چیز بن کر رہ جائیں گے.. دیکھو.. وہ جا رہا ہے مسلمان، یہ ہونے جا رہا ہے۔ سوالات کے رخ خطرناک طور پر مسلمانوں کے لیے مایوسی کی فضا تیار کر رہے ہیں... ہندوستان کی مقدّس سرزمین نفرت کی متحمل نہیں ہو سکتی.. اور.... مشن اپنے نظریہ میں تبدیلی لائے، یہ ممکن نہیں... اس ناول کے لکھنے کے دوران ایک حادثہ اور پیش آیا۔ (وقت کے ساتھ اب یہ کہانی بھی تبدیل ہو چکی ہے) چار جج آزادی کے ستر برس بعد ایک ایسی دردناک کہانی کے گواہ بن گئے، کہ اس کہانی کو قلمبند کرتے ہوئے ذہن و دماغ میں دور تک سناٹا طاری ہے۔ کوئی بم نہیں پھٹا۔ یہ کوئی فلمی کہانی بھی نہیں تھی، عدالت میں فیصلے سنائے جا رہے تھے۔ عدالت کو درمیان میں روک کر تین جج اپنے مقام سے اٹھے۔ اس درمیان صرف اتنا ہوا کہ ایک فون آیا۔ ضمیر کی آواز کو لبیک کہا گیا۔ اور یہ چار جج، پانچ برسوں کی خوفناک دہشت کے گواہ بن گئے۔ ہندوستان کی سپریم کورٹ کے چار سینئر ترین ججوں نے پریس کانفرنس کر کے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس اتھارٹی کو چیلنج کیا۔ جب جب انصاف کی تاریخ لکھی جائے گی، جسٹس جے چلاسپیشمر، جسٹس مدن لوکر اور جسٹس کرین جوزف کا نام روشن حروف میں لکھا جائے گا۔ اس موقع پر ان ججوں نے جو بیان جاری کیا، وہ تاریخ کی کتاب اور انصاف کے باب میں ایک ایسا اضافہ ہے، جسے مہذب دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔ لاسپیشمر نے کہا 'ہم سب اس بات پر متفق ہیں کہ اگر سپریم کورٹ کا وقار مجروح ہوا تو اس ملک میں جمہوریت نہیں بچ سکے گی اور نہ ہی کسی اور ملک میں۔ اس بیان کا سب سے مضبوط حصّہ وہ ہے، جس میں کہا گیا کہ ہم نہیں چاہتے کہ ۲۰ سال بعد اس ملک کی تاریخ لکھی جائے تو یہ کہا جائے، چلاسپیشمر، مدن لوکر اور کرین جوزف نے اپنا ضمیر بیچ دیا تھا۔

سوال بہت سے ہیں۔ ہندوستان کے چوراہوں اور دیواروں پر صرف یہ عبارت لکھی جانی باقی ہے کہ ہندوراشٹر میں آپ کا سواگت

ہے۔مسلمانوں اور دلتوں کا قتل، ہر روز نئے مظالم، صرف میڈیا کی آنکھ بند ہے۔اس لیے کہ مکمل میڈیا خریدا جا چکا ہے۔حکومت ہر شعبہ کو خرید چکی ہے۔انصاف کی عمارت پر بھی چند دہشت گرد زعفرانی پرچم لہرا چکے ہیں۔ادب ادیب صحافیوں کی بولی لگ رہی ہے۔زعفرانی ادیبوں کی نئی جماعت سامنے آ چکی ہے۔

۲۰۰۲ تک ہندستانی سماج اس مقام تک نہیں پہنچا تھا، جہاں وہ اب پہنچتا نظر آ رہا ہے۔اس کا جائزہ یوں لیا جا سکتا ہے کہ اڈوانی کی رتھ یاتراؤں کے بعد ہندوستان میں نفرت کے تخم تو بوئے گئے لیکن پھر بھی خطرہ بہت زیادہ نہیں تھا۔بابری مسجد شہید ہو گئی تو ایک طبقہ خوش ہو گیا کہ چلو، ہماری جیت ہو گئی اور وہ بس اتنے میں خوش ہو کر بیٹھ گیا۔۲۰۰۰ تک صورتحال نارمل رہی۔یہ الگ بات ہے کہ پاکستان سے عراق اور افغانستان تک یہ مسلمان ہی تھا، جسے دہشت گرد کے طور پر نئی شناخت مل چکی تھی۔اور حکومتیں بھی مسلمانوں کی شناخت اسی دہشت پسند چہرے سے کر رہی تھیں۔مشن اس حقیقت کو تسلیم کر رہا ہے کہ وہ جس قدر مسلمانوں کے خلاف جائیں گے، ہندو راشٹر کا راستہ آسان ہوتا جائے گا۔

ان سوالوں سے پردہ پوشی ممکن نہیں۔سیاست سے فرار نہیں، سیاست سے وابستہ ہونا ہوگا۔سیاست کے تمام اتار چڑھاؤ کو سمجھنا ہوگا۔اس جڑ کو بھی جہاں سے نفرتیں پیدا ہو رہی ہیں۔مستقبل کو بھی دیکھنا ہوگا کہ یہ سلگتی ہوئی آگ کہاں تک جائے گی۔اس کے بعد اس موضوع سے کچھ الگ، مگر فسطائی طاقتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے ایک دوسرے ناول 'ہائی وے پر کھڑا آدمی' کی شروعات کی ہے۔

مجھے آپ کی رائے کا شدت سے انتظار رہے گا۔

— مشرف عالم ذوقی